# چند اہم عصری مسائل

پر

دار الافتاء دار العلوم دیوبند سے صادر کئے گئے فتاویٰ

[جلد دوم]

افادات

مفتی زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی

مفتی دار العلوم دیوبند

حسبِ ہدایت

نمونۂ سلف حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم

مہتمم دار العلوم دیوبند

ناشر

مکتبہ دار العلوم دیوبند

# چند اہم عصری مسائل

پر

دار الافتاء دار العلوم دیوبند سے صادر کیے گئے فتاویٰ

{جلد دوم}

افادات

مفتی زین الاسلام قاسمی الہ آبادی

مفتی دار العلوم دیوبند

حسبِ ہدایت

نمونۂ سلف حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم

مہتمم دار العلوم دیوبند

ناشر

مکتبہ دار العلوم دیوبند

نام کتاب : چند اہم عصری مسائل ﴿جلد دوم﴾
موضوع : عصری اور ضروری مسائل پر دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے جاری شدہ فتاویٰ
افادات : حضرت مولانا مفتی زین الاسلام صاحب قاسمی الٰہ آبادی
مفتی دارالعلوم دیوبند
مرتب : مفتی محمد اسد اللہ صاحب آسامی، معین مفتی دارالعلوم دیوبند
معاونین : مفتی محمد ثاقب ممبئی، مفتی محمد حمزہ بنارسی
کمپوزنگ : مولانا امیر اللہ مشتاق قاسمی کوپاگنجی (مئو) خادم شعبۂ ترتیب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند
سن طباعت : ربیع الاوّل ۱۴۳۷ھ = مطابق: دسمبر ۲۰۱۵ء
تعداد صفحات : ۳۷۶
ناشر : مکتبہ دارالعلوم دیوبند، یوپی، انڈیا ۲۴۷۵۵۴
مطبوعہ : ایچ، ایس، آفسیٹ پرنٹرز، دریا گنج، نئی دہلی، موبائل: 09811122549

# چند اہم عصری مسائل

پر
دار الافتاء دار العلوم دیوبند سے صادر کیے گئے فتاویٰ
{جلد دوم}

افادات: مفتی زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی
مفتی دار العلوم دیوبند

## فہرست مضامین



## عقائد اور متعلقاتِ قرآن

# طہارت اور نماز سے متعلق مسائل

# حج اور زکات سے متعلق مسائل

# نکاح، طلاق اور متعلقات



# کاروبار، شراکت، ہبہ اور وقف وغیرہ

# قرض، سود اور سودی معاملات کے احکام

## اجارہ اور ملازمت سے متعلق مسائل



## طب اور سائنس سے متعلق مسائل

## متفرقات

# پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

**الحمد للّٰہ ربّ العالمین، والصّلاۃ والسّلام علٰی سیّد الأنبیاء والمرسلین، وعلٰی آلہٖ وصحبہ أجمعین، وعلٰی من تبعھم بإحسان إلٰی یوم الدّین . أمّا بعد:**

دارالعلوم دیوبند نے اپنی تاسیس کے یوم اوّل ہی سے جہاں دین کے مختلف شعبوں کی طرف توجہ دی، وہیں ملت اسلامیہ کے پیش آمدہ مسائل میں فتوے کے ذریعے شرعی راہنمائی کی بھی خدمت انجام دی؛ لیکن ابتداءً دارالعلوم دیوبند میں فتوی نویسی کا کام اکابر اساتذۂ کرام حسب ضرورت انجام دیتے تھے، اس کے لیے باقاعدہ مستقل شعبہ قائم نہیں تھا، پھر جوں جوں تدین واتباع سنت کے اعتبار سے دارالعلوم دیوبند کا تصلب وپختگی اور شرعی وفقہی امور میں یہاں کی اصابتِ رائے کو شہرت حاصل ہوتی گئی، ویسے ویسے عوام وخواص کا رجوع دارالعلوم دیوبند کی طرف بڑھتا گیا اور استفتاءات کثرت سے موصول ہونے لگے، جس کی وجہ سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی ہدایت پر ۱۳۱۰ھ میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۳۴۷ھ) کو سب سے پہلے باقاعدہ منصب افتاء سپرد کیا گیا، اس طرح ۱۳۱۰ھ میں باضابطہ دارالافتاء کا قیام عمل میں آیا۔

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۴۷ھ تک منصب افتاء پر فائز رہے، حضرت کے قلم سے صادر شدہ کل فتاوی اٹھارہ ضخیم جلدوں میں مکتبہ دارالعلوم دیوبند سے طبع ہوکر اہل علم کے حلقے میں معروف ومقبول ہوچکے ہیں، اُن کے بعد بہت سے اکابر مفتیان کرام نے اس شعبے سے وابستہ ہوکر نمایاں خدمات انجام دیں، جن میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی،

حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوری، حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمی نور اللہ مراقدہم کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، ان میں سے بعض اکابر مفتیان کرام کے فتاوی طبع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔

الحمدللہ آج بھی یہ شعبہ مکمل محنت اور لگن کے ساتھ فتوی نویسی کی خدمت انجام دے رہا ہے اور روز بہ روز عوام وخواص کا رجوع اس کی طرف بڑھتا ہی جا رہا ہے، اس وقت یہاں ملک و بیرون ملک سے روز مرہ کے عام مسائل کے علاوہ اہم، پیچیدہ اور غور طلب مسائل، محاکم شرعیہ، دار القضاء اور پنچائتوں کے فیصلے، اور اس دور کی سائنسی ترقیات اور سماجی ومعاشرتی تبدیلیوں کے نتیجے میں پیش آنے والے نئے مسائل سے متعلق سوالات کثرت سے موصول ہوتے ہیں، یہاں سے ہر استفتاء کا اطمینان بخش طریقے پر جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یوں تو عوام وخواص کا دار الافتاء کی طرف رجوع محض اللہ کا فضل اور اُسکے یہاں مقبولیت کی وجہ سے ہے، نیز اکابر دیوبند و بانیان دارالعلوم دیوبند کے اخلاص وللّٰہیت کا نتیجہ ہے، تاہم یہاں کے اکابر کے فتاوی پر گہرائی سے نظر ڈالنے کے بعد کچھ نمایاں خصوصیات بھی سامنے آتی ہیں، جن کی وجہ سے دار الافتاء، دارالعلوم دیوبند نے ملک و بیرون ملک کے عوام وخواص کے حلقے میں ایک مرجعیت کا مقام حاصل کرلیا ہے، مثلاً: یہاں کے فتاوی میں مسلک حنفی کے اصول وجزئیات پر بہت مضبوطی سے عمل کیا جاتا ہے؛ کیوں کہ ایک متعین مسلک کی پابندی ہی انسان کو دین کے حوالے سے خواہش نفس اور اتباع ہوی سے نکال سکتی ہے اس بنیادی فکر میں تصلب اور بصیرت کے بعد شرعی احکام کی تطبیق کا نازک کام انجام دیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس تطبیق میں اصابت رائے کی دولت سے بھی نوازتے ہیں۔

نیز مسلک حنفی میں بھی ظاہر الروایہ اور مفتی بہ اقوال ہی پر فتوی دینے کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس سے امت میں اباحت پسندی پر روک لگتی ہے اور دین میں تحریف کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں۔

ان سب کے باوجود فتاوی میں ضرورتِ ناس اور احوال زمانہ کو مطلقاً نظر انداز نہیں کیا جاتا بلکہ ضرورت ناس اور احوال زمانہ کے رعایت کی وجہ سے بسا اوقات غیر مفتی بہ اقوال حتی کہ دوسرے مسلک پر بھی اُن کی شرائط کی روشنی میں نہایت دقت و گہرائی سے صورتحال کا صحیح جائزہ لینے کے بعد فتوی دیا جاتا ہے اور اس طرح کے فتوؤں میں شریعت کا اصل حکم اور فتوی نویسی کے اصول کی رعایت

کرتے ہوئے فتوے کے لیے محتاط اسلوب اختیار کیا جاتا ہے جیسا کہ ان اکابر ارباب افتا کے فتاوی دیکھنے سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آج بھی الحمد للہ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند فتوی نویسی کے حوالے سے اسی محتاط منہج پر گام زن ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت سالانہ تقریبا دس بارہ ہزار سے زائد فتوے یہاں سے صادر ہوتے ہیں، جن میں اکثر استفتاءات کئی کئی سوالات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

اکابر مفتیان کرام کے مطبوعہ فتاوی کی موجودگی میں احقر جیسے کم علم شخص کے فتاوی کی اشاعت کوئی حیثیت نہیں رکھتی؛ لیکن اللہ تعالیٰ استاذ محترم گرامی مرتبت حضرت مولانا عبدالخالق مدراسی صاحب دامت فیوضہ کو جزائے خیر سے نوازے کہ انہوں نے مختلف مجلسوں میں اس بات کی اہمیت پر روشنی ڈالی کہ فتوی لکھ کر مستفتی کو پہونچا دینا ہی قلم کی آخری منزل نہیں ہونی چاہیے؛ بل کہ فتووں میں عمومی افادیت پیدا کرنے کے لیے انہیں منظر عام پر بھی لانے کی ضرورت ہے، بالخصوص ایسے مسائل جو وقت کے تقاضے اور موجودہ زمانے کی پیداوار ہیں کہ ایسے مسائل میں لوگوں کی نگاہیں دار الافتاء دارالعلوم دیوبند کے موقف اور فتوے کے جاننے کی منتظر رہتی ہیں، موجودہ وقت میں ان کی اشاعت سے لوگوں کو بر وقت راہنمائی حاصل ہوسکے گی اور افادہ کی عمومیت میں اضافہ ہوگا، چنانچہ حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے بھی کتاب کی ''تقریب'' میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔

نیز راقم الحروف کو خود بھی اس کا تجربہ ہوا کہ چند سال قبل جب راقم الحروف کے فتاوی کا ایک مجموعہ ''چند اہم عصری مسائل'' کے نام سے مکتبہ دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوا، اس کی طرف عوام وخواص کا ایسا رجوع ہوا کہ مختصر مدت میں اُس کے دو ہزار نسخے ختم ہوگئے اور جلد ہی دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی ضرورت محسوس ہوئی؛ چناں چہ کتابت کی بعض اغلاط کی اصلاح کے بعد دوسرا ایڈیشن بھی منظر عام پر آگیا، اس سے اندازہ ہوا کہ لوگ بر وقت عصری مسائل پر دارالعلوم دیوبند کی رائے اور موقف جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں؛ چنانچہ اہل علم کے حلقے کے علاوہ بڑی تعداد میں عصری تعلیم یافتہ حلقے کے لوگوں مثلاً کالج کے اساتذہ، ڈاکٹروں اور وکلاء نے بھی اُس کتاب سے استفادہ کیا اور اپنے تأثرات میں فتووں کی افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ اس کتاب کے ذریعہ ہمارے بہت سے شکوک وشبہات کا ازالہ ہوا ہے۔

"چند اہم عصری مسائل" کی جلد دوم لانے کا کوئی ایسا پختہ خیال راقم الحروف کا نہیں تھا؛ لیکن استاذ گرامی کے توجہ دلانے کے بعد جب اپنے منتخب فتاوی کی فائل دیکھی تو اندازہ ہوا کہ بعض جوابات جدید مسائل سے متعلق ایسے بھی ہیں جن میں عمومی افادیت کا پہلو بھی ہے، اور مفصل و مدلل طور پر لکھے گئے ہیں، انہیں جلد دوم کی شکل میں منظر عام پر لایا جا سکتا ہے۔

راقم الحروف نے اپنے کچھ ایسے فتووں کا انتخاب کر لیا؛ مگر روزمرہ کی فتوی نویسی کی ذمہ داری اور تدریس کی مصروفیت سے اتنا وقت ملنا دشوار معلوم ہو رہا تھا کہ جلد اوّل کے طرز پر تحقیق و تعلیق کا کام پورا ہو سکے؛ مگر بہ نام خدا اس کام کا آغاز کر دیا گیا اللہ تعالی کے فضل سے کئی مرحلوں سے گزر کر یہ کام اختتام کو پہونچا، اس سلسلے میں ہمارے بعض رفقاء اور کچھ ہونہار شاگردوں نے خوب تعاون کیا۔

سب سے پہلے جلد اوّل کے طرز پر مراجع کی تحقیق و تکمیل اور ضروری حواشی کے اضافے کا کام احقر کے مشورہ و ہدایت کے مطابق ہمارے رفیق مفتی محمد اسد اللہ صاحب آسامی نے شروع کر دیا اس وقت وہ دارالافتا میں بطور معاون مفتی کام کر رہے تھے۔

اور پہلے مرحلہ کے اس کام میں بعض حوالوں کی تخریج یا اصل مراجع سے ملانے میں، عزیزم مفتی رشید الدین معروفی، عزیزم مفتی حمزہ بنارسی، مفتی محمد ثاقب ممبئی نے خارج اوقات میں دلچسپی اور محنت سے تعاون کیا۔

فتاوی کے اندراج نمبر رجسٹر نقول فتاوی سے ملانے اور رجسٹر سے بعض فتاوی کی نقل دینے کا کام عزیزم مولوی محمد سراج الدین بھاگلپوری، ناقل فتاوی نے انجام دیا۔

اس کے بعد حوالوں کو مراجع سے ملانے اور بعض حوالوں کی تخریج کے کام میں عزیزم مولوی علی حسین ۲۴/ پرگنہ نے تعطیل کلاں کے دوران تعاون کیا۔

جناب مولانا امیر اللہ مشتاق قاسمی صاحب مئوی رفیق شعبۂ ترتیب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند نے نہایت خوش اسلوبی اور محنت و شوق سے اس مجموعے کی کمپوزنگ کر کے شائستہ ترتیب کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔

ترتیب کے دوران بعض ضروری حوالوں اور مناسب حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے، جو اصل فتوے

میں نہیں تھے نیز بعض عربی عبارتوں کا ترجمہ کیا گیا اور الفاظ کے اعتبار سے کچھ اصلاح وترمیم یا ابہام واجمال کی توضیح کی گئی ہے۔

اس ترتیب وتحقیق وتحشیہ اور پروف ریڈنگ کے کام میں مفتی محمد اسد اللہ صاحب آسامی معین مفتی دارالعلوم دیوبند نے ہمارا مکمل تعاون کیا؛ بلکہ ترتیب کا اکثر کام انہوں نے ہی انجام دیا نیز ہمارے رفیق گرامی مفتی محمد مصعب صاحب معین مفتی دارالعلوم دیوبند نے درمیانی مرحلہ میں گہرائی اور دقت نظری سے پورے مجموعے کو پڑھا اور مناسب رائے دی، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو بہتر سے بہتر جزا عنایت کرے علم وفضل کی برکت سے نوازے اور آخرت میں سرخ رو فرمائے۔ (آمین)

تعلیق اور تحشیہ سے آراستہ اس مجموعے میں عقائد وعبادات سے متعلق فتوے اور عقائد و عبادات میں پیدا کیے جانے والے بعض شبہات کے جوابات، بالخصوص بعض گمراہ کن، ملحدانہ نظریات کی تردید، کاروبار کی بعض جدید مروّج شکلوں کے احکام، نیز طب وسائنس سے متعلق فتاوی اور عمومی افادیت کے حامل بعض متفرق استفتاءات کے جوابات شامل ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی زید مجدہ جنہیں دارالافتاء کے کارکردگی کی طرف مکمل توجہ اور اس میں خوبی اور عمدگی پیدا ہونے کی ہمہ وقت فکر رہتی ہے اور اس کے لیے مناسب ہدایات واقدامات فرماتے رہتے ہیں، حضرت والا کی خدمت میں ''چند اہم عصری مسائل'' کے حوالے سے جب تازہ مجموعہ کی ترتیب کا ذکر آیا، تو حضرت والا نے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی چنانچہ تحقیق وتعلیق کا کام پورا ہوجانے کے بعد شعبان ۱۴۳۶ھ میں کمپوز شدہ مسودہ حضرت مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند کی خدمت بابرکت میں پیش کردیا۔

حضرت والا نے اس کی افادیت کے مدنظر دارالعلوم دیوبند کی موقر مجلس شوری منعقدہ شعبان ۱۴۳۶ھ میں اسے پیش فرمایا اور معزز اراکین مجلس شوریٰ نے تجویز نمبر:۵، ضمن (۷) کے ذریعے حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری شیخ الحدیث صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی نظر ثانی کے بعد مکتبہ دارالعلوم دیوبند کو اس کے طباعت کی اجازت دے دی۔

مجلس شوریٰ کی ہدایت کے مطابق کمپوز شدہ مسودہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کیا گیا، حضرت والا نے بیش بہا تدریسی مشغولیات کے باوجود

کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ فرمایا اور گراں قدر ''تقریظ'' کے ذریعے شامل مجموعہ مسائل کی تائید وتوثیق فرمائی جو راقم الحروف کے لیے سرمایہ سعادت ہے اور بہت زیادہ حوصلہ افزا ہے، جس پر ہم تہہ دل سے حضرت والا کے ممنون وشکرگذار ہیں جزاہم اللہ تعالیٰ۔

اسی طرح ہم شکر گزار ہیں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا مفتی ابو القاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم کے اور دارالعلوم دیوبند کے مفتی جناب مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی کہ ان دونوں حضرات نے کار افتاء کی اہمیت عظمت اور نزاکت پر مشتمل زریں کلمات سپرد قلم فرمائے، جو راقم الحروف کے لیے حوصلہ افزا اور باعث اعزاز ہیں، جزاہم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء!

نیز ہم حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور اپنے تمام اساتذہ کرام رفقاء اور معاونین کے سپاس گذار اور منت شناس ہیں جن کی توجہات ودعاؤں اور تعاون اور مساعی سے یہ کتاب منصۂ شہود پر آرہی ہے۔

اخیر میں راقم الحروف اپنی ہر طرح کی کمزوریوں کے احساس اور علمی کم مائیگی کے اعتراف کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں اس کی ہر طرح کی ظاہری وباطنی نعمتوں پر انتہائی شکر گزار ہے بالخصوص اس بات پر کہ اس نے علم دین کے پڑھنے پڑھانے کی توفیق عطا فرمائی اور درخواست ودعا کرتا ہے کہ اس مختصر کوشش کو اپنے کرم بے نہایت سے قبول فرمائے اور اسے صدقہ جاریہ بنادے خود راقم الحروف کے لیے، اس کے والدین، عالی مرتبت اساتذہ کرام، بلند نسبت مشائخ عظام اور جامع بین الشریعۃ والطریقۃ والحقیقۃ اکابرین دارالعلوم دیوبند کے لیے۔

**الحمد لله أوّلاً وآخراً حمداً كثيراً طيّباً مباركاً فيه الذي بنعمته تتمّ الصّالحات وفّقنا الله لما يحبّه ويرضاه وصلّى الله تعالى على خير خلقه محمّد النّبيّ الأمّيّ وعلى آله وأصحابه وأزواجه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدّين. آمين**

خاکپائے درویشاں
زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی
مفتی دارالعلوم دیوبند
۱۰/محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

# تقریب

## نمونۂ سلف حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم

### مہتمم دارالعلوم دیوبند

اہلِ علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ فتوی نویسی کا کام کس درجہ اہم اور نازک ہے، اس لیے کہ مفتی کا کام پیش آمدہ مسائل میں شریعت کے حکم کی تطبیق وتنفیذ ہے، اس سے اس کام کی حساسیت اور نزاکت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے؛ اسی لیے فقہائے کرام نے منصب افتاء پر فائز ہونے والوں کے لیے فقہ وفتاوی پر گہری نظر، اصول فقہ کا استحضار، مسائل کا وسیع مطالعہ، استنباط واستخراج کی صلاحیت، احکام کی علل وحکم سے واقفیت، نیز ذوق سلیم، مزاج میں سنجیدگی اور تقوی وخشیت جیسی بہت سی صفات کا حامل ہونا شرط قرار دیا ہے، جس کی مکمل تفصیل اصول افتاء کی کتابوں میں مذکور ہے، اس اہم خدمت کو انجام دینے کے لیے اللہ تعالیٰ ہر زمانے میں اس منصب کے مناسب افراد کا انتخاب کرتے ہیں، جو لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں شرعی احکام کی راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

اس وقت میرے سامنے دارالعلوم دیوبند کے مفتی جناب مولانا زین الاسلام صاحب قاسمی الہ آبادی کے دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں لکھے ہوئے فتاوی کا ایک منتخب مجموعہ ہے، اس مجموعہ کی اہمیت کے لیے اتنا کافی ہے کہ یہ فتاوی دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے صادر شدہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے ''دارالافتاء دارالعلوم دیوبند'' کو جو مرجعیت اور مقبولیت عطا فرمائی ہے، اس کی اصل وجہ مسلک ومشرب کے اعتبار سے یہاں کا تصلب، پختگی اور حزم واحتیاط ہے، ہمارے دارالافتاء سے فتاوی کافی غور وغوض اور دیگر مفتیان کرام کے کم از کم دو تصدیقی دستخط کے بعد جاری کیے جاتے ہیں، جس سے فتوے میں غلطی کا امکان بہت کم رہتا ہے، جناب مفتی زین الاسلام قاسمی ماشاء اللہ صاحبِ صلاحیت،

ذی استعداد اور مسائل پر اچھی نظر رکھتے ہیں، خصوصا آج کل پیش آنے والی نئی نئی صورتوں کو خارجی حقائق کے روشنی میں سمجھنے کے بعد ہی فتوے کے لیے قلم اٹھاتے ہیں۔

مفتی صاحب کے منتخب فتاوی کے مجموعے کا پہلا حصہ مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی منظوری سے چند سال قبل مکتبہ دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوکر اہل علم اور دین دار حلقوں میں مقبول ہو چکا ہے، اس مجموعہ میں ایسے فتاوی شامل کیے گئے ہیں، جن کا تعلق عام مسلمانوں کی زندگی سے ہے یا اُن کا شمار اُن نئے مسائل سے ہے، جو اس دور کی سائنسی ترقیات یا سماجی ومعاشرتی تبدیلیوں کے نتیجے میں وجود پذیر ہوئے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں قدیم فتاوی کی ترتیب واشاعت کا ایک نظام ہے؛ لیکن اس دور کے فتاوی کی اشاعت کا نمبر طویل عرصے کے بعد آئے گا؛ اس لیے ضرورت محسوس کی گئی کہ تازہ مسائل سے لوگوں کو واقف کرانے کے لیے ضروری منتخب فتاوی کا مجموعہ شائع کیا جائے، اس ضرورت کے تحت حصہ اول کے بعد اس نوع کے مزید فتاوی کا انتخاب حصہ دوم کی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔

یہ عمل کن مراحل سے گذر کر طباعت تک پہنچا ہے، اس کی تفصیل حضرات اکابر کی ''تقریظات'' اور جناب مفتی زین الاسلام صاحب کے ''پیش لفظ'' سے ظاہر ہے۔

امید ہے کہ فتاوی کا یہ منتخب مجموعہ پہلے مجموعہ کی طرح کتب فتاوی میں ایک معتبر اور مقبول اضافے کی شکل میں شامل ہوگا اور اس سے علم و تحقیق کے دل دادہ افراد کو بہترین راہنمائی حاصل ہوگی، اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے اور اس کے فیض کو عام فرمائے۔ آمین۔　　　والسلام

ابوالقاسم نعمانی غفرلہٗ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۶؍محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

# تقریظ وتائید

## حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری، دامت برکاتہم
## صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چند اہم عصری مسائل {حصہ دوم} مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی ہدایت کے مطابق بالاستیعاب پڑھے، یہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی: حضرت مولانا مفتی زین الاسلام صاحب الٰہ آبادی زید مجدہم کے اہم فتاویٰ کا مجموعہ ہے، اس کا حصہ اوّل طبع ہوکر مقبول ہو چکا ہے، وہ بھی میری نظر سے گذرا ہے، اب یہ دوسرا حصہ طباعت کے لیے تیار ہے، دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے صادر ہونے والے فتاویٰ سبھی مفتیانِ کرام کے دستخطوں سے یا کم از کم دو کی نظر سے گذر کر جاری ہوتے ہیں؛ اس لیے ان میں تسامح کا امکان درجۂ صفر ہوتا ہے، تاہم مجلسِ بالا کا حکم تھا؛ اس لیے میں نے ان کو بالاستیعاب پڑھا، میں ان کی تصدیق وتائید کرتا ہوں۔

یہ فتاویٰ نہایت اہم عصری مسائل سے تعلق رکھتے ہیں، اور جوابات مفصل لکھے گئے ہیں، تمام جوابات تشفی بخش ہیں، اور حوالوں سے مزین ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرمائیں اور مسلمانوں کو ان سے فیض یاب فرمائیں۔ (آمین)۔

کتبہ:
سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری
خادم دارالعلوم دیوبند
۴/ ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ

# دعائیہ کلمات

حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی دامت برکاتہم
مفتی دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

**الحمد للّٰہ ربّ العالمین ، والصّلاۃ والسّلام علٰی أشرف الأنبیاء والمرسلین ، وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین . أمّا بعد !**

اہلِ علم پر یہ بات مخفی نہیں کہ فتاویٰ نویسی سب سے زیادہ اہم اور مشکل کام ہے، ساتھ ہی نازک اور پُرخطر بھی ہے؛ اس کے باوجود امتِ مسلمہ کی رہنمائی کے لیے صحابۂ کرام کے دور سے لے کر آج کے اس پُر آشوب دور تک، ہر زمانے میں، اور ہر علاقے میں علماء راسخین زندگی کے مختلف شعبوں میں نئے نئے پیدا ہونے والے معاشرتی، معاشی، طبی، سائنسی اور عائلی مسائل کو حل کرتے رہے، اور محنتِ شاقہ برداشت کر کے ہر طرح کے سوالات کے جوابات قرآن وحدیث اور اجماع و قیاس کی روشنی میں لکھنے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

حضرت امام محمدؒ جو امام اعظم ابوحنیفہؒ کے شاگرد تھے، وہ مسائل کے استنباط میں رات کو سوتے نہیں تھے، کسی نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ فرمایا جب رات میں لوگ سو جاتے ہیں تو میں ان کے ایمان وعقائد کی حفاظت اور ان کے اجتماعی وانفرادی مسائل کا شرعی حل نکالنے میں لگ جاتا ہوں؛ تاکہ دن میں کوئی مسئلہ پیش آجائے تو میں اُن کی دینی قیادت کا فریضہ انجام دے سکوں، اور ان کے پیش آمدہ مسائل کا شرعی حل پیش کرسکوں۔ سبحان اللہ!

برِصغیر کے اکابر علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کی علمی وفقہی خدمات کو عالم اسلام میں جس قدر

سراہا گیا ہے وہ آج پوری دنیا کے سامنے عیاں ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند سے پورے برِصغیر میں اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کی رہنمائی کے لیے وہ عظیم الشان کام لیا جس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی، دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نے اطرافِ عالم میں جو علمی، دینی، فقہی خدمات انجام دی ہیں وہ یقیناً آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''چند اہم عصری مسائل'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، مولانا مفتی زین الاسلام صاحب قاسمی الہ آبادی مفتی دارالافتاء دارالعلوم دیوبند نے محنت شاقہ سے اپنے لکھے ہوئے فتاویٰ میں سے کچھ عصری مسائل کو اکٹھا فرمایا ہے، یہ کتاب کی دوسری جلد ہے، اس سے قبل پہلی جلد آچکی ہے، اور مقبولیت حاصل کر چکی ہے، پھر ان مسائل کو ان کے لائق شاگرد مفتی اسد اللہ صاحب آسامی، معین مفتی دارالعلوم دیوبند نے مرتب فرمایا، اور کتبِ فتاویٰ کے حوالوں سے انہیں مزین فرما کر کتاب میں جان پیدا کردی۔

مسائل کی ثقاہت کے لیے مفتی دارالعلوم دیوبند کی نسبت کافی ہے، مزید برآں حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری، صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے حرفاً حرفاً اوّل سے آخر تک اسے دیکھا ہے اور ان مسائل کے صحیح ہونے کی تصدیق فرمائی ہے، اور اپنے اطمینان کا اظہار فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کو بہت بہت جزائے خیر عطاء فرمائے، مرتب فتاویٰ کی جدید کاوشوں کو قبول فرمائے، قارئین کرام کو اس سے زیادہ سے زیادہ نفع پہونچائے، اور مرتب موصوف کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

حبیب الرحمٰن خیرآبادی عفا اللہ عنہ
مفتی دارالعلوم دیوبند
۹؍ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ

# اطلاع

درج ذیل کتابیں، جن کے حوالے بہ کثرت آئے ہیں، مکتبہ ''زکریا دیوبند'' کی مطبوعہ ہیں۔

**(۱) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار**

**(۲) البحر الرّائق**

**(۳) الفتاوی الهنديّة**

**(۴) الخانية على الهنديّة**

**(۵) الفتاوی التّاتارخانية**

**(٦) بدائع الصّنائع**

**(۷) امدادالفتاوی**

**(۸) امدادالاحکام**

# عقائد اور متعلقاتِ قرآن

## ''استواء علی العرش'' اور مسئلہ ''نور و بشر'' سے متعلق چند سوالات

**سوال:** ﴿۱﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں؟

میں بنگلہ دیش میں اپنے اسلامی عقائد کے حوالے سے کافی پریشان ہوں، ہمارے درمیان بدعتی، سلفی، اہلِ حدیث وغیرہ ہیں، بہت افسوس ہوتا ہے جب یہ سب جماعتیں اپنے اپنے عقائد کو قرآن وحدیث کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں، میرے کچھ سوالات ہیں، جن کے بارے میں میں تذبذب میں ہوں، براہِ کرم، ان کا جواب دیں۔

(۱): اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ کیا وہ عرش پر ہے یا کہیں اور؟

(۲): کیا اللہ تعالیٰ کی کوئی شکل ہے؟ یا وہ بغیر کسی شکل کے ہے؟

(۳): کیا نبی ﷺ ہماری طرح عام آدمی تھے؟

(۴): کیا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو نور سے پیدا کیا؟

براہِ کرم جواب دیں۔ والسلام (۳۰۰/ د۱۴۳۵ھ)

**باسمہٖ تعالیٰ**

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

(۱): بلا شبہ قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے متعلق استواء علی العرش کا ذکر آیا ہے؛ لیکن یہ اور اس جیسی دیگر متشابہات کے بارے میں جمہور سلف کا موقف ''تنزیہ مع التفویض'' کا ہے(۱)

---

(۱) وإنّما یسلك في هٰذا المقام مذهب السّلف ............ من أئمّة المسلمین قدیمًا وحدیثًا وهو إمرارُها كما جاء ت من غیر تكییف ولا تشبیه ولا تعطیل إلخ .

(تفسیر ابن كثیر: ۳/۳۸۳، الأعراف:۵۴، دار الكتب العلمیة ، بیروت)

یعنی ان آیتوں کی حقیقی مراد اللہ ہی کے علم میں ہے، اور ظاہری الفاظ سے جو مفہوم مستفاد ہوتا ہے اگر وہ ذات باری تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہے، تو اللہ رب العزت اس سے مبرا ہیں(۱) پس یقیناً اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے عرش پر استواء ثابت ہے اور عرش سے اس کا ایک خاص تعلق ہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ''عرش'' اللہ کے لیے مکان ہے اور خدا کی ذات اس مکان میں ہے، یا اللہ تعالیٰ کسی خاص جہت مثلاً جہت علو (اوپر) میں ہیں؛ کیوں کہ ذاتِ باری تعالیٰ ان معانی کی تحدید سے مبرا ہے، نیز اس کی حقیقی مراد و کیفیت کا ادراک انسانی عقل سے بالاتر ہے، چنانچہ ملاّ علی قاریؒ ''شرح فقہ اکبر'' میں تحریر فرماتے ہیں: **وهو شيء لا كالأشياء بلا جسم ولا جوهر ولا عرض ...... فما ذكر الله في القرآن من ذكر الوجه واليد والنّفس ............ و كذا قوله تعالىٰ "الرّحمٰن على العرش استوى" فهو صفات متشابهات بلا كيف** (۲) یعنی وہ شئ ہے (لیکن دیگر) اشیاء کی طرح نہیں ہے، (وہ) بلا جسم کے ہے، بلا جوہر کے اور بلا عرض کے، پس قرآن میں اللہ تعالیٰ نے وجہ (چہرہ) ید (ہاتھ) نفس (جان) کا جو ذکر فرمایا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (سب) صفات متشابہات میں سے ہیں، بلا کسی کیفیت کے۔

(۲): اللہ رب العزت ہر طرح کی شکل وصورت سے پاک ہے؛ کیوں کہ شکل وصورت یہ اجسام کا خاصہ ہے، اور اللہ تعالیٰ جسم وجسمانیات سے مبرا ہیں، چنانچہ شرح عقائد میں ہے: **ولا مصوّر أي ذي صورة وشكل مثل صورة إنسان وفرس ؛ لأنّ تلك من خواص الأجسام**(۳) یعنی صورت والی نہیں ہے جیسا کہ انسان اور گھوڑے کی صورت ہوتی ہے؛ اس لیے کہ وہ اجسام کے خواص میں سے ہے (اور اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانیات سے پاک ہے)۔

---

**(۱) فليس بمحدود ولا معدود ولا متصوّر ولا متبعّض ولا متحيّز ، ولا متركّب ولا متناهٍ ولا يوصف بالمائيّة والماهية ولا بالكيفية ........... ولامتمكّن في مكان لا علو و لا سفل ولا غيرها . (شرح الفقه الأكبر، ص:٤٣، ط:أشرفي ديوبند)**

**(۲) شرح الفقه الأكبر، ص:۴۳-۴۴، ط:أشرفي، وهٰكذا في عمدة القاري للعلاّمة العيني .**

**(۳) شرح العقائد النّسفيّة ، ص:۳۸، ط: إمدادية .**

(۳): یہ صحیح ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی ذات کے اعتبار سے ہماری طرح انسان تھے ﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ الآية (۱) یعنی آپ کہہ دیجئے میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں؛ لیکن آپ ﷺ کو بہت سے فضائل، کمالات اور امتیازات حاصل ہیں، جن کی بنیاد پر آپ کو ہماری طرح عام انسان نہیں کہا جا سکتا، **بشر لا كالبشر؛ بل هو كالياقوت في الحجر** یہ مقولہ مشہور ہے، یاقوت بھی ایک پتھر ہوتا ہے؛ لیکن اسے عام پتھروں کی طرح نہیں کہا جا سکتا۔

(۴): اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حضرت عبد اللہ اور حضرت آمنہ کے گھر میں پیدا کیا، آپ عبد المطلب کے پوتے، حضرت حمزہؓ و حضرت عباسؓ کے بھتیجے، عربی اور قریشی تھے، قرآن کے الفاظ میں آپ انسان تھے۔ ﴿اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ﴾ (میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں) اور ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِنْ اَنْفُسِكُمْ ﴾ (۲) (تحقیق کہ تمہارے پاس تمہاری جنس سے ایک رسول آچکا ہے)؛ البتہ ہادیٔ عالم ہونے کی حیثیت سے نور؛ بلکہ سراپا نور ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ذات کے لحاظ سے بشر اور صفات کے اعتبار سے نور ہونے کا عقیدہ رکھنا چاہیے، آپ کو صرف نور ماننا اور بشریت کا انکار کرنا گمراہی ہے۔ (۳) فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دار العلوم دیوبند ۱۰/۳/۱۴۳۵ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دار العلوم دیوبند

## متشابہات کے سلسلے میں اہلِ سنت والجماعت کے مسلک کی وضاحت

**سوال:** ﴿۲﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

---

(۱) الكهف: ۱۱۰.	(۲) التّوبة: ۱۲۸.

(۳) في مدارك التّنزيل: " قد جاء كم من الله نور و كتاب مبين " يريد القرآن لكشفه ظلمات الشّرك والشّكّ ولإبانته ما كان خافيًا على النّاس من الحقّ أو لأنّه ظاهر الإعجاز أو النّور محمّد – عليه السّلام –؛ لأنّه يهتدي به كما سُمِّيَ سراجًا .

(۱/۴۳۶، دار الكلم الطّيّب، بيروت)

دارالعلوم دیوبند کی ویب سائٹ پر ایک فتویٰ ہے، جس میں لکھا ہے کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے اور ہر چیز میں موجود ہے، سوال اس میں یہ ہے کہ ''حلولیہ'' کا عقیدہ ہے کہ اللہ ہر چیز میں موجود ہے، تو ہم میں اور ان کے عقیدے میں کیا فرق ہے؟ کیوں کہ وہ بھی اللہ کو ہر چیز میں مانتے ہیں اور ہم بھی اس کو مانتے ہیں۔

نیز ہر جگہ ہونے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان جگہوں میں مانا جائے، جو اللہ کے شان کے مناسب نہیں ہیں، اگر اس عقیدہ کی وضاحت مکمل طریقے سے ہو جائے کہ اس میں ہمارے اکابر کا مسلک کیا ہے؟ اور ہم کیا اعتقاد رکھیں؟ اللہ آپ کی عمر میں اور علم میں برکت عطا فرمائے۔ آمین　　　　۱۳۳۳/د ۱۴۳۵ھ

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

قرآن وحدیث کے بعض نصوص مثلاً: ﴿هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا﴾ ترجمہ: وہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ لوگ کہیں بھی ہوں۔

اسی طرح ﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَجْوَى ثَلاثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾(۱) ترجمہ: کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ نہ ہو۔

نیز حدیث: **لَوْ أَنَّكُمْ دَلَّيْتُمْ بِحَبْلٍ إِلَى الْأَرْضِ السُّفْلَى لَهَبَطَ عَلَى اللّٰہ** (۲) (ترجمہ: اگر تم کوئی رسّی لٹکاؤ نچلی زمین کی طرف تو وہ اللہ تک پہونچے گی) وغیرہ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ''ہر جگہ موجود ہے،'' بلا شبہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے؛ لیکن ہر جگہ موجود ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کوئی جسم ہے جو ہوا کی طرح ہر جگہ پھیلا اور بھرا ہوا ہے؛ کیوں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا مکان کے ساتھ مقید ہونا اور مجسم ہونا لازم آتا ہے، جس سے ذاتِ باری تعالیٰ مبرا اور منزہ ہے؛ پھر آخر اس طرح کے نصوص کی صحیح مراد کیا ہے؟ تو اس سلسلے میں اہل سنت

(۱) المجادلة: ۷ .

(۲) ترمذي ، رقم: ۳۲۹۸، باب ''ومن سورة الحديد''.

والجماعت کے دوموقف ہیں (۱):

(۱) جمہور سلف فقہاء ومحدثین کا موقف اس طرح کی نصوص کے سلسلے میں ''تنزیہ مع التفویض'' کا ہے، یعنی نصوص میں جو صفات اللہ رب العزت کے لیے ثابت کی گئی ہیں، مثلاً: ﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾(۲) میں ''يد'' اور ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾(۳) میں ''اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ'' اور ﴿هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا﴾(۴) میں ''معيت'' نیز حدیث: يَضْحَكُ اللّٰهُ إِلٰى رَجُلَيْنِ (۵) میں ''ضحك'' یہ سب اوصاف بلاشبہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے اس کی شایانِ شان ثابت ہیں؛ لیکن نہ تو یہ صفات مخلوقات کی صفات کی طرح ہیں لقوله تعالیٰ: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾(۶) یعنی کوئی چیز اس کی مثل نہیں اور نہ ہی ہمیں ان اوصاف کی کوئی کیفیت اور حقیقت معلوم ہے؛ چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں مسلک سلف کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: '' وَإِنَّمَا يُسلك فِي هَذَا الْمَقَامِ مَذْهَبُ السَّلَفِ ........ مِنْ أَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ قَدِيمًا وَحَدِيثًا ، وَهُوَ إِمْرَارُهَا كَمَا جَآءَ تْ مِنْ غَيْرِ تَكْيِيفٍ وَلاَ تَشْبِيهٍ وَلاَ تَعْطِيل. ''(۷)

---

(۱) ثمّ اعلم أنّ كثيرًا مِن النّاس جعل الصّفات النّقلية من الاستواء واليد والقدم والنّزول إلى السّماء الدّنيا والضّحك والتّعجّب وأمثالها من المتشابه ، ومذهب السّلف والأشعري من أعيانهم ........... أنّها صفات ثابتة وراء العقل ما كلّفنا إلاّ اعتقاد ثبوتها مع اعتقاد عدم التّجسيم والتّشبيه لئلاّ يضاد النّقل العقل ، وذهب الخلف إلى تأويلها وتعيين مراد الله تعالىٰ منها ، فيقولون الاستواء مثلاً بمعنى الاستيلاء والغلبة .

(روح المعاني: ۳/ ۸۷، ط: إمدادية ملتان، مبحث في قوله تعالىٰ: وما يعلم تأويله إلاّ اللّٰه)

(۲) الفتح : ۱۰.

(۳) طٰهٰ : ۵ .

(۴) المجادلة : ۷ .

(۵) البخاري ، رقم :۲۸۲۶، باب الكافر يقتل المسلم ثمّ يسلم ، فيسدّد .

(۶) شورىٰ : ۱۱

(۷) ابن كثير، سورة الأعراف: ٥٤.

یعنی اس مقام پر شروع سے لے کر آج تک کے ائمہ مسلمین اور سلف کا مسلک اختیار کیا جائے گا اور وہ: انہیں اسی طرح رکھنا ہے جس طرح یہ ثابت ہیں، نہ ان کی کوئی کیفیت بیان کی جائے گی، نہ کسی چیز کے ساتھ تشبیہ دی جائے گی، نہ اُنہیں معطل قرار دیا جائے۔

اسی طرح ملا علی قاری رحمہ اللہ شرح فقہ اکبر میں امام مالکؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

**''الاستواء معلوم والكيف مجهول والسُّؤال عنه بدعة والإيمان به واجب''.**

یعنی ''استواء'' معلوم اور یقینی ہے، اس کی کیفیت غیر معلوم ہے، اس سے متعلق کھود کرید کرنا بدعت ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: **و هٰذا طريقة السّلف، و هو أسلم، والله أعلم**(۱)

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ نصوص میں وارد صفاتِ خداوندی کو بعینہٖ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے ثابت کرنا (**كما يليق بشأنه**) اور اس کی کنہ وحقیقت کو علم الٰہی کے حوالہ کرنا یہی جمہور سلف کا موقف ہے، واضح ہو کہ یہی ''مسلکِ تفویض'' ہمارے اکابر علمائے دیوبند کا بھی اصل مسلک ہے؛ چنانچہ ''**المهنّد على المفنّد**'' میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

**'' قولنا في أمثال تلك الآيات ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى﴾ إنّا نؤمن بها ولا يقال كيف، ونؤمن بالله سبحانه وتعالى، متعالٍ ومنزّه عن صفات المخلوقين وعن سمات النّقص والحدوث كما هو رأى قدمائنا** (۲)

ترجمہ: اس قسم کی آیات میں ہمارا مذہب یہ ہے کہ اُن پر ایمان لاتے ہیں اور کیفیت سے بحث نہیں کرتے، یقیناً جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مخلوق کے اوصاف سے منزہ اور نقص وحدوث کی علامات سے مبرا ہے، جیسا کہ ہمارے متقدمین کی رائے ہے۔

اسی طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

(۱) شرح الفقه الأكبر، ص:٤٦، ط: أشرفي ديوبند.

(۲) المهنّد على المفنّد، ص:۸، ط: رحيمية ديوبند.

''میں اس عقیدہ میں حضرات سلف کے مسلک پر ہوں کہ نصوص اپنی حقیقت پر ہیں؛ مگر کنہ اس کی معلوم نہیں۔''(۱)

نیز فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے ایک سوال وجواب سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:

**سوال:** بعض مسلمان کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ گویا ہر چیز میں حلول کیے ہوئے ہے، ہمارے حضرات اکابر کا کیا مسلک ہے؟

**جواب:** اللہ تعالیٰ کسی چیز میں حلول کیے ہوئے نہیں ہے؛ مگر وہ سب کے ساتھ ہے اور سب کے نزدیک ہے اور سب کو محیط ہے؛ لیکن کیفیت اس کے قرب ومعیت اور احاطہ کی ہم نہیں سمجھ سکتے (۲)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہمارے اکابر علمائے دیوبند کا اصل مسلک وہی ہے جو جمہور سلف کا مسلک ہے، یعنی ''مسلک تفویض''۔

(۲) اہلِ سنت والجماعت کا دوسرا موقف ''تنزیہ مع التاویل'' کا ہے، جو جمہور حضرات خلف اور متأخرین کا مسلک ہے، یعنی وہ اس طرح کی نصوص کی ایسی تاویلات کرتے ہیں اور ایسے معنی پر انھیں محمول کرتے ہیں، جو ذاتِ باری تعالیٰ کے شایانِ شان ہو مثلاً: ''اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ'' کو ''استعلاء اور غلبہ'' سے کنایہ قرار دیتے ہیں، اسی طرح ''ید'' کے معنی قدرت اور ''وضع قدم'' کے معنی مقہور ومغلوب کردینے کے لیتے ہیں، نیز ''معیت'' سے معیت بالعلم والقدرۃ کے معنی مراد لیتے ہیں؛ چنانچہ سورۂ حدید کی آیت: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾(۳) کی تفسیر میں صاحب بیضاوی فرماتے ہیں: ''**لا ينفكّ علمه وقدرته عنكم بحالٍ**(۴) **وهٰكذا في عامّة كتب التّفاسير**، واضح ہو کہ یہ ''مسلکِ تاویل'' بھی اہلِ سنت والجماعت کا مسلک ہے اور ہمارے علمائے دیوبند بھی ثانوی درجہ میں اس کی اجازت دیتے ہیں، چنانچہ ''**المهنّد على المفنّد**'' میں ہے: ''**وأمّا ما قال المتأخّرون من أئمّتنا في تلك الآيات يؤوّلونها بتأويلاتٍ صحيحةٍ سائغةٍ في اللّغة**

---

(۱) امداد الفتاویٰ: ۶/۲۵، ط: زکریا دیوبند.

(۱) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۱۸/ ۱۰۷، مطبوعہ: دارالعلوم دیوبند۔

(۳) سورۃ الحدید: ٤.

(۴) تفسیر بیضاوي: ۱۸۵/۵، ط: بیروت.

**والشّرع بأنّه يمكن أن يكون المراد من الاستواء الاستيلاء ومن اليد القدرة إلى غير ذلك تقريبًا إلى أفهام القاصرين فحقّ أيضًا عندنا''(۱)**

ترجمہ:اور ہمارے متأخرین اماموں نے ان آیات میں لغت وشرع کے اعتبار سے جو صحیح اور جائز تاویلیں فرمائی ہیں تاکہ کم فہم سمجھ لیں، مثلاً یہ کہ ممکن ہے استواء سے مراد غلبہ اور ہاتھ سے مراد قدرت،تو یہ بھی ہمارے نزدیک حق ہے۔

البتہ نصوص میں اس تاویلی معنی مراد لینے کے لیے چند شرطیں ہیں:

(۱):لفظ میں وہ تاویلی معنی مراد لینے کی وسعت اور گنجائش ہو۔

(۲):وہ معنی مرادی شانِ الوہیت کے منافی نہ ہو؛ بلکہ لائق اور مناسب ہو۔

(۳):وہ معنی کسی دوسری نص میں خدا تعالیٰ کے لیے ثابت ہو۔

(۴):اس تاویلی معنی کو حتمی اور قطعی نہ باور کیا جائے۔(۲)

خلاصہ یہ کہ''مسلکِ تفویض''اور''مسلکِ تاویل''دونوں موقف برحق اور درست ہیں، دونوں اہلِ سنت والجماعت کے موقف ومسلک ہیں، ان دونوں میں سے کسی کا اعتقاد رکھنے والے کی تجہیل وتغلیط جائز نہیں، نیز یہ مسئلہ بڑا نازک ہے،اس میں زیادہ غور وخوض نہیں کرنا چاہیے،حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''صبیغ''نامی ایک شخص کو جو مدینہ میں آکر متشابہات میں گفتگو کرتا تھا سخت سزا دی تھی اور جب وہ واپس اپنے وطن گیا تو حضرت ابو موسیٰ اشعری کو حکم بھیجا کہ کوئی مسلمان اس کے پاس بیٹھنے نہ پائے(۳)

---

**(۱) المهنّد على المفنّد، ص:۸، ط: رحيمية ديوبند .**

(۲) علمائے دیوبند کے عقائد ونظریات، ص:۴۵۔

**(۳)أخرجه الدّارمي عن سليمان بن يسار أنّ رجلاً يقال له صبيغ قدم المدينة، فجعل يسأل عن متشابه القرآن ، فأرسل إليه عمر رضي الله عنه وقد أعدّ له عراجين النّخل فقال من أنت؟ قال: أنا عبد الله صبيغ فأخذ عمر عرجونا من تلك العراجين فضربه ، وقال: أنا عبد الله عمر فجعل له ضربًا حتى دَمِيَ رأسه ، فقال يا أمير المؤمنين ! حسبك ، قد ذهب الّذي كنت أجد في رأسي. (سنن دارمي: ۲۵۲/۱، رقم : ۱۴۶، ط: دار المغني ، مكّة المكرّمة)**

وفي روح المعاني : وكتب إلى أبي موسىٰ الأشعري أن لا يجالسه أحد من المسلمين .　　(روح المعانی:۳/۸۸،سورۂ آل عمران، ط: امدادیہ ملتان)

آخر میں فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کا ایک سوال وجواب ملاحظہ ہو:

سوال: ایک شخص اللہ جل شانہٗ کا مقام بلا کیف واتصال عرش کو مانتا ہے اور دوسرا شخص کہتا ہے کہ اللہ جل جلالہٗ ہر جگہ پر بلا کیف واتصال ہے، صحیح کیا ہے؟

جواب: یہ دونوں امر صحیح ہیں اور نص میں وارد ہیں، اس میں بحث نہ کرنی چاہیے۔الخ (۱)

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۴/۱۲/۳۵ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## بائبل اور تورات میں واقع چند تحریفات

مکرمی ومحترمی حضرت مفتی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

**سوال:** ﴿۳﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

ایک عیسائی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ تورات اور بائبل میں تبدیلی آگئی ہے، کیا آپ ثبوت دے سکتے ہیں کہ اس میں تبدیلی آگئی ہے؟ میں کیا جواب دوں؟ ۹/۱/۷ ۱۴۳۳ھ

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

ان کتابوں میں تحریف کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان (تورات اور بائبل) میں کثرت سے اختلافات اور غلطیاں پائی جاتی ہیں، جن میں سے چند مثالیں اردو ترجمہ ''اظہار الحق'' بنام ''بائبل سے قرآن تک'' سے نقل کی جاتی ہیں:

(۱) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۱۸/ ۱۰۷، مطبوعہ: دارالعلوم دیوبند۔

تورات سے متعلق :

(۱) ''موجودہ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب نہیں'' کے تحت مصنف ''اظہار الحق'' لکھتے ہیں :

جو شخص بھی کتاب حزقیال کے باب ۴۵ و ۴۶ کا مقابلہ کتاب ''گنتی'' کے باب ۲۸ و ۲۹ کے ساتھ کرے گا، تو دونوں کو احکام میں ایک دوسرے کے مخالف پائے گا اور یہ بات موٹی سی ہے کہ حزقیالؑ تورات کے تابع تھے، اب اگر حزقیال کے زمانے میں یہی مشہور تورات تھی، تو وہ اس کی احکام میں مخالفت کیوں کر کر سکتے تھے؟

(۲) اسی طرح توریت کے اکثر مقامات پر یہ مضمون پایا جاتا ہے کہ بیٹے اپنے بڑوں کے گناہوں میں تین پشتوں تک ماخوذ ہوں گے۔

اور کتاب حزقیال کے باب: ۱۸، آیت ۲۰ میں یوں کہا گیا ہے کہ ''جو جان گناہ کرتی ہے، وہی مرے گی، بیٹا، باپ کے گناہوں کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور نہ باپ بیٹے کے گناہ کا بوجھ، صادق کی صداقت اپنے لیے ہوگی اور شریر کی شرارت شریر کے لیے ہوگی(۱) (یہ کھلا تضاد ہے)۔

بائبل سے متعلق :

مؤلف ''اظہار الحق'' بائبل کے اختلافات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱) کتاب سلاطین ثانی باب: ۸، آیت: ۲۶ میں کہا گیا ہے کہ اخزیاہ بائیس برس کا تھا، جب وہ سلطنت کرنے لگا، (لیکن) کتاب تواریخ ثانی کے باب: ۲۲، آیت: ۲ میں یوں ہے کہ اخزیاہ بیالیس برس کا تھا، جب وہ سلطنت کرنے لگا۔(۲)

(۲) سفر سموئیل ثانی، باب: ۲۴، آیت: ۱۳، اس طرح ہے کہ ''سو جاد نے داؤد کے پاس جا کر اس کو یہ بتایا اور اس سے پوچھا: کیا تیرے ملک میں سات برس قحط رہے۔

اور کتاب تواریخ اوّل کے باب: ۲۱، آیت: ۱۲، میں یوں ہے کہ: یا تو قحط تین برس''۔

---

(۱) بائبل سے قرآن تک، ج: ۱، ص: ۳۲۸، حافظی بک ڈپو، دیوبند۔

(۲) بائبل سے قرآن تک، ج: ۱، ص: ۳۷۵، حافظی بک ڈپو، دیوبند۔

دیکھئے پہلی عبارت میں سات سال اور دوسری میں تین سال کی مدت بتائی گئی ہے، اور ان کے مفسرین نے پہلے قول کو غلط قرار دیا ہے۔

نیز مصنف ''اظہار الحق'' بائبل کی غلطیوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کتاب پیدائش، باب:۱۷، آیت:۸، میں یوں ہے کہ ''اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے، ایسا دوں گا کہ وہ دائمی ملکیت ہو جائے اور میں ان کا خدا ہوں گا''۔

یہ بھی صریح غلط ہے، اس لیے کہ تمام سرزمین کنعان ابراہیم علیہ السلام کو کبھی بھی نہیں ملی اور نہ ان کی نسل کو بادشاہت اور دوامی حکومت نصیب ہوئی؛ بلکہ اس سرزمین میں جس قدر بے شمار انقلابات ہوتے رہے، وہ شاید ہی کسی ملک میں پیش آئے ہوں گے اور مدتِ مدید گزری کہ اسرائیلی حکومت اس سرزمین سے قطعی ختم ہو چکی ہے۔(۱)

مزید تفصیل کے لیے مذکورہ کتاب یعنی ''بائبل سے قرآن تک'' ترجمہ ''اظہار الحق'' ملاحظہ فرمائیں، یہ کتاب حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی شرح وتحقیق کے ساتھ دیوبند سے تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۳/۱/۱۴۳۳ھ

الجواب صحیح: محمود حسن بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق اور نبوت سے متعلق چند سوالات

**سوال:** ﴿۴﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

کیا یہ عقائد قرآن وسنت سے ثابت ہیں؟

(الف) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے نبی ہیں؟

(۱) بائبل سے قرآن تک، ج:۱،ص:۴۵۹، حافظی بک ڈپو، دیوبند۔

(ب) آپ ﷺ کے نور کو آدم علیہ السلام کی خلقت سے پہلے؛ بلکہ دنیا کی خلقت سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا؟

(ج): آدم علیہ السلام نے آپ ﷺ کے وسیلے سے دعا کی۔

براہِ کرم قرآن کریم اور حدیث کے حوالے لکھیں۔　　(۴۶۱/د۱۴۳۵ھ)

## باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰه التّوفيق :**

(الف) آپ ﷺ نبوت عطا کیے جانے کے اعتبار سے سب سے مقدم ہیں اور بعثت کے اعتبار سے سب سے مؤخر ہیں، چنانچہ ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: **عن أبي هريرة رضي اللّٰه عنه قال: قالوا: يا رسول اللّٰه! متٰى وجبت لك النّبوّة؟ قال: "وآدم بين الرّوح والجسد"** یعنی صحابۂ کرام نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ کے لیے نبوت کب ثابت ہوئی؟ تو اللہ کے رسول نے فرمایا: (مجھے نبوت اس وقت ملی) جب آدم جسم اور روح کے درمیان تھے۔ اس حدیث کی شرح میں حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ نے "**العرف الشّذي**" میں تحریر فرمایا: **أي كان النّبيّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم نبيًا وجرت عليه أحكام النّبوّة من ذلك الحين، بخلاف الأنبياء السّابقين، فإنّ الأحكام جرت عليهم بعد البعثة كما قال مولانا الجامي أنّه كان نبيًا قبل النّشأة العنصريّة** (۱) یعنی نبی کریم ﷺ نبی تھے، اور اسی وقت سے احکامِ نبوت آپ پر جاری تھے، انبیائے سابقین کے برخلاف؛ اس لیے کہ ان پر احکام بعثت کے بعد جاری ہوئے جیسا کہ مولانا جامیؒ نے فرمایا کہ آپ (علیہ الصلاۃ والسلام) "نشأتِ عنصری" سے پہلے نبی تھے۔

(ب) پہلے پیدا کیے جانے کے سلسلے میں احادیث میں مختلف چیزیں مذکور ہیں، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے نور کو پیدا کیا گیا، جب کہ دیگر بعض روایتوں میں قلم، عرش وغیرہ کو

---

**(۱) ترمذي مع العرف الشّذي: ۲/ ۵۲۵، أبواب المناقب، باب ما جاء في فضل النّبيّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم، ط: شيخ الإسلام.**

سب سے پہلے پیدا کیے جانے کی صراحت ملتی ہے(۱) البتہ ابن حجرؒ نے سب سے پہلے نور کو پیدا کیے جانے کا رجحان ظاہر کیا ہے۔ **قال ابن حجر : اختلفت الرّوايات في أوّل المخلوقات ، وحاصلها كما بينتها في شرح شمائل التّرمذي: أنّ أوّلها النّور الّذي خلق منه عليه الصّلاة والسّلام ، ثمّ الماء ثمّ العرش.(۲)**

(ج): *البدایہ والنہایہ* میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت منقول ہے : **عن عمر بن الخطّابؓ قال: قال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم:" لما اقترف آدم الخطيئة قال: يا ربّ! أسئلك بحقّ محمّد أن غفرت لي، فقال الله فكيف عرفت محمّدًا ولم أخلقهٗ بعد فقال يا ربّ لأنّك لما خلقتني بيدك ونفخت فيّ من روحك و رفعت رأسي فرأيت علىٰ قوائم العرش مكتوبًا لآ اِلٰهَ اِلاَّ الله محمّد رّسول الله فعلمت أنّك لم تضف إلىٰ اسمك إلاّ أحبّ الخلق إليك ، فقال الله صدقت يا آدم إنّه لأحبّ الخلق إليّ و إذ سألتني بحقّه فقد غفرت لك ، ولولا محمّد ما خلقتك (۳)** مگر محدثین کے

---

(۱)......(الف) **وروي أنّ أوّل ما خلق الله العقل و أن أوّل ما خلق الله نوري ، و أن أوّل ما خلق الله روحي ، و أن أوّل ما خلق الله العرش ، والأوّليّة من الأمور الإضافيّة إلخ .**

**(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح ، ۱/۱۶۸، ط:ملتان)**

**(ب) عن عبادة الصّامت قال : قال رسول الله – صلّى الله عليه وسلّم – إنّ أوّل ما خلق الله القلم ، فقال له : اكتب الحديث . (أخرجه التّرمذي،رقم:۳۳۱۹، باب: ومن سورة:"النّون والقلم")**

**(ج) عن عبد الله بن عمرو قال: قال رسول الله – صلّى الله عليه وسلّم – كتب اللّٰه مقادير الخلائق قبل أن يخلق السّماوات والأرض بخمسين ألف سنة ، قال : وكان عرشه على الماء . (أخرجه مسلم،رقم:۲۶۵۳، كتاب الإيمان)**

**(۲) مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح ،۱/۲۴۱، ط:أشرفي ديوبند .**

**(۳) البداية و النّهاية ، باب ما ورد في خلق آدم – عليه السّلام – ۱/۹۱، دار إحياء التّراث العربي .**

نزدیک یہ روایت حد درجہ ضعیف ہے؛ بلکہ علامہ ذہبیؒ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۴/۵/۱۴۳۵ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## بعض عقائد اور ''جماعت اہلِ حق'' سے متعلق سوال

**سوال:** ﴿۵﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

جناب برائے مہربانی میرے چند سوالوں کا جواب قرآن اور سنت کی روشنی میں دیں:

(۱) ہمیں دعاؤں میں وسیلہ کیسے لینا چاہیے، کیا کسی مخلوق کی ذات کا وسیلہ لے سکتے ہیں؟ اگر ہاں تو کیوں؟ اور اگر نہیں تو کیوں؟

(۲) موجودہ حالت میں بہت سارے فرقے ہیں اور سب ہی اپنی بات کو دلیل کے ساتھ ثابت کر دیتے ہیں، ایسے میں ایک عام مسلمان کو کس پر اعتماد کرنا چاہیے اور کیوں؟

(۳) بریلوی لوگ کہتے ہیں کہ دیوبندی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے جیسا بشر کہتے ہیں اور اولیاء اللہ کو برا بھلا کہتے ہیں؛ اس لیے ان کے پیچھے نماز نہیں ہوگی اور میں اب تک بریلویوں کے پیچھے نماز پڑھتا آیا ہوں، کیا میری نماز ہوئی؟ اور آگے سے کیا کروں؟

مستفتی: سید افضل رضا، ۹۳/۷/د ۱۴۳۰ھ

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق و بہٖ نستعین:**

(۱) انبیاء اور بزرگانِ دین جن کی بزرگی (ولایت) پر دلیل قائم ہے، ان کے توسل سے دعا مانگنا جائز ہے۔ **وعن عثمان بن حنیف أنّ رجلاً ضریر البصر أتی النّبيّ– صلّی اللّٰہ علیه وسلّم– قال ادع اللّٰہ أن یعافِیَني قال: إن شئتَ دعوتُ وإنْ شئتَ صبرتَ فھو**

**خير لك قال فادعه قال فأمره أن يتوضّأ فيُحْسِن وضوءه ويدعو بهذا الدّعاء: اللّٰهمّ إنّي أسئلك وأتوجّه إليك بنبيّك محمّد** (۱) ترجمہ: یعنی حضرت عثمان بن حنیفؓ سے مروی ہے کہ ایک نابینا شخص نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہا: اللہ سے میرے لیے دعا فرما دیں کہ وہ مجھے شفا دے دے، تو حضور ﷺ نے فرمایا: اگر آپ چاہیں تو میں دعا کر دوں، اگر آپ چاہیں تو صبر کر لیجئے، یہ آپ کے حق میں بہتر ہے، تو اس شخص نے جواب دیا کہ آپ دعا فرما دیں، تو اللہ کے رسول نے ان سے فرمایا کہ اچھی طرح وضو کر کے دعا کے ساتھ یہ کہیں: اے اللہ! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں اور آپ کے نبی محمد ﷺ کے وسیلے سے آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

**وقال العلّامة الآلوسي في روح المعاني: إنّ التّوسّل بجاه غير النّبيّ – صلّى اللّٰه عليه وسلّم – لا بأس به أيضًا إن كان المُتَوَسَّلُ بجاهه ممّا عُلِمَ أنّ له جاهًا عند اللّٰه تعالىٰ كالمقطوع بصلاحه وولايته.** (۲)

(۲) جو جماعت قرآن وسنت رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نقش قدم پر ہو وہ جماعت حق پر ہے، الحمد للہ مسلک علمائے دیو بند ان تینوں کے عین مطابق ہے، اگر آپ غیر جانب دارانہ طور پر جائزہ لیں گے، تو ان شاء اللہ یہ حقیقت آپ کے سامنے عیاں ہو جائے گی علمائے دیو بند کے عقائد کی جانکاری کے لیے **المهنّد على المفنّد** نامی کتاب کا مطالعہ کیجیے، جس میں عرب ممالک کے علمائے کرام کی تصدیقات ثبت ہیں۔

(۳) حضرت نبی اکرم ﷺ کو جب اللہ تعالیٰ نے بشر بنایا اور آپ ﷺ کو بشریت کے اعلان کا حکم فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰىٓ اِلَيَّ﴾ (۳) تو پھر بشریت کو نہ ماننا صریح ارشاد خداوندی کے خلاف ہے؛ البتہ حضور کے بشر ہونے کے باوجود اللہ پاک نے آپ کو بہت ساری خصوصیات کے ساتھ نوازا، اپنا حبیب وخلیل بنایا، تمام پیغمبروں کا سید بنایا، قرآن کریم آپ پر نازل فرمایا، ہر قسم کے گناہوں سے آپ کو معصوم رکھا، آپ کے صحابہ اور اہل بیت کو وہ درجہ دیا کہ

---

(۱) أخرجه التّرمذي، رقم: ۳۵۷۸، باب بلا ترجمة .
(۲) روح المعاني: ۱۲۸/۶، ط: دار إحياء التّراث العربي، بيروت .
(۳) الكهف : ۱۱۰.

پیغمبر کے بعد کسی کو نہیں ملا، اپنی رضا اور آخرت کی نجات کو آپ کی اتباع میں منحصر کر دیا۔

اولیائے کرام کے بارے میں ہمارا وہی اعتقاد ہے جو قرآن کریم میں ہے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾(۱) اگر آپ کے آس پاس مسجد میں کوئی غیر بدعتی امام ہوں، تو آپ ان کی اقتداء میں نماز پڑھیں اور اگر نہیں ہیں اور بریلوی امام صاحب اگر غالی نہیں ہیں تو پھر ان کی اقتداء میں نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳/۴/۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

# توسّل، استعانت بغیر اللہ اور تصور شیخ کا حکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال: ﴿۶﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

میں پیشہ سے انجینئر ہوں، پاکستان میں رہتا ہوں، اور دیوبندی مسلک پر عمل کرتا ہوں، میں کچھ مسائل جیسے حضرت محمد ﷺ اور مرشد سے مدد مانگنے کے حوالے سے دیوبند کا بالکل صحیح نظریہ جاننا چاہتا ہوں، کیا ہم مرشد کا ان کی عدم موجودگی میں تصور کر سکتے ہیں؟ ان سے دنیاوی چیزوں سے متعلق مدد مانگ سکتے ہیں؟ یہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ مرشد میرے جو بھی کریں گے وہ اللہ کی اجازت سے ہی ہوگا، کیا ان مسائل سے متعلق کسی دیوبندی عالم کی کتاب ہے؟ براہِ کرم میری رہنمائی فرمائیں۔　　(۵۱۵/د۱۴۳۵ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب وباللہ التّوفیق:

حضرات اولیائے کرام کو بارگاہِ خداوندی میں وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا درست ہے،

(۱) یونس: ۶۲.

مثلاً یا اللہ اپنے اولیاء کے طفیل، یا فلاں بزرگ کے طفیل میرا فلاں کام پورا کردے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ ایک موقعہ پر استمداد کے اقسام بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تیسرے یہ کہ دعا مانگے الٰہی بہ حرمت فلاں میرا کام پورا کردے، یہ بالاتفاق جائز ہے،(۱) اسی طرح **المهنّد على المفنّد** میں ہے: **عندنا وعند مشايخنا رحمهم الله تعالىٰ يجوز التّوسّل في الدّعوات بالأنبياء والصّالحين من الأولياء والشّهداء والصّدّيقين في حياتهم وبعد وفاتهم بأن يقول في دعائه: اللّٰهمّ إنّي أتوسّل إليك بفلان أن تجيب دعوتي وتقضي حاجتي إلى غير ذلك** (۲) یعنی ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک دعاؤں میں انبیاء وصلحاء واولیاء وشہداء وصدیقین کا توسل جائز ہے، ان کی حیات میں یا بعد وفات، بہ ایں طور کہ کہے یا اللہ میں بہ وسیلہ فلاں بزرگ کے تجھ سے دعا کی قبولیت اور حاجت براری چاہتا ہوں، یا اسی جیسے اور کلمات کہے؛ البتہ خود براہِ راست نبی یا وفات یافتہ مرشد سے کوئی چیز نہ مانگی جائے، مثلاً: اے نبی، اے فلاں بزرگ، آپ میرا فلاں کام پورا کردیجئے، میری مصیبت دور کردیجئے، وغیرہ، کیوں کہ یہ کلمات اگر نبی یا ولی کو حاجت روا، مشکل کشا مان کر کہتا ہے تب تو ظاہر ہے کہ یہ کلمات شرکیہ ہیں، ورنہ کم از کم ایہام شرک سے خالی نہیں؛ لہٰذا اس سے احتراز کرنا ضروری ہے۔ **ففي روح المعاني: إنّ النّاس قد أكثروا من دعاء غير الله تعالىٰ من الأولياء ......... مثل يا سيّدي فلان! أغثني ......... واللاّئق بحال المؤمن عدم التّفوه بذلك ......... وقد عدّه أناس من العلماء شركًا، وأن لا يكنه فهو قريب منه** (۳)

رہا مسئلہ ''تصور شیخ'' کا تو حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں ''تصور شیخ جو معمول صوفیہ کا ہے، کسی وقت میں صوفیہ نے اس کو اختیار کیا تھا؛ کسی مصلحت کی وجہ سے اور اس میں کوئی خدشہ نہیں جانا گیا تھا؛ مگر اب اس وقت میں اس کی اجازت شرعی نہیں معلوم ہوتی کہ

(۱) تاليفات رشيديه، ص: ۶۹-۷۰، ط: مكتبه الحق.
(۲) المهنّد على المفنّد، ص: ۳۲، الجواب عن السّوال الرّابع.
(۳) روح المعاني: ۱۲۸/۶، ط: دار إحياء التّراث العربيّ، المائدة: ۳۵.

شائبہ بت پرستی ہوگیا ہے اور اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے''(۱)

اس طرح کے مسائل کے سلسلے میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم الدین، شریعت وطریقت وغیرہ کتابوں کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۰/۵/۱۴۳۵ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## ''یاغوث''، یا''محی الدین''اور''یارسول اللہ'' کہنے کا حکم

**سوال:﴿۷﴾**

**(الف) ما ذا تقولون في التّوسّل بجاه النّبيّ – صلّى الله عليه وسلّم– أو غيره من العلماء في حياتهم أو بعد وفاتهم، حيث ليس جاه ذي الجاه من كسب المتوسّل؟**

**(ب) ما ذا تريدون بالاستشفاع ؟ وهل يجوز ذلك للأموات ؟**

**(ج) هل يجوز الاستعانة بالأموات ؟ والنّداء عند الكرب مثل ياغوث ، يا محي الدّين ؟ أو يا رسول الله أو غير ذلك؟**

**(د) وما تقولون في رجل يستغيث بالأموات قائلاً : فإنّ الله منح لهم القدرة من عنده ليعينوا بها من استعانهم و استغاثهم أو قائلاً : إنّ هؤلاء شفعاؤنا عند الله (۲)بينوا و توجروا .**

**المستفتي**: شفیق احمد کیرالہ (۹۴۶/د ۱۴۳۵ھ)

---

(۱) باقیات فتاویٰ رشیدیہ، ص:۴۲۵، مطبوعہ: کاندھلہ۔

(۲) سوال نامہ کا ترجمہ:

سوال:() کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں؟ :　==

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب و باللّٰہ التّوفیق :

لا نری بأسًا في التّوسّل إلی اللّٰہ بجاہ النّبيّ – صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم – عند اللّٰہ تعالٰی حیًّا ومیّتًا، (۱) ویراد من الجاہ معنًی یرجع إلی صفۃ من صفاتہٖ تعالٰی مثل أن یراد بہٖ المحبّۃ التّامّۃ المستدعیۃ عدم ردّہ وقبول شفاعتہ ، فیکون معنی قول القائل:''إلٰھي أتوسّل بجاہ نبیّك – صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم – أن تقضي لي حاجتي'' إلٰھي اجعل محبّتك لہ وسیلۃ في قضاء حاجتي ، ولا فرق بین ھٰذا وبین قولك''إلٰھي أتوسّل برحمتك أن تفعل کذا؛ إذ معناہ أیضًا إلٰھي اجعل رحمتك وسیلۃ في کذا .

== (۱) جناب نبیٔ کریم ﷺ یا آپ ﷺ کے علاوہ کسی ولی کے وسیلے سے اُن کی زندگی میں یا وفات کے بعد دعا کرنا کیسا ہے؟ جب کہ جاہ والے کی جاہ میں وسیلہ مانگنے والے کے عمل کا کوئی دخل نہیں۔

(۲) آپ کے نزدیک استشفاع (کسی سے شفاعت کی درخواست کرنا) سے کیا مراد ہے؟ کیا مردوں سے طلبِ شفاعت جائز ہے؟

(۳) کیا مردوں سے مدد مانگنا اور آڑے وقت میں ''یا غوث'' ''یا محی الدین'' اور ''یا رسول اللہ!'' وغیرہ جیسے ندائی جملے کہنا جائز ہے؟

(۴) اس شخص کا کیا حکم ہے؟ جو مردوں سے فریاد کرتا ہو اور اس کا یہ عقیدہ ہو کہ ان (مردوں) کو من جانب اللہ ایسی قدرت حاصل ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنے فریادیوں اور سائلوں کی مدد کرتے ہیں یا وہ یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ یہ اللہ کے یہاں ان کے حق میں شفاعت کریں گے۔

المستفتي: شفیق احمد کیرالہ

(۱) والدّلیل علیہ ما رواہ التّرمذي عن عثمان بن حنیف أنّ رجلاً ضریر البصر أتی النّبيّ – صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم – فقال : ادع اللّٰہ أن یعافیني ، قال : إن شئت دعوت ، وإن شئت صبرت فھو خیر لك ، قال: فادعہ ، قال: فأمرہ أن یتوضّأ فیحسن وضوءہ ویدعو بھٰذا الدّعاء : اللّٰھمّ إنّي أسئلك وأتوجّہ إلیك بنبیّك محمّد نبي الرّحمۃ ، إنّي توجّھت بك إلی ربّي في حاجتي ھذہ لتقضي لي فشفعہ في. (أخرجہ التّرمذي،رقم:۳۵۷۸، باب بلاعنوان)

(الف) هٰكذا يجوز التّوسّل بجاه غير النّبيّ – صلّى اللّٰه عليه وسلّم– إن كان الـمتوسّل بجاهه ممّا علم أن له جاهًا عند اللّٰه تعالٰى كالمقطوع بصلاحه و ولايته ، وأمّا من لاقطع في حقّه بذلك فلايتوسّل بجاهه لما فيه من الحكم الضّمني على اللّٰه تعالٰى بما لم يعلم تحقّقه منه عزّ شأنه ، وفي ذلك جرأة عظيمة على اللّٰه تعالٰى.(۱)

(ب) الاستشفاع نوع من التّوسّل؛ فإنّ التّوسّل له أقسام عِدّة ، بعضها جائز كما مضى في الإجابة عن السّوال الأوّل ، وبعضها لا يجوز كما يأتي ، فإن كان الاستشفاع على سبيل التّوسّل الجائز، فيجوز وإلّا فلا.(راجع:الموسوعة الفقهيّة ، "والتّوحيد الخالص" "والإيمانيات").

(ج) لا تجوز الاستعانة بالأموات أو النّداء لهم عند الكرب ؛ فإن النّداء أو الاستعانة إنّما تجوز إذا كان المستعان ممّن يَعْلَمُ المستعينَ ويقدر على إعانته ، إليه أشار قوله تعالٰى: ﴿إِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآئَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ﴾(الفاطر:١٤) ومن المعلوم أنّ الأموات لا علم لهم ولا قدرةَ على إعانة من يستعيذ ، فكيف تجوز الاستعانة بالأموات والنّداء لهم،كما لا تجوز الاستعانة أو النّداء بمثل "يا غوث أغثني" معتقدًا بأن اللّٰه منحهم القدرة على إعانة من يستعينه ، أو معتقدًا بأن هٰؤلاء شفعاؤنا عند اللّٰه ؛ فإن كُلًّا من هذين الاعتقادين باطل ، لم ينزل اللّٰه بهٖ من سلطان، ولم يأت به أثر، ولم يَتَبَنّه سلفنا الصّالح من الصّحابة والتّابعين والأئمّة المجتهدين والعلماء الرّبّانيّين، (۲) نعم في بعض الأحايين يصدر النّداء بـ"يا رسول اللّٰه !" أو باسم قريب من أقرباء المنادي ؛ و لكن لا على سبيل الاستعانة والاستمداد ؛ بل عن

(۱) روح المعاني:۲۹۷/۳، ط: دارالكتب العلميّة ، بيروت .

(۲) عندنا وعندنا مشائخنا –رحمهم اللّٰه تعالٰى– يجوز التّوسّل في الدّعوات بالأنبياء ...... في حياتهم وبعد وفاتهم . (المهنّد على المفنّد ،ص:۳۲، الجواب عن السّوال الرّابع).

طـريـق الـمـجاز كالتّحسّر و إظهار المحبّة وما إلى ذلك ، فمثل هٰذا النّداء ؛ لكونه خاليا عن المعتقدات الباطلة المزوّرة جائز ، وما صدرعن بعض العلماء والصّالحين من عباد اللّٰه فمن هٰذا القبيل ولكن الأحوط المنع مطلقًا لا سيّما في هٰذا العصر المملوء فِتَنًا ؛ فإنّه قلما يوجد من يفرّق هٰذا من ذلك .

(والمزيد من التّفصيل في: امداد الفتاوی، ص: ٣٤٤/ ٣٤١/ ٣٤٣/ ٣٦٧، من المجلّد الخامس ، ط: إدارة تأليفات أولياء ، ديوبند)

(د) ولكن النّداء بـ"يا رسول اللّٰه!" والاعتقاد بأنّه – عليه الصّلاة والسّلام – حاضر في كلّ مكان ، وناظرٌ لكلّ شيء لا يجوز أصلاً؛ فإنّ عقيدة كونه – عليه الصّلاة والسّلام – حاضرًا في كلّ مكان و ناظرًا لكلّ شيء عقيدة مُخْتَلَقَةٌ لم تتأيّد بالقرآن ولا بالسّنّة ، ولم يخترها الصّحابة والتّابعون و من إليهم من الأئمّة المجتهدين والعلماء والصّلحاء.(۱) فقط واللّٰه تعالٰى أعلم

كتبه الأحقر :زين الإسلام قاسمي الٰه آبادي مفتي دارالعلوم ديوبند ١٤٣٥/٨/١٢هـ

الجواب صحيح: وقار على غفر لہٗ، فخر الاسلام عفی عنه

مفتيان دارالعلوم ديوبند

---

(۱)

جواب کا ترجمہ:

(الف) جناب نبیٔ پاک ﷺ کی وفات کے بعد بھی آپ ﷺ کے وسیلے سے دعا کرنا جائز ہے۔

روح المعانی میں لفظِ ''جاہ'' کے متعلق لکھا ہے: کہ ''جاہ'' سے اللہ تعالیٰ کی ایک صفت مراد ہوتی ہے، مثلاً اس سے ایسی کامل ومکمل محبت مراد ہو جو مقتضی ہو اس بات کی کہ آپ ﷺ کی دعا رد نہ ہوگی اور اس کی بناء پر توقع ہو کہ شفاعت قبول ہوگی ؛ چناں چہ درج ذیل دعائیہ جملے:

إلٰهي ! أتوسّل بجاه نبيّك – صلّى اللّٰه عليه وسلّم – أن تقضي لي حاجتي . (اے اللہ! اپنے نبی محمد ﷺ کے طفیل میری فلاں ضرورت کی تکمیل فرمادیجئے ) کا مطلب یہ ہوگا کہ :　==

== إلٰهي ! اجعل محبّتك له وسيلةً في قضاء حاجتي . (اے اللہ! آپ نبیٔ کریم ﷺ سے اپنی محبت کو میری ضرورت پورا کرنے کا وسیلہ بنا لیجیے ) تو اس لحاظ سے مذکورہ بالا دعائیہ کلمات اور درج ذیل دعائیہ جملے ''إلٰهي ! أتوسّل بر حمتك أن تفعل كذا ''(اے اللہ! میں آپ کی رحمت کو وسیلہ بناتا ہوں کہ میری ضرورت پوری فرما دیجیے ) میں کوئی فرق نہیں رہا؛ اس لیے کہ اس طرح دعا کرنے کا مطلب بعینہٖ یہی ہے کہ ''إلٰهي ! اجعل رحمتك وسيلةً في كذا''(اے اللہ! اپنی رحمت کو اس کام کا وسیلہ بنا دیجیے )

اسی طرح نبی ﷺ کے علاوہ دوسرے شخص (ولی وغیرہ) کے وسیلے سے دعا کرنا جائز ہے بہ شرطیکہ جس شخص کا وسیلہ اختیار کیا جا رہا ہے، اسے اللہ تعالیٰ کے نزدیک تقرب حاصل ہو، مثلاً وہ شخص جس کی صلاح اور ولایت قطعی اور یقینی ہو (جو کہ ظاہری اعمال و احوال سے معلوم ہوگی؛ کیوں کہ اعمالِ صالحہ اور اتباعِ سنت پر استقامت کی وجہ سے تقرب خداوندی حاصل ہوتا ہے، پس اعمالِ صالحہ پر مداومت اور استقامت یقینی علامت ہوگی کہ یہ شخص مقرب الٰہی ہے )

رہا ایسا شخص جس کے احوال و اعمال سے اس کا مقرب خداوندی ہونا یقینی نہ معلوم ہو تو اس کے تقرب کا واسطہ دینا جائز نہیں؛ کیوں کہ اس میں ضمناً اللہ تعالیٰ پر ایسا حکم لگانا ہے جس کے تحقق کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہو رہا ہے ( کیوں کہ اس کے اعمال و احوال تقرب کے منافی ہیں، جب کہ اعمالِ صالحہ پر مداومت و استقامت ہی تقرب خداوندی کی علامت ہوتی ہے )۔

(ب) استشفاع بھی ایک قسم کا وسیلہ اور واسطہ اختیار کرنے کا نام ہے؛ کیوں کہ وسیلہ کی متعدد قسمیں ہیں، جن میں بعض جائز ہیں، جیسا کہ ابھی پہلے سوال کے جواب میں گذرا اور بعض ناجائز ہیں جیسا کہ آگے آ رہا ہے؛ لہٰذا استشفاع بالاموات اگر جائز وسیلہ کے طور پر ہو تو درست ہے ورنہ درست نہیں ہے۔

(ج) استعانت بالاموات اور بہ وقتِ مصیبت ان کو پکارنا ناجائز ہے؛ اس لیے کہ استعانت، استغاثہ اور نداء وغیرہ ایسی ذات سے ہوتا ہے کہ جو نہ صرف یہ کہ سائل اور مستعین کو جانتی ہو، بل کہ اس کی مدد پر بھی قادر ہو، اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ﴿اِنْ تَـدْعُـوْهُـمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآئَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ﴾

(سورۂ فاطر، آیت:۱۴) ==

== ترجمہ: اگر تم اُن کو پکارو بھی تو وہ تمہاری سنیں گے نہیں اور اگر سن بھی لیں تو تمہارا کہنا نہ کریں گے اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کرنے کی مخالفت کریں گے اور تجھ کو خبر رکھنے والے کے برابر کوئی نہیں بتلا وے گا۔ (بیان القرآن)

پس اموات سے استعانت حاصل کرنا یا انہیں مدد کے لیے پکارنا کیسے جائز ہوسکتا ہے، لہٰذا ''یا غوث أغثني'' جیسے احتیاج مندانہ جملوں کو بہ طور استعانت واستغاثہ استعمال کرنا ناجائز ہے، بالخصوص اس عقیدے کے ساتھ کہ انہیں اپنے فریادرسوں کی مدد کے واسطے اللہ کی جانب سے قدرت عطا کی گئی ہے، اور اس عقیدے کے ساتھ کہ وہ دربارِ خداوندی میں ہمارے سفارشی ہوں گے، ناجائز اور شرک ہے، یہ دونوں عقیدے باطل اور غلط ہیں، قرآن وسنت میں ان کی کوئی دلیل نہیں ہے، نیز صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین، فقہاء اور علماء اہل السنۃ والجماعۃ میں کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔

ہاں بعض اوقات اظہارِ افسوس یا اظہارِ محبت ومودّت کے طور پر ''یا رسول اللہ!'' یا اپنے کسی غائب رشتہ دار کا نام لے کر پکارا جاتا ہے؛ لیکن اس میں استعانت واستغاثہ کی نیت نہیں ہوتی؛ اس لیے یہاں بہ صیغہ ندا پکارنا جائز ہے؛ کیوں کہ یہ نداء غلط قسم کے مشرکانہ اعتقاد سے پاک ہے، بعض علماء وصلحاء سے اس تعلق سے جو کچھ منقول ہے وہ اسی قبیل سے ہے؛ لیکن! بہرصورت اس سے احتراز ہی مقتضائے احتیاط ہے، بالخصوص اس پُرفتن دور میں جب کہ اس دقیق ترین فرق کو سمجھنے والے خال خال ہی ہیں۔

لیکن ''یا رسول اللہ!'' کہنا اور آپ ﷺ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ آپ ﷺ ہر جگہ حاضر اور ہر چیز کو کفِ دست کی طرح دیکھتے ہیں، قطعاً جائز نہیں، یہ ایک اختراعی عقیدہ ہے، قرآن وسنت کی کوئی دلیل اس پر قائم نہیں ہے، نیز صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین عظامؒ، ائمہ مجتہدینؒ، فقہاءؒ، محدثینؒ، علماءؒ میں کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔

# بغیر آیات کے صرف قرآن کریم کا ترجمہ شائع کرنا

**سوال:** ﴿۸﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

قرآن کریم کی تفسیر اس طرح لکھنا کہ صرف آیاتِ کریمہ کا ترجمہ نقل کیا جائے، پھر اس کی تفسیر تحریر کی جائے کیسا ہے؟ بعض اہلِ فتاویٰ مثلاً دارالعلوم قادریہ عالیہ بدایوں اور حیدرآباد کے جامعہ نظامیہ کے دارالافتاء نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

اس سلسلے میں علمائے دیوبند کی رائے کیا ہے؟ براہِ کرم مدلل مفصل اور باحوالہ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

(مستفتیان): محمد سراج الہدیٰ ازہری، محمد شاہد نعمانی جاوید کوثر قاسمی

(۱۱۶۸/ د۱۴۳۵ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

آیاتِ قرآنیہ نقل کیے بغیر پورے قرآن مجید کا صرف ترجمہ لکھنا قطعاً درست نہیں ہے، یہود و نصاریٰ نے بھی توریت و انجیل کے ساتھ یہی کیا تھا، نتیجۃً اصل کتاب اور متن الٰہی ان کے ہاتھ سے ضائع ہوگیا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ''اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے'' (۱) نیز اس طرح کے ترجمہ کی اشاعت قرآن کریم سے بے اعتنائی کا سبب بن سکتی ہے؛ اسی بناء پر بہ اجماع امت اس فعل کو ممنوع قرار دیا گیا ہے (۲) چنانچہ جواہر الفقہ میں **النفحة القدسية** کے حوالہ سے

(۱) بوادر النّوادر: ۳۱۷/۱ . و هٰكذا في جواهر الفقه: ۱۲۵/۲ .

(۲) يمنع من كتابة القرآن بالفارسيّة بالإجماع ؛ لأنّه يؤدّي إلى الإخلال بحفظ القرآن ؛ لأنا أمرنا بحفظ النّظم والمعنٰى ، ولأنّه ربما يؤدّي إلى التّهاون كذا في التّجنيس والمزيد لصاحب الهداية . ==

فرماتے ہیں: **قدمنا حكاية الإجماع على منع كتابة القرآن العظيم بالفارسيّة وأنّه إنّما نصّ على الفارسيّة لإفادة المنع بغيرها بالطّريق الأولى؛ لأنّ غيرها ليس مثلها في الفصاحة.** (۱)اس سلسلے میں امدادالفتاویٰ میں ایک مدلل اور مفصل فتویٰ موجود ہے اسے ملاحظہ فرمائیں۔(۲)فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۷/۱۰/۱۴۳۵ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ، العبد محمد مصعب عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

== **و في معراج الدّراية : يمنع من كتابة المصحف بالفارسيّة أشدّ المنع وأنّه يكون عامده زنديقًا. (آكام النّفائس في أداء الأذكار بلسان الفارس،ص: ۵۱، في ضمن مجموعة رسائل اللّكنوي،ج : ٤ ، ط:باكستان)**

**(۱) جواهر الفقه: ۱۰۶/۲، ط: زكريا ديوبند .**

**(۲)** عدم جواز کتابت واشاعت ترجمہ قرآن مجید مجرد از قرآن :

سوال: ایک مولوی صاحب نے ایک کتاب دکھلائی جس میں محض ترجمہ تھا، کلام مجید یعنی عربی عبارت کہیں بھی نہ تھی؛ بلکہ انجیل کے ترجمہ وغیرہ کے مانند ایک گورکھپور کے وکیل نے مختلف تراجم قرآن سے اخذ کر کے لکھا ہے،اس پر مولوی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میں جناب والا کو لکھوں کہ اس مترجم پر جناب والا تکفیر کا فتویٰ لگادیں، میں نے عرض کیا کہ تکفیر کا فتویٰ لگانا تو کسی مسلمان پر تاوقتیکہ کوئی امر صریح مکفر نہ پایا جاوے مناسب نہیں، ہاں اس امر مذموم سے روکنا ضرور ہے، سو جناب والا سے گزارش ہے کہ اس امر کے متعلق کچھ ارشاد اور تحریر فرماویں۔

الجواب: نصوص صحیحہ سے تشبہ باہل الباطل خصوص غیر مسلم پھر خصوص اہل کتاب کی مذمت اور اس کا محل وعید ہونا ثابت ہے، **من تشبّه بقوم فهو منهم** میں وعید کا شدید ہونا ظاہر ہے کہ کفار کے ساتھ تشبہ کرنے کو کفار میں سے شمار ہونے کا موجب فرمایا گیا، دوسری حدیث: **لتركبنّ سنن من كان قبلكم الحديث** میں اس مماثلت کو موقع تشنیع میں ارشاد فرمایا گیا۔ ==

== (۱) اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے، ایسے امر میں جو عرفًا و عادۃً ان کے خصائص میں سے ہے، سواوّل تو ان کے ساتھ تشبہ ہی مذموم ہے۔

(۲) پھر خصوص جب وہ تشبہ امر متعلق بالدین میں ہو کہ تشبہ فی الامر الدنیاوی سے تشبہ فی الامر الدینی اشد ہے، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے گوشت شتر چھوڑنے پر آیت: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۰۸) نازل ہونا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تبتل اور ترہب کا انکار فرمانا اس کی کافی دلیل ہے۔ **مشکاۃ کتاب النکاح ، و کتاب الاعتصام لاتشدّدوا علٰی أنفسکم الحدیث** اور اس میں بھی خاص کر جب کہ اُن کو دیکھ کر اُن کی تقلید کی جاوے کہ اتفاقی تشبہ سے یہ اور بھی زیادہ مذموم ہے، اور اس وقت اکثر لوگ ایسے کام انہی لوگوں سے اخذ کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذات الانواط کی درخواست پر کیساز جر فرمایا تھا۔

یہ تشبہ مذکور خصوص قیدین مذکورین کے ساتھ تو اس میں مفسدہ حالیہ ہے، اور یہ بھی اس کے منع کے لیے کافی ہے، چہ جائے کہ اس میں اور مفاسد مآلیہ شدیدہ بھی متحقق ہیں۔

(۳) مثلاً خدانخواستہ اگر یہ طریق مروج ہوگیا تو مثل تورات وانجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہوجانے کا ہے، اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض اور اس کا اخلال حرام ہے، اور ترجمہ اور تفسیر کا اصل سے مجرد نہ ہونا مقدمہ اور سبب ہے حفاظت کا اور اصل سے مجرد ہونا مقدمہ اور سبب ہے اخلال کا اور فرض کا مقدمہ فرض اور حرام کا مقدمہ حرام ہے، اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ احتمال بعید ہے، محققانِ دین ومبصران اسلام سے ایسے احتمالات کا اعتبار ثابت ہے، پھر خواہ بعید ہو یا قریب ہم پر بھی واجب ہے کہ اس کا لحاظ کریں، حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے بعض قراء کی شہادت کے وقت بعد سرسری مناظرہ کے محض ضیاع قرآن کے احتمال کا اعتبار کر کے قرآن مجید کے جمع کا اہتمام ضروری قرار دیا تھا، حالاں کہ قرآن مجید اس وقت بھی متواتر تھا اور اُس کے ناقل اس کثرت سے موجود تھے کہ اس کے تواتر کا انقطاع احتمال بعید تھا، لیکن پھر بھی اس کا لحاظ کیا گیا پس جیسا اس وقت عدم کتابت میں احتمال ضیاع کا تھا، اسی طرح صرف ترجمہ کی کتابت میں اس کا احتمال ہے اور اس احتمال کے وقوع کا وہی نتیجہ ہوگا، جیسا کہ حدیث میں ہے: **أمتھوکون أنتم کما تھوکت الیھود والنّصاری.** (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سن کر ناگواری کے ساتھ) فرمایا: ==

== کیا تم لوگ حیرت میں گرفتار ہو جانے والے ہو، جیسے یہود و نصاریٰ (اپنے دینی اعتقادات اور مذہبی احکام میں) حیرانی اور پریشانی کا شکار ہو گئے)۔(مشکاة المصابیح،ص:۲۲)

(۴) اور مثلاً یہ مفسدہ ہوگا کہ حسب تصریح فقہاء اس ترجمہ کو بلا وضو مس کرنا جائز نہ ہوگا۔ **كما في الهندية، ولو كان القرآن مكتوبًا بالفارسية يكره لهم مسّه عند أبي حنيفةؒ وكذا عندهماؒ على الصّحيح هٰكذا في الخلاصة (۳۹/۱) وفيه أيضًا إذا قرأ آية السّجدة بالفارسية فعليه وعلى من سمعها السّجدة فهم السّامع أم لا إذا أخبر السّامع أنّه قرأ آية السّجدة (۸۵/۱) وهٰذه الجزئية الثّانية تؤيّد الأولٰى حيث وجب سجدة التّلاوة بقراءة القرآن بالفارسية، فعلم منه أنّ التّرجمة بالفارسية لا تخرج القرآن عن كونه قرآنًا حكمًا فلا يجوز مسّه للمحدث .**

اور یقینی بات ہے کہ عام ناس اس ترجمہ کو ایک کتاب خالی از قرآن سمجھ کر ہرگز اس کے مس کے لیے وضو کا انتظام نہ کریں گے، تو ایسا ترجمہ شائع کرنا سبب ہوگا ایک غیر مشروع کا، اور سبب غیر مشروع کا غیر مشروع ہے۔

(۵) اور مثلاً اس کا احترام بھی زیادہ نہ کریں گے، اور غیر قابل انتفاع ہو جانے کے وقت مثل دیگر معمولی کتب کے اوراق کے اس کے اوراق کا استعمال بھی کریں گے، تو اس سے یہ بھی ایک محذور لازم آئے گا اور محذور کا سبب لامحالہ محذور و محظور ہے۔

(٦) اور مثلاً آج تک امت میں کسی نے ایسا نہیں کیا، اور جو کسی نے ایسا کیا تو اس پر انکار کیا گیا، چناں چہ میں نے عبدالرحمٰن خاں صاحب مرحوم مالک مطبع نظامی سے سنا ہے کہ کسی نے لکھنؤ میں ایسا ہی ایک پارہ چھاپا تھا، مگر علماء نے اس کی اشاعت کی اجازت نہیں دی، تو اس شخص نے اس کے اوراق کو قرآن مجید کی دفتیوں میں چسپاں کرا کر پوشیدہ کر دیا، اور چناں چہ اس وقت بھی ایسے ترجمے غیر حامل متن پر علماء کو انکار ہے، چناں چہ اس جواب لکھنے سے قبل ایک مجمع علماء سے میں نے ذکر کیا تو ایک نے بھی اس میں نرمی نہیں فرمائی، بلکہ سب نے شدید انکار کیا، باوجودے کہ دوسری زبان والے مسلمانوں کو اس قسم کی حاجت بھی واقع ہوئی، جس حاجت کی بناء پر اب ایسا کیا گیا ہے؛ تو باوجود اس کے تمام امت کا انکار کرنا دلیل ہے اجماع کی، اس امر کے مذموم و منکر ہونے پر، جس میں یہ احادیث وارد ہیں۔

**إنّ اللّٰه لا يجمع أمّتي على الضّلالة، ويد اللّٰه على الجماعة، ومن شذّ شذّ في النّار، واتّبعوا السّواد الأعظم . (مشكاة شريف)** ==

== (ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر متفق نہیں کرے گا، اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہے، اور جو شخص جماعت سے الگ ہوا وہ (جنتیوں کی جماعت سے ) الگ کر کے دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ اور بڑی جماعت کی پیروی کرو)۔

(۷) اور مثلاً اب تو قرآن مجید سے کچھ علاقہ بھی ہے، اگر ترجمہ سے بھی مدد لیتے ہیں تو اصل بھی اُن کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اس بہانہ سے کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں، اور پھر تو قرآن سے بالکل ہی بے تعلق ہو جاویں گے اور بے ساختہ یہ آیت اُن پر صادق آنے لگے گی۔

﴿نَبَذَ فَرِيْقٌ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوْا الْكِتٰبَ كِتَابَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ كَاَنَّهُمْ لاَ يَعْلَمُوْنَ﴾

(سورۂ بقرہ، آیت:۱۰۱)

(ترجمہ: ان اہل کتاب میں کے ایک فریق نے خود اس کتاب اللہ ہی کو پس پشت ڈال دیا جیسے ان کو گویا اصلاً علم ہی نہیں)۔

(۸) اور مثلاً اگر ترجموں میں کچھ اختلاف ہے تو اصل بھی سامنے ہے، اس کو سب نسخوں میں متحد پاتے ہیں، تو اختلاف کا خیال اصل تک نہیں پہنچتا، اور جب ترجمے ہی ترجمے رہ جاویں گے، اور اصل نظروں سے غائب ہوگی، تو اس وقت یہ اختلاف کلام اللہ کی طرف منسوب ہوگا، بعد چندے یہ گمان ہونے لگے گا کہ اصل حکم ہی مختلف ہے، یہ تو اعتقاد پر اس کا اثر ہوگا، اور عمل پر یہ اثر ہوگا کہ ترجموں کو لے لے کر آپس میں لڑیں گے، اور مراجعت الی الاصل کی توفیق ہوگی نہیں، جو مدار ہو سکتا ہے فیصلہ کا، پس اس آیت کا مضمون ظاہر ہو جاوے گا

﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلاَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآئَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾

(سورۂ بقرہ، آیت:۲۱۳)

(ترجمہ: اور اس کتاب میں اختلاف اور کسی نے نہیں کیا، مگر صرف ان لوگوں نے جن کو وہ کتاب ملی تھی بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل واضحہ پہنچ چکے تھے باہمی ضد اضدی کی وجہ سے )۔

(۹) اور مثلاً اب تو ترجمہ کو مستقل کتاب نہیں سمجھتے، قرآن کا تابع سمجھتے ہیں، اگر کہیں مطلب نہیں سمجھتے ہیں یا غلط سمجھتے ہیں، یا فصاحت و بلاغت سے گرا ہوا پاتے ہیں تو فہم کا یا مترجم کا قصور سمجھتے ہیں اور مترجم کو مالک دین کا نہیں جانتے۔ ==

== نیز کسی مترجم کو ہمت تحریفِ معنوی کی بھی نہیں ہوسکتی، کہ اصل کے سامنے ہونے سے ہر طالب علم اس پر گرفت کر سکے گا۔ اور ایسا ترجمہ اگر ہوا تو اس کو مستقل کتاب سمجھیں گے، کسی کا تابع نہ سمجھیں گے، اور تمام آثار مذکورہ کی ضد واقع ہوں گی۔

(۱۰) خصوص مترجمین ہی کا مطبوع مستقل ہوجانا یہ سب سے بڑھ کر آفت ہوگی، اور اہلِ زیغ کو بہت آسانی سے موقع غلط ترجمہ اور تفسیر کا ملے گا؛ کیوں کہ ہر دیکھنے والا حافظ نہیں، اور مراجعت اصل کی طرف ہر وقت آسان نہیں ہوتی۔ کما قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿اتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (سورۂ توبہ، آیت:۳۱) (ترجمہ: انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو رب بنا رکھا ہے) اور پھر اسی طرح کے اور بھی بہت سے مفاسد ہیں، جن کو ان شاءاللہ تعالیٰ علماء ظاہر کر دیں گے؛ اسی لیے جا بہ جا لفظ مثلاً لایا گیا ہے، اس وقت دس ہی وجوہ پر جس کو عشرۃ کاملہ کہا جاسکتا ہے، اکتفاء کیا جاسکتا ہے، مگر کاملہ کا خاتمہ ہونا لازم نہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (سورۂ مائدہ، آیت:۲) (ترجمہ: اور گناہ وزیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو) اور فقہاء نے اسی قاعدہ پر یہاں تک تفریع فرمائی ہے، کہ جس شخص کو بھیک مانگنا حرام ہے اس کو بھیک دینا بھی حرام ہے، کیوں کہ دینے والے دیں نہیں، تو مانگنے والا مانگنا چھوڑ دے، اسی طرح اس ترجمہ کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ بہ قیمت لے اور نہ بلا قیمت، تو پھر ایسے تراجم کا سلسلہ بند ہوجاوے اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا، پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی، اس لیے یہ بھی ناجائز ہے۔ (امداد الفتاویٰ:۴/ ۳۹-۴۲-سوال نمبر:۸)

## وساوس کا علاج

**سوال:** ﴿۹﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

تین سال سے مجھ کو وسوسہ / سرگوشی کی پریشانی ہے اور اب میں تقریباً اپنا ایمان کھو چکا ہوں، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ علاج کو اپنایا؛ لیکن بہت تاخیر ہو چکی ہے، اب واحد راستہ جو بچا ہے وہ یہ ہے کہ میں اللہ سے براہِ راست کسی نشانی کی درخواست کروں تا کہ مجھ کو یقین آ جائے، میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں، براہِ کرم مجھ کو بتائیں کہ اللہ سے اس کے لیے کیسے مانگیں؟ میرے بہت سارے دوستوں نے ایک فورم (عام مباحثہ کی جگہ) پر کہا کہ انہوں نے بھی اپنا ایمان شک کے بعد کھو دیا ہے اس کے بعد انہوں نے دوبارہ مذہب کو تلاش کیا اور اللہ سے نشانی کے لیے دعا کی اور اللہ نے ان کو نشانی عطا کی، میں نے بہت سارے مفتیانِ کرام سے معلوم کیا، تو انہوں نے کہا کہ آپ اس کے لیے دعا کر سکتے ہیں۔ براہِ کرم مجھ کو صرف یہ جواب نہ دیں کہ اللہ سے دعا کرو کہ میرا ایمان مضبوط ہو جائے؛ کیوں کہ مجھ کو معلوم ہے یہ میرے اوپر اثر نہیں کرے گا، میں نے پڑھا ہے کہ امام غزالی نے اس کے بارے میں مانگنے کو کہا ہے۔ میں اس کو ایک مستند شخص سے پوچھنا چاہتا ہوں، براہِ کرم جواب دیں۔　　　والسلام

۹۳۶/د ۱۴۳۵ھ

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق:**

یہ فیصلہ آپ نے کیسے کرلیا کہ آپ ایمان تقریباً کھو چکے ہیں؟ اگر کوئی مریض کسی تکلیف یا پریشانی کی بنا پر اس مرض کے لاعلاج ہونے کا یقین جمالے، تو مریض کا یہ یقین جمانا درست ہوگا؟ یا اسے اس مرض کے ماہر معالج کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں معالج کی رائے معتبر ہوگی؟ جس طرح ظاہری امراض ہیں جو اعضاءِ جسم کو لاحق ہوتے ہیں، اسی طرح باطنی امراض (اُنہیں میں سے وساوس، شک، وہم وغیرہ امور ہیں) قلب کو لاحق ہوتے ہیں، کسی شیخ کامل پر اعتماد کر کے اس سے اپنی پریشانی ذکر کرنا چاہیے اور اُس کی بتائی ہوئی تدابیر پر عمل پیرا ہونا چاہیے، ورنہ وساوس اور

شک کا مرض بجلی کے کرنٹ کی طرح جتنا اُسے چھڑایا جائے، اُتنا ہی بدن کو چپکتا رہے گا، کتاب میں دیکھ کر خود سے علاج کرنے میں ایک بیماری سے دوسری بڑی بیماری پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے، نیز اصل مرض اور پرانا ہو کر جڑ پکڑ لیتا ہے۔

حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی اس طرح کی باتیں پیش آئیں، انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اپنی پریشانی ذکر کی، آپ ﷺ نے انہیں علاج بتلایا، ذیل میں ہم اس طرح کی چند حدیثیں پیش کرتے ہیں:

ا-: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ چند صحابہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہم لوگ اپنے دل میں (ایسے برے برے) خیالات پاتے ہیں کہ اُن کا زبان پر لانا ہمارے لیے بہت بھاری ہے (یعنی ہم انہیں زبان سے کہہ نہیں سکتے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کیا واقعی تم اپنے دل میں ایسا پاتے ہو؟ صحابہ نے کہا ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تو صاف ایمان کی علامت ہے۔(۱)

۲-: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لوگ ایک دوسرے سے طرح طرح کی باتیں پوچھیں گے، یہاں تک کہ کوئی یہ سوال بھی کر ڈالے گا کہ ساری مخلوق کو تو اللہ نے پیدا کیا، اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر اس طرح کی بات کسی کی زبان پر یا ایسا خیال کسی کے دل میں آئے، تو اسے کہنا چاہیے **آمنت باللّٰہ** یعنی میں اللہ پر ایمان لایا، بس یہ کہہ کر وساوس کے دروازے کو بند کر دینا چاہیے۔(۲)

---

**(۱) عن أبي هريرة رضي اللّٰه تعالىٰ عنه قال: جاء ناس مِن أصحاب رسول اللّٰه – صلّى اللّٰه عليه وسلّم– إلى النّبيّ – صلّى اللّٰه عليه وسلّم– فسألوه : إنّا نجد في أنفسنا ما يتعاظم أحدنا أن يتكلّم به ، قال أو قد وجدتموه ؟ قالوا نعم ، قال ذاك صريح الإيمان .**

**(رواه مسلم، رقم: ۱۳۲، باب بيان الوسوسة في الإيمان)**

**(۲) وعن أبي هريرة رضي اللّٰه تعالىٰ عنه قال قال رسول اللّٰه – صلّى اللّٰه عليه وسلّم – لا يزال النّاس يتساء لون حتّى يقال : هٰذا خلق اللّٰه الخلق، فمن خلق اللّٰه ؟ فمن وجد من ذٰلك شيئًا فليقل آمنت باللّٰه . (أخرجه مسلم ، رقم: ١٣٤، الباب السّابق)**

۳-: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میں اپنے دل میں ایسی بات پاتا ہوں کہ میں جل کر کوئلہ ہوجاؤں مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ وہ بات زبان پر لاؤں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے تمہارا معاملہ صرف وسوسہ تک رکھا۔(۱)

۴-: قاسم بن محمدؒ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ان سے شکایت کی کہ میں نماز کی حالت میں دل میں طرح طرح کے خیالات پاتا ہوں اور وہ بڑھتے ہی رہتے ہیں، حضرت قاسمؒ نے فرمایا کہ اسی طرح اپنی نماز پوری کرلو؛ کیوں کہ یہ خیالات تم سے دور نہیں ہوں گے، حتی کہ تم نماز سے فارغ ہوگے اور کہو گے کہ میں نے ٹھیک سے نماز نہیں پڑھی۔(۲)

دعا یقیناً بہت فائدے کی چیز ہے؛ لیکن تدبیر کے موقع پر تدبیر اختیار کرنے کے ساتھ دعا کرنے کا حکم ہے مثلاً بیماری میں ڈاکٹر سے دوا بھی لو اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کرو، اسی طرح امراض قلبی میں شیخ کامل سے حالات ذکر کر کے علاج کی تدبیر اختیار کرو اور دعا بھی کرو، اللہ تعالیٰ سے کسی خاص قسم کی فرمائش کرنا یا شرط لگانا ہم جیسے کمزور بندوں کے لیے بالکل مناسب نہیں؛ لہٰذا نشانی کی فرمائش کرنا اور اس کے انتظار میں رہنا عبدیت کے خلاف ہے، پھر اس میں کبھی اور بھی نقصانات پیش آسکتے ہیں، اور مرض خطرناک حد تک لاعلاج ہوسکتا ہے، کلمہ طیبہ اور استغفار کی کثرت کریں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

---

(۱) عن ابن عبّاس رضي اللّٰه تعالی عنه أنّ النّبيّ – صلّی اللّٰه علیه وسلّم – جاء ہ رجل فقال: إنّي أحدث نفسي بالشّیٴ، لأن أکون حُمَمَةً أحبّ إليّ من أن أتکلّم به، قال: الحمد للّٰه الّذي ردّ أمرہ إلی الوسوسة.

(مشکاة المصابیح، ص: ۱۹، ط: یاسر ندیم دیوبند)

(۲) عن القاسم بن محمّد أنّ رجلاً سأله فقال: إنّي لأهم في صلاتي فیکثر ذلك عليّ، فقال له امض في صلاتك؛ فإنّه لن یذهب ذلك عنك حتّی تنصرف وأنت تقول: ما أتممت صلاتي.

(موطأ للإمام مالك، رقم: ۳۲، باب العمل في السّهو)

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/۷/۱۴۳۵ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفرلہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## عذابِ قبر کا ثبوت اور اس سے متعلق دیگر سوالات

محترم حضرات مفتیانِ کرام وفقہائے عظام　　دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

**سوال:** ﴿۱۰﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

عرض یہ ہے کہ آج کل کچھ لوگ چند شبہات کی بناء پر عذابِ قبر کا انکار کرنے لگے ہیں:

(۱) عذابِ قبر قرآن کی کسی آیت سے ثابت نہیں۔

(۲) جو آیات بہ طور ثبوت پیش کی جاتی ہیں، وہ صریح نہیں ہیں۔

(۳) جہاں تک احادیثِ نبویہ کی بات ہے، تو ایک تو احادیثِ نبویہ عہدِ رسالت کے تین سو سال بعد جمع کی گئیں، جن میں موضوع احادیث بھی شامل ہیں۔ دوسرے احادیثِ نبویہ میں لوگوں نے اپنی اپنی رائیں داخل کر دیں؛ لہٰذا ہم تو وہ مانیں گے، ہمارا عقیدہ وہ ہوگا جس کو قرآن صاف لفظوں میں بیان کر رہا ہے، اور قرآن نے صاف لفظوں میں نمبر:۱- قبر کو ''مرقد'' یعنی آرام گاہ کہا ﴿مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا﴾ (سورۂ یٰسین، آیت:۵۲) اگر عذابِ قبر مان لیا جائے تو قبر آرام گاہ کہاں رہی؟ نمبر:۲- ﴿فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا﴾ (سورۂ انبیاء، آیت:۴۷) جیسی آیات بے شمار اس بات کے لیے بالکل صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں انصاف ہے، ظلم کا نام ونشان تک نہیں، پھر اگر عذابِ قبر کو مان لیں تو جو شخص دو ہزار سال پہلے مرا اس کو دو ہزار سال سے عذابِ قبر ہو رہا ہے، اور جو آج مرا اُس کو آج سے ہوگا، تو پہلے مرنے والے کو زیادہ عذاب ہوگا؛ لہٰذا یہ تو ظلم ہوا، انصاف کہاں رہا؟ (العیاذ باللہ العظیم)

اور پھر جو شخص ڈوب کر یا جل کر یا کسی درندہ کے پیٹ میں جا کر مرا تو اس کو عذابِ قبر کے کیا معنیٰ؟

ایسے منکرینِ عذابِ قبر کی تشکیکات سے امت کے بہت سے سیدھے سادھے دین دار لوگ بہت پریشان ہیں، دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کا جواب ان کی تسلی وتشفی کا کام دے گا؛ لہٰذا عذابِ قبر کا ثبوت واضح طور پر پیش فرما کر نمبر:۱-منکر عذابِ قبر کا حکم، نمبر:۲-منکر عذابِ قبر سے میل جول رکھنے والے کا حکم نمبر:۳-اس کی تشکیکات پر ہاں میں ہاں ملانے والے کا حکم، نمبر:۴-احادیثِ نبویہ کے بارے میں مذکورہ خیال رکھنے والے کا حکم تفصیلی طور پر تحریر فرما کرامت کی صحیح راہ نمائی فرمائیں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مستفتی: محمد نعمان قاسمی

خادم مدرسہ دارارقم، سہارن پور، یوپی، ۲۷/۰ ۱۴۳۴ھ

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التّوفیق :

عذابِ قبر کا ثبوت قرآن پاک کی آیات سے اجمالاً اور احادیث مبارکہ سے تفصیلاً ہے، جو لوگ صرف قرآنِ کریم کو حجت مانتے ہیں، احادیث کو حجت نہیں مانتے وہ در پردہ اکثر ضروریاتِ دین کا انکار کرتے ہیں(۱)؛ اس لیے کہ قرآنِ کریم میں ہر چیز کا بیان اجمالاً ہے، جس کی تشریح اور تفصیل

(۱) یہ کہنا غلط اور بے بنیاد ہے کہ احادیث تین سو سال بعد جمع کی گئی ہیں، کیوں کہ احادیث کو آنحضرت ﷺ کے زمانہ ہی میں صحابۂ کرام نے ذہنوں میں محفوظ کر لیا تھا، آپ ﷺ کی زندگی میں اسے بیان کرنے کی ضرورت کم پڑی؛ لیکن آپ ﷺ کے وصال کے بعد صحابۂ کرام حدیثوں کو سننے سنانے اور بیان کرنے کا معمول رکھتے تھے، جو اُن کے خداداد حافظہ میں محفوظ تھیں اور بعض صحابہ کرام نے اپنے طور پر لکھ کر بھی محفوظ کیا تھا۔

پھر تابعین کے دور میں زبانی اور تحریری دونوں طرح حدیثوں کو محفوظ کرنے کا رواج ہوا، حتیٰ کہ احادیث کے بہت سے مجموعے تیار ہوئے اور پہلی صدی کے اختتام پر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ (ولادت ۶۱ھ یا ۶۳ھ وفات: رجب المرجب ۱۰۱ھ) نے باقاعدہ حدیثوں کو تحریری طور پر محفوظ کرنے کی ہدایت جاری کی اور یہ کام صحیح قول کے مطابق ابن شہاب زہریؒ (م:۱۲۴ھ) کے ذریعہ ہوا، پھر حضرت ربیع بن صبیح (م:۱۶۰ھ) اور سعید بن ابی عروبہ (م:۱۵۶ھ) اور دیگر حضرات کا مجموعہ منظر عام پر آیا، اسی دور میں مؤطا امام مالک اور مؤطا امام محمد وغیرہ منظر عام پر آئیں۔ ==

حدیث میں ہے۔(۱) نمازوں کے اوقاتِ خمسہ، تعدادِ رکعات، فرائض اور واجبات کی تفاصیل، صوم و زکاۃ کے مفصل احکام، حج کے مناسک، قربانی وغیرہ، بیع وشراء، امورِ خانہ داری اور معاشرت کے قوانین ان سب کی تفصیل حدیث ہی سے ثابت ہے، جو شخص احادیث کو مانتا ہی نہیں وہ عذابِ قبر ہی کیا، مذکورہ بالا تمام چیزوں کا منکر ہے، ایسا شخص ہمارے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہے،(۲) اُن سے ایک جزوی چیز میں بحث کر کے کوئی فائدہ نہیں، رہا عذابِ قبر تو یہ برحق ہے، تمام اہلِ سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے، ''فقہ اکبر'' میں ہے: **وسوال منكر و نكير حقّ كائن في القبر، وإعادة الرّوح إلى الجسد في قبرہ حقّ، وضغطة القبر وعذابه حقّ**(۳) **وفي الانتصار: ثـمّ أيـضًـا فأهل السّنّة لم يختلفوا في أنّ القرآن كلام الله وأنّه غير مخلوق وأنّ الله يُرى في الدّار الآخرة و أنّ عذاب القبر حقّ.** (۴)

لہٰذا جو شخص عذابِ قبر کا انکار کرے گا وہ ضال ومضل ہے، اہلِ سنت والجماعت سے خارج ہے۔ حضرات متکلمین نے قرآن کریم کی کئی آیتوں مثلاً: ﴿النَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا﴾ (سورۂ غافر، آیت: ۴۶) ﴿سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ﴾ (سورۂ توبہ، آیت: ۱۰۱) ﴿وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا

== لہٰذا یہ کہنا کہ حدیثیں عہدِ رسالت کے تین سو سال بعد جمع ہوئیں، علم حدیث کی تاریخ سے ناواقفیت اور جہالت پر مبنی ہے۔ پھر جو موضوع حدیثیں نادان دوستوں یا شاطر دشمنوں کے ذریعہ رائج کی گئیں، محدثین نے فن جرح وتعدیل کے ذریعہ دودھ اور پانی بالکل الگ کر دیا، ایسی روایات مستدل نہیں بنتیں۔ (ماخوذ از ''اوجز المسالک''۔ ص: ۶۵-۷۲، **الفائدة الرّابعة في بدء كتابة الحديث و كيفية تدوينه، ط: مركز شيخ أبي الحسن النّدوي، أعظم جراه**)

**(۱) إنّ كتـاب الـلّـه أبهـم هذا، وإنّ السّنّة تُفَسِّرُ ذلك. (جامع بيان العلم وفضله لابن عبد البرّ: ۲/۱۱۹۲، باب موضع السّنّة من الكتاب وبيَانها له، ط: دار ابن الجوزي، السّعودية)**

**(۲) ومَن أنكرَ المتواترَ فقد كفر. (الفتاوىٰ الهندية: ۲/۲۶۵، كتاب السّير، الباب التّاسع في أحكام المرتدّين)**

**(۳) الفقه الأكبر، ص: ۶۵، ط: مكتبة الفرقان، الإمارات العربية.**

**(۴) الانتصار لأهل السّنّة والحديث في ردّ أباطيل حسن المالكي، ص: ۱۹۲، ط: دار الفضيلة الرّياض.**

عَـذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ (سورۂ طور، آیت:۴۷) سے عذابِ قبر پر استدلال کیا، ان آیتوں کے بارے میں مشہور ائمۂ تفسیر مجاہدؒ، مقاتل، قرطبی، بغوی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ یہاں عذابِ قبر مراد ہے۔ (تفسیر قرطبی(۱) تفسیر بغوی(۲)) اسی طرح بخاری، مسلم، ترمذی اور دیگر بہت سی کتابوں میں عذابِ قبر سے متعلق بے شمار احادیث ہیں(۳) خود حضورِ اکرم ﷺ کی دعاؤں میں اللّٰھمّ إنّي أعوذ بك من عذاب القبر (۴) یعنی عذابِ قبر سے پناہ مانگنا بھی شامل تھا۔ جہاں تک آیت: ﴿قَالُوْا يَا وَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا، هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ (سورۂ یٰسین، آیت:۵۲) کی بات ہے، تو ''قبر'' کو ''مرقد'' سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ میدانِ حشر کی ہولناکی کو دیکھ کر لوگ عذابِ قبر کو کالعدم سمجھیں گے اور ان کو یہ احساس ہوگا کہ اس سے پہلے ہم آرام میں تھے، یعنی یہ آیتِ کریمہ ان کے خیال و گمان کی ترجمانی کر رہی ہے(۵) اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ

(۱) راجع تفسير القرطبي: ۳۱۹/۱۵، ط: دار الكتب المصرية، القاهرة.

(۲) راجع معالم التّنزيل في تفسير القرآن: ۳۸۳/۲، ط:دار إحياء التّراث العربي، بيروت.

(۳) (الف): عن موسٰى ابن عقبة، قال: حدّثني ابنة خالد بن سعد بن العاص أنّها سمعت النّبيّ – صلّى الله عليه وسلّم وهو يتعوّذ مِن عذابِ القبر. (صحيح البخاري، باب التّعوّذ مِن عذاب القبر: ۱۸٤/۱، رقم: ۱۳۷٦)

وفي حديث طويل قالت عائشة: ''فسمعتُ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم بَعدُ يستعيذ من عذاب القبر''.

(أخرجه مسلم، باب استحباب التّعوّذ مِن عذاب القبر: ۲۱۷/۱، رقم: ۵۸٤)

(ب): عن أبي هريرة – رضي الله عنه – قال: قال رسول الله – صلّى الله عليه وسلّم –: ''استعيذوا بالله مِن عذاب جهنّم، واستعيذوا بالله مِن عذاب القبر'' ………… هٰذا حديث صحيح. (سنن التّرمذي، رقم: ۳٦۰٤، أبواب الدّعوات، باب ما جاء أنّ لله ملائكة سيّاحين في الأرض)

(۴) انظر: صحيح البخاري: ۱/۱۶۶، رقم: ۸۳۲، باب الدّعاء قبل السّلام، ''والصّحيح لمسلم: ۲۱۷/۱''، رقم: ۵۸۹، باب ما استعاذ منه في الصّلاة.

(۵) مستفاد: معارف القرآن: ۴۰۳/۷، ط: نعيمية ديوبند.

''مرقد'' یہاں پر بین النّفختین کے زمانے سے متعلق آیا ہے،اور وہ زمانہ عذاب کا نہیں ہے۔(۱)

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ احادیث میں لفظ''قبر'' جو آیا ہے اس سے مراد مٹی کا گڑھا نہیں ہے؛ بل کہ''قبر'' سے مراد عالمِ برزخ ہے، جو شخص بھی مرتا ہے، وہ عالمِ برزخ میں پہنچ جاتا ہے، چاہے اسے معروف طریقے پر دفن کیا جائے یا نہ کیا جائے۔(۲)

لہٰذا یہ اعتراض درست نہیں کہ جس شخص کو دفن نہ کیا جائے جیسے کسی کو درندہ کھالے یا پانی میں غرق ہو جائے، یا جل کر راکھ ہو جائے، تو اسے عذابِ قبر کیسے ہوگا؟ رہی ظلم کی بات تو یہ کوئی اشکال ہی نہیں؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے، وہ اپنے احکام اور تشریعات کی مصلحتیں خوب جانتا ہے، اس کی ٹوہ میں پڑنا ایک مومن کے لیے ہرگز مناسب نہیں، وہ ایک مدت کے بعد عذاب موقوف کرسکتا ہے، نیز کیفیت میں فرق بھی کرسکتا ہے۔(۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہٰ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۵/۲/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیانِ دارالعلوم دیوبند

## عذابِ قبر قرآن وحدیث کی روشنی میں

**سوال:** ﴿۱۱﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین درج ذیل مسئلہ میں:

**صورتِ اولیٰ:**

ہمارے علاقہ میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عذابِ قبر قرآن سے ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا اس کے

(۱) قوله: عزّ وجلّ: ﴿قَالُوْا يَا وَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا﴾ قال قتادة: هي النّومة بين النّفختين لا يَفْتر عنهم عذاب القبر إلّا فيها. (تفسير الماوردي: ۵/۲۳، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

(۲) رحمة اللّٰه الواسعة: ۱/۳۸۱، مبحث دوم، باب سوم، ط: مكتبة حجاز، ديوبند.

(۳) ...... والسّؤال فيما يستقر فيه الميّت حتّى لو أكله سبع، فالسّؤال في بطنه إلخ. (حاشية الطّحطاوي على المراقي، ص: ۵۶۱، كتاب الصّلاة، باب أحكام الجنائز، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

متعلق کوئی بیان نہیں کیا جا سکتا، رہی یہ بات کہ عذابِ قبر احادیث سے ثابت ہے، ہم احادیث سے ثبوت کا کوئی اعتبار نہیں کرتے ہیں، احادیث میں کذب کے احتمال ہونے کی وجہ سے۔

اُن لوگوں کے بارے میں مفتیانِ کرام کیا فرماتے ہیں کہ کافر ہیں یا فاسق؟ مفصل و مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

صورتِ ثانیہ:

جب سائنس والے اپنی کوششوں اور محنتوں سے کوئی نئی چیز ایجاد کرتے ہیں تو کچھ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ اس کا ثبوت قرآن واحادیث سے ملتا ہے اور کہتے ہیں کہ جو لوگ اپنے آپ کو وارث الانبیاء ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ کوئی نئی چیز ایجاد نہیں کر سکتے ہیں، صرف فقہ، اجماع، قیاس کو ثابت کر رہے ہیں، جس سے دین کا بہت بڑا نقصان ہوتا ہے، تو ان لوگوں کے بارے میں مفتیانِ کرام کیا فرماتے ہیں کہ فاسق ہیں یا کافر؟ مفصل و مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

مستفتی: عبدالحلیم (۲۶۲/ د ۱۴۳۶ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التّوفیق:

(۱) مرنے اور دفن ہونے کے بعد قبر میں انسان کا فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا مرتب ہونا، قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ستّر احادیث میں بڑی صراحت کے ساتھ موجود ہے، جن میں سے چار آیات کو امام بخاریؒ نے اپنی ''صحیح'' میں ذکر کیا ہے(۱) اور حافظ ابن حجرؒ نے اس کی شرح فتح الباری

(۱) بـاب مـا جـاء في عذاب القبر وقوله تعالیٰ: ''إذ الظّالمون في غمرات الموت والملائكة باسطوا أيديهم أخرجوا أنفسكم اليوم تجزون عذاب الهون قال أبو عبد اللّٰه: الهون هو الهوان، والهون الرفق، وقوله جلّ ذكره ''سنعذّبهم مرّتين ثمّ يردّون إلى عذاب عظيم'' وقوله تعالیٰ: ''وحاق بآل فرعون سوء العذاب، النّار يعرضون عليها غدوًّا وعشيًّا'' إلخ ............
وحدّثنا شعبة بهٰذا، وزاد ''يثبت اللّٰه الّذين آمنوا'' نزلت في عذاب القبر.
(بخاري مع الفتح: ۲/۹۷-۹۸، كتاب الجنائز، ط: بيروت)

میں اس سلسلے میں حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مزید اقوال وآثار نقل کیے ہیں، تفصیل کے لیے دیکھئے: (فتح الباري: ۳/۱۸۰-۱۸۱، کتاب الجنائز، باب ما جاء في عذاب القبر ) عذابِ قبر کے سلسلے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں وہ حدّ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں، چنانچہ چالیس صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے معتبر اسانید کے ساتھ اس مضمون کی حدیثیں منقول ہیں، جنہیں ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں (۱) اور حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے ''شرح الصدور'' میں ذکر کیا ہے (۲) علامہ ابن قیم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: فأمّا أحاديث عذاب القبر، ومسألة منكر نكير فكثيرة متواترة عن النبيّ صلّى الله عليه وسلّم (۳) وهٰكذا قال شيخ الإسلام ابن تيمية في فتاواه (۴) اسی طرح شرح العقيدة الطّحاوية میں ہے: وقد تواترت الأخبار عن رسول الله – صلّى الله عليه وسلّم – في ثبوت عذاب القبر ونعيمه لمن كان أهلا إلخ (۵)

الغرض عذابِ قبر کا ثبوت قرآنِ کریم کی بہت سی آیات میں اشارۃً اور بہت سی احادیث میں صراحۃً موجود ہے، اور یہ کہنا کہ قرآنِ کریم سے عذابِ قبر کا ثبوت نہیں ہے، لاعلمی اور جہالت پر مبنی ہے؛ کیوں کہ حضرات اصولیین نے ثبوت کے چار طریقے ذکر کیے ہیں:

(۱) عبارۃ النّص (۶)　　(۲) اشارۃ النص (۷)

(۱) تفسير ابن كثير: ۳/۶۷۴–۶۸۵، سورۂ ابراهيم، ط: زكريا ديوبند .
(۲) شرح الصّدور بشرح حال الموتى والقبور: ۱/۱۲۱–۱۴۳، ط: دارالمعرفة لبنان .
(۳) كتاب الرّوح لابن القيّم، ص: ۸۲، ط: بيروت .
(۴) مجموع الفتاوى لابن تيمية: ۴/۲۸۵، ط: دمشق .
(۵) شرح العقيدة الطّحاوية، ص: ۴۵۰ .
(۶) عبارة النّصّ : کلام کے وہ معنی ومفہوم جس کے لیے کلام کو لایا گیا ہو۔
(۷) اشارة النّصّ : کلام کے وہ معنی جو لفظ سے از روئے لغت معمولی غور وفکر کے بعد سمجھے جائیں؛ لیکن اس کے لیے کلام لایا نہ گیا ہو۔

(۳) دلالۃ النص (۱) (۴) اقتضاء النص (۲) اور عذابِ قبر کا ثبوت قرآن کریم میں اگرچہ عبارۃ النص کے طریقے پر نہیں ہے؛ لیکن تقریباً دس آیات میں ''اشارۃ النص'' کے طریقے پر موجود ہے اور عبارۃ النص کی طرح اشارۃ النص بھی قطعی ہوتا ہے، جو ثبوت کے لیے کافی ہے، نیز احادیث متواترہ سے اس کا ثبوت ہے، جیسا کہ ذکر کیا گیا، پھر یہ کہ عقائد و مسائل جس طرح کتاب اللہ سے ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح سنت رسول اللہ، اجماعِ امت اور قیاس سے بھی ثابت ہوتے ہیں؛ اس لیے کسی حکم شرعی کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ صرف حدیث سے ثابت ہے، قرآن سے نہیں؛ اس لیے ہم نہیں مانتے، بڑی نادانی اور جہالت کی بات ہے؛ لہٰذا بر تقدیر صحت واقعہ ایسا شخص (عذابِ قبر کا منکر) ضال و مضل، انتہائی درجہ کا فاسق اور اہلِ سنت والجماعت کے طریقے سے منحرف ہے۔ **قال الإمام أحمد بن حنبل: عذاب القبر حقّ لا ينكره إلّا ضال مضلّ** (۳) **وقال بدر الدّين العيني في عمدة القاري: فيه إثبات عذاب القبر، وهو مذهب أهل السّنّة والجماعة.** (۴)

(۲) آپ نے تحریر کیا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وارث الانبیاء کا دعوی کرنے والے کوئی نئی چیز ایجاد نہیں کر سکتے، اس جملے میں ''نئی چیز ایجاد نہیں کر سکتے'' سے معلوم نہیں کیا مراد ہے؟ دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کرنا یا کوئی دنیوی چیز ایجاد کرنا، بہر حال اگر دین میں نئی چیز ایجاد کرنا مراد ہے تو یہ خود مذموم اور بدعت ہے، حدیث شریف میں ہے: **مَن أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو ردّ، أخرجه ابن ماجة** (۵) اور اگر سائنس دانوں کی طرح سائنسی ایجادات و تخلیقات مراد ہوں تو یہ علمائے کرام کا میدان نہیں ہے، **لكلّ فن رجال.**

---

(۱) **دلالة النّصّ:** وہ معنی جو عبارت میں مذکور نہ ہوں؛ مگر علت کی وجہ سے سمجھ میں آجائیں۔

(۲) **اقتضاء النّصّ:** نص میں ایسی زیادتی جس کے بغیر نص کے معنی پورے طور پر نہ سمجھ میں آئیں۔

(۳) **كتاب الرّوح لابن القيّم، ص: ۹۰، ط: بيروت.**

(۴) **عمدة القاري: ۹۸/۲، ط: دار إحياء التّراث العربي، بيروت.**

(۵) **ابن ماجة، رقم: ۱۴، باب تعظيم حديث رسول الله صلّى الله عليه وسلّم والتّغليظ عليه.**

(۳): صرف فقہ، اجماع اور قیاس کو ثابت کرنے سے دین کا کیا نقصان ہو رہا ہے؟ یہ تو احکامِ دین کی بنیادیں ہیں، کتاب وسنت، اجماع وقیاس انہیں دلائل اربعہ کی روشنی میں ہر زمانے میں نئے پیش آمدہ مسائل کا حل نکالا جاتا ہے، انہیں کسوٹی پر رکھ کر صحیح وغلط، حق وباطل، عقائد واحکام اور کھرے کھوٹے افکار ونظریات کی شناخت ہوتی ہے، ورنہ اباحیت اور تجدد پسندی کے اس دور میں نہ جانے کتنی غلط چیزوں اور بدعات ورسومات کو دین کا جز وقرار دے دیا جائے، پھر وہ لوگ کس بنیاد پر اسے غیر ضروری سمجھ رہے ہیں؟ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۸/۳/۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## غیر عربی زبان میں قرآن کریم لکھنا یا اس میں دیکھ کر پڑھنا کیسا ہے؟

سوال: ﴿۱۲﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں:

میں رمضان المبارک میں رومن اسکرپٹ جیسے:...... Alhamdu lil la hi rabbil alameen, arrahmanir raheem پڑھتا ہوں؛ کیوں کہ میں صحیح سے عربی الفاظ نہیں پڑھ سکتا، نیز یہ الفاظ بھی تجوید کے قواعد کے ساتھ آتے ہیں، تو کیا اس طرح قرآن پڑھنا درست ہے؟

والسلام

۱۲۴۵/د ۱۴۳۵ھ

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں، توقیفی اور سماعی ہے،(۱) لوحِ محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے

(۱)......(الف) وقال ابن فارس : الّذي نَقُوله أنّ الخطّ توقيفيٌّ لقوله تعالیٰ :﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ . عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾(سورۂ علق، آیت:۴-۵)﴿"نٓ" وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾(سورۂ قلم، آیت:۱)(الإتقان في علوم القرآن، النّوع السّادس والسّبعون: ۴/۱۶۴، ط: مصر)

(ب) الرّأي الأوّل أنّه (رسم المصحف) توقيفي لا تجوز مخالفته، وذلك مذهب الجمهور. (مناهل العرفان: ۱/۲۶۵، دار إحياء التّراث العربي، بيروت)

رسم الخط کے مطابق ہے(۱) تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے۔

نیز ارشادِ خداوندی: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ الآية﴾(سورۂ حجر، آیت: ۹) میں جس طرح قرآن کریم کے الفاظ و معانی کی حفاظت کا وعدہ ہے، اسی طرح قرآنی رسم الخط بھی اس میں داخل ہے، ظاہر ہے کہ یہ ساری خوبیاں اور کمالات دنیا کی کسی اور زبان کو حاصل نہیں ہیں؛ لہٰذا قرآنی رسم الخط کے علاوہ کسی اور زبان میں نہ تو قرآن کریم کی کتابت جائز ہے اور نہ ہی تلاوت کی گنجائش ہے۔(۲)

نیز عربی زبان اپنی متنوّع خصوصیات کے حوالہ سے دوسری زبانوں سے ممتاز ہے(۳) مثلاً عربی میں ذ، ز، ض، ظ میں فرق ہے، انگریزی میں نہیں، عربی میں ہمزہ اور عین میں فرق ہے، انگریزی میں نہیں، اور اگر فرق کے لیے کچھ علامتیں بھی مقرر کر لی جائیں، تو بھی اتنا نمایاں فرق نہیں ہوسکتا جو عربی میں ہے، اور ظاہر ہے کہ حروف کی تبدیلی کی وجہ سے معنی اور مفہوم میں تبدیلی ضرور آئے گی؛ اسی لیے فقہائے کرام نے کسی اور زبان میں قرآن پڑھنے کی گنجائش نہیں دی ہے۔

رہا ”عربی نہ جاننے کا عذر“ تو یہ نا قابلِ التفات اور ایک غیر معقول عذر ہے؛ کیوں کہ عجمیوں کے لیے عربی رسم الخط میں قرآن پڑھنے کی مشکلات آج پیدا نہیں ہوئیں؛ بل کہ چودہ سو برس پہلے جب قرآن جزیرۃ العرب سے نکل کر ممالک عجم میں پہنچا اسی وقت یہ مشکلات پیدا ہوئیں؛ بل کہ غور کیا جائے تو اس وقت یہ مشکلات زیادہ تھیں کہ مسلمانوں میں لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد کم تھی خصوصًا

(۱) أنزِل القرآن أو لا جملة واحدة من اللّوح المحفوظ إلى السّماء الدّنيا ثمّ نزل مفرّقًا على حسب المصالح ثمّ أُثْبِتَ في المصاحف على التأليف والنّظم الْمُثْبت في اللّوح المحفوظ.
(الإتقان: ۱/ ۲۱۷، مصر)

(۲) إن اعتاد القراءة بالفارسيّة أو أراد أن يكتب مصحفًا بها يمنع، وإن فعل.
في آية أو آيتين لا ............ والظّاهر أنّ الفارسيّة غير قيد.
(ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۲/ ۱۸۷، باب صفة الصّلاة)

(۳) للعربية فضل على سائر الألسن، وهو لسان أهل الجنّة.
(الدّرّ مع الرّدّ: ۹/ ۶۰۰، باب الاستبراء وغيره)

قرآن پڑھانے والا تو کوئی عربی ہی ہوسکتا تھا، جس کا ہر شہر، ہر قصبہ، ہر قریہ اور بستی میں ملنا ظاہر ہے کہ آسان نہ تھا؛ لیکن ان سب کے باوجود صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہیں یہ تجویز نہیں کیا کہ ان عجمیوں کو ان کے ملکی رسم الخط میں قرآن لکھ کر دے دیا جائے؛ تاکہ وہ آسانی سے اپنی مادری زبان میں قرآن کی تلاوت کرسکیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کو غیر عربی رسم الخط میں نہ تو لکھنا جائز ہے اور نہ اس کی تلاوت کی گنجائش ہے، آپ کو جو سورتیں یاد ہوں آپ بار بار ان ہی کی تلاوت کرتے رہیں اور روزانہ تھوڑا سا وقت نکال کر مسجد کے امام صاحب یا کسی حافظ قرآن کے پاس عربی میں قرآن پڑھنا سیکھ لیں کہ یہ بہت بڑی سعادت اور نعمت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۲/ ۱۱/ ۱۴۳۵ھ مطابق: ۹/۸/ ۱۴ء

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، محمد مصعب عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## عورتوں کے درسِ قرآن کی مختلف صورتوں کا حکم

محترم مفتی صاحب!

السّلام علیکم و رحمة اللّٰه وبر کاتہٗ

**سوال:** ﴿۱۴﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلے میں:

عرض گذارش یہ ہے کہ ہمارے شہر ممبئی میں آج کل عورتوں میں قرآن کے ترجمہ وتفسیر کا رواج بہت تیزی سے پھیل رہا ہے، جگہ جگہ عورتیں کلاسیں قائم کررہی ہیں اور بہت سی عورتیں وہاں جاکر تعلیم لے رہی ہیں، یقیناً قرآن کی تعلیم بڑی عظیم چیز ہے؛ لیکن ہم اہلِ شہر کو فکر اس وجہ سے لاحق ہے کہ ان میں تعلیم دینے والی خواتین سرے سے علوم دینیہ سے واقف ہی نہیں ہیں، انہوں نے کسی مدرسہ سے تعلیم حاصل نہیں کی، انہوں نے کسی سے ضروری دینی علوم حاصل نہیں کیے، عربی زبان سے انہیں واقفیت نہیں؛ بلکہ کچھ تو ایسی ہیں جنہیں قرآن تک تجوید سے پڑھنا نہیں آتا، بس قرآن پڑھنے اور

سمجھنے پھر پڑھانے اور سمجھانے کا شوق پیدا ہوگیا اور کلاسیں شروع ہوگئیں، ان میں اکثر وہ ہیں جو طلاق شدہ یا بیوہ ہیں یا لا ولد ہیں اور مال دار ہیں، انہیں ذہنی سکون اور وقت گذاری کے لیے کسی مشغلہ کی ضرورت تھی تو انہوں نے اس کام کو اختیار کرلیا اور یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ قرآن میں اللہ خود کہتے ہیں کہ ہم نے قرآن کو بالکل آسان کر دیا ہے اور یہ قرآن تمام انسانوں کے لیے اتارا گیا ہے؛ لہٰذا عورتوں کو اس کی تعلیم سے روکنا خدا کے حکم کو توڑنا ہے، اس طرح کی باتیں کر کے وہ اپنی کلاسیں چلا رہی ہیں۔

درحقیقت ہم نے اپنے کئی علمائے کرام سے سنا تھا کہ ماہر علمائے کرام کے علاوہ کسی کی تفسیر میں ہرگز نہیں بیٹھنا خاص کر جن کی بنیاد علم دین نہ ہو؛ اس لیے کہ اس قسم کے لوگ بسا اوقات قرآن کے ترجمہ اور اس کے ظاہری مفہوم کو بھی صحیح نہیں سمجھ پاتے اور اپنی طرف سے مفہوم بیان کرنا شروع کرتے ہیں اور حضور ﷺ کی وہ حدیث جس میں اپنی رائے سے قرآن میں باتیں کرنے سے منع کیا گیا اس کا مصداق بن جاتے ہیں اور پھر گمراہی پھیلتی ہے، اور اس قسم کے لوگ عموماً ان ترجموں اور تفسیروں یا آڈیو کیسٹ سے مدد لیتے ہیں جو باطل فرقوں کی ہوتی ہیں، جن میں گمراہ کن نظریات ہوتے ہیں، اگر چہ سب ایسے نہیں ہوتے ہوں گے؛ لیکن اکثروں کا یہی حال ہے ہمارے پاس جب ایسی کلاسوں میں جانے والی عورتوں کے فکرمند اور پریشان مردوں نے ساری تفصیلات بتائی تو مذکورہ باتیں بالکل آشکارہ ہوگئیں، ہم نے ان کی عورتوں کو سمجھایا تو الحمد للہ بہت سی رک گئیں؛ لیکن بہت سی اب بھی جاتی ہیں۔

واضح رہے کہ اگر یہ کلاسیں چلانے والی خواتین کسی معتبر مدرسہ سے علوم دینیہ میں سند حاصل کی ہوتیں، عالمہ فاضلہ ہوتیں اور کسی بڑے کی سرپرستی میں کام کرتیں تب تو ہم خود اپنے گھر کی عورتوں کو بھیجتے؛ تاکہ وہ لوگ بھی خدا کے فرمان کو سمجھ لیں اور یہ بڑی ہدایت وسعادت کی بات ہوتی؛ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ عورتیں عالمہ فاضلہ نہیں ہیں، بلکہ بنیادی دینی علوم سے بھی واقف نہیں ہیں، غالباً آپ بھی ان چیزوں سے واقف ہوں گے، اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ دین کے ماہرین سے

اس نوع کے معاملات میں رہنمائی حاصل کرلی جائے؛ تاکہ سب کے لیے سند رہے؛ لہٰذا مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں درج ذیل سوالات کے جواب عنایت فرمائیں۔

(۱) کیا قرآن پاک کی تعلیم ہر کس وناکس دے سکتا ہے؟ یا اس بارے میں کچھ شرائط ہیں، کم ازکم اس کی تعلیم دینے والے میں کن چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے؟ اعلیٰ درجہ کی تفسیر نہ ہو؛ بلکہ صرف ترجمہ اوراس کا مفہوم بیان کرنے کے لیے کم ازکم کیا چیزیں ضروری ہیں؟

(۲) جن میں یہ بنیادی شرائط نہ ہوں ان کا قرآنی کلاسیں چلانا اورکسی کی بات نہ سننا کیسا ہے؟

(۳) ایسی کلاسوں میں عورتوں کا شرکت کرنا اوراپنے گھر کی عورتوں کو بھیجنا کیسا ہے؟

(۴) کیا ایسی کلاسوں میں جانے سے روکنے کی کوشش کرنا خدا کے حکموں کی خلاف ورزی ہے؟

(۵) تعلیم گاہوں میں معتبر علماء سے علم حاصل کیے بغیر صرف ترجمہ دیکھ کر قرآن کی تعلیم دینے کی اجازت ہوسکتی ہے؟  فقط والسلام

مستفتی: توصیف احمد صدیقی (۱۷۳/ د ۱۴۳۲ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

سوال میں ذکر کردہ تفصیل سے معلوم ہورہا ہے کہ ''قرآن پاک کی تعلیم'' اس سے مراد محض الفاظ اور تجوید وقرأت کی تعلیم نہیں ہے؛ بل کہ مراد خداوندی اور ترجمہ وتفسیر کی تعلیم مراد ہے؛ اس لیے عرض ہے کہ ترجمہ وتفسیر کی تعلیم کی سب سے پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ معلم کی دینی اوراعتقادی حالت درست ہو، یعنی وہ فکری اور عملی بدعات وخرافات سے دور ہو؛ کیوں کہ بدعقیدہ اور بے عمل شخص پر عام دنیوی معاملات میں اعتماد نہیں کیا جاتا، تو ترجمہ وتفسیر کے سلسلے میں کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے،

**قال في الإتقان: اعلم أنّ مِن شرطِہ صحّة الاعتقاد أوّلاً ولزوم سنة الدّين ، فإن من كان مغموصًا عليه في دينه لا يؤتمن على الدّنيا فكيف على الدّين ؟ ثمّ لا يؤتمن في الدّين على الإخبار عن عالم فكيف يؤتمن في الإخبار عن أسرار اللّٰہ تعالیٰ(۱)**

(۱) الإتقان في علوم القرآن: ۳۸۷/۲، ط: بیروت .

پھر یہ کہ ترجمہ وتفسیر کی تعلیم دینے کی تین صورتیں ہیں :

(الف) کوئی شخص کسی ترجمہ وتفسیر کی مدد کے بغیر براہِ راست اپنی فہم سے قرآن کریم کی تفسیر اور مرادِ خداوندی کو بیان کرے، تو ایسے شخص کے لیے علوم قرآن کے ماہرین حضرات نے بہت سے علوم میں ماہر ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ مثلاً: نحو، صرف، اشتقاق، معانی، علم حدیث، شانِ نزول، ناسخ، منسوخ وغیرہ، چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے ایسے شخص کے لیے پندرہ علوم کا جامع ہونا ضروری قرار دیا ہے، جن کی تفصیل ''الإتقان في علوم القرآن'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔(۱) مذکورہ شرائط ؎ کا اجتماع

(۱) تفسيره لمن كان جامعًا للعلوم الّتي يحتاج المفسّر إليها ، هي خمسة عشر علمًا : اللّغة والنّحو ، التّصريف والاشتقاق والمعاني والبيان والبديع وعلم القراءات ، أصول الدّين بما في القرآن ، أصول الفقه ،أسباب النّزول والقصص ، والنّاسخ والمنسوخ ، والفقه ، والأحاديث المبيّنة لتفسير المجمل والمبهم ،علم الموهبة وهو علم يورثه اللّٰه تعالٰى لمن عَمِل بما علم .(ملخّص الاتقان في علوم القرآن:۲/۳۹۷-۳۹۹،ط:بيروت)

؎ خلاصۂ فتویٰ جامع شرائط مترجم

از: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

مترجم کے لیے کم ازکم ان چند اوصاف کا جامع ہونا واجب ہے :

اوّل: عربی زبان خوب سمجھتا ہو کہ عربی سے ترجمہ کر سکے؛ کیوں کہ ترجمے سے ترجمہ کرنے میں اصل سے بُعد ہو جاتا ہے۔

دوم: فنونِ عربیت (صرف ونحو بلاغت ولغت) میں ماہر ہو؛ تاکہ ترجمے میں صیغہ وترکیب واسالیب کلام ودقائق وضع کی رعایت رکھ سکے؛ کیوں کہ ان کے اہمال سے ترجمے میں سخت غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں۔

سوم: اصطلاحاتِ شرعیہ سے واقف ہو؛ کیوں کہ مصطلحات کا ترجمہ معانی لغویہ سے کرنے میں مراد متکلم کی بدل جاتی ہے۔

چہارم: حدیث کو شیوخ سے حاصل کیا ہو؛ تاکہ تفسیر کرنے میں مخالفت صاحب وحی یا اسباب نزول کی لازم نہ آئے۔

پنجم: مذاہب مجتہدین پر نظر ہو؛ تاکہ فقہیات کی تفسیر میں اجماع کی مخالفت نہ کرے۔

ششم: علم کلام وتفصیل عقائد اہل سنت جانتا ہو تاکہ اعتقادیات کی تفسیر میں بدعت سے بچ سکے۔ ==

عام علماء میں بھی یہ مشکل ہوتا ہے، تو عوام کے اندر پائے جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا؛ لہٰذا اُن کے لیے اپنی طرف سے قرآنِ کریم کے معنی ومفہوم کو بیان کرنا بالکل جائز نہیں ہے، حدیث شریف

== ہفتم: مفسرین محققین کے اقوال پیش نظر ہوں؛ تاکہ ناسخ ومنسوخ وزیادت وحذف وغیرہ پر اطلاع ہو، جن میں نقل کی احتیاج ہے۔

ہشتم: اصول ومعقول بہ قدر ضرورت حاصل کیا ہو؛ تاکہ عقلیات شرعیات کی تفسیر میں تقریر استدلال پر قادر ہو۔

نہم: مواضع مغلقہ ومجملہ میں تاویل مشترک یا رفع تعارض یا بیان نسخ یا تفسیر مبہم یا تفصیل مجمل وغیرہ کے اظہار کے لیے صرف ترجمے پر اکتفانہ کرے؛ بلکہ بہ طور شرح یا حاشیے کے امور مذکورہ کی توضیح کر دے۔

دہم: جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے اس میں پورا مذاق ہو، صرف استعداد کتابی پر قناعت نہ کرے؛ تاکہ مطالب قرآنیہ کو کافی عبارت میں ادا کر سکے۔

یازدہم: صحیح العقیدہ صالح الاعمال ہو؛ تاکہ تفسیر میں تائید بدعت و ہوائے نفسانی وخیانت تبدیل سے امن رہے۔

دوازدہم: علمائے محققین معاصرین کی ایک معتدبہ جماعت کی نظر میں مقبول ومسلم ومعتبر ہو۔

سیزدہم: ذہین وذکی ہو، بلید وغبی نہ ہو؛ تاکہ اقوال مختلفہ میں سے مناسب قول کو ترجیح دے سکے، دقائق کلام کو سمجھ سکے، مخالفین کے شبہات کو شائستگی سے رفع کر سکے۔

چہاردہم: ترجمہ حامل المتن ہو صرف تراجم کے شائع ہونے سے آئندہ اصل کے ضائع ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔

پانزدہم: خودرائے ومتکبر نہ ہو؛ تاکہ جس مقام پر شرح صدر نہ ہو علمائے وقت کی خدمت میں رجوع کرنے سے عار وننگ نہ کرے، اگر کوئی اس کی لغزش پر اطلاع دے اس کو قبول کر کے اصلاح کر دے۔

جو شخص شرائط مذکورہ کا جامع نہ ہوگا وہ ترجمے پر مبادرت کرنے سے عاصی و خاطی اور بانی ضلالت و جہالت ہوگا اور کئی ایسے شخصوں کا جمع کر لینا جن میں ایک ایک وصف ہو کافی نہیں ہے، جیسا کہ اب تک انگریزی اور بعض اردو ترجموں میں ہوا۔

(ضمیمہ اصلاح ترجمہ دہلویہ۔ از: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ)

میں اس پر بڑی سخت وعید آئی ہے: مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (۱)
ایک دوسری روایت میں ہے: مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ(۲)

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی مستند ترجمہ وتفسیر کی مدد سے قرآنِ کریم کا درس دیتا ہے، تو ایسے شخص کے لیے صحیح العقیدہ اور متدین ہونے کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ یا تو وہ باقاعدہ علومِ دینیہ کی تکمیل کر کے کسی مدرسہ کا فارغ التحصیل ہو یا کم از کم کسی معتبر عالم کے پاس رہ کر یا اُن سے سیکھ سیکھ کر ضروری علوم حاصل کر لیے ہوں اور اتنی لیاقت وصلاحیت پیدا ہوگئی ہو کہ ترجمہ وتفسیر کی مدد سے صحیح مراد اور مطلب تک رسائی ہو جاتی ہو، نیز وہ ترجمہ اور تفسیر اہلِ حق علماء میں سے کسی معتبر عالم کی ہو؛ لہٰذا جو شخص باقاعدہ عالم نہ ہو، اس کے لیے اپنی طرف سے ترجمہ وتفسیر کی تشریح کرنا درست نہیں ہے۔

(ج) تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص صالح اور دین دار ہے، اردو لکھنا پڑھنا بھی خوب جانتا ہے، اردو زبان وادب اور اس کے محاوروں سے بھی واقف ہے، نیز دینی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہنے کی وجہ سے دین کے سلسلے میں عقائد، عبادات ومعاملات کی ضروری اور اہم معلومات حاصل ہو چکی ہیں، تو ایسا شخص اگرچہ اصطلاحی عالم نہ ہو؛ لیکن اہلِ حق علماء کے معتبر ومستند اردو ترجمہ وتفسیر کو بعینہٖ پڑھ کر سنا دے، تو اس کی گنجائش ہے؛ البتہ اس کے لیے احتیاطی دو شرطیں ہیں:

(۱) جو حصہ پڑھ کر سنانا ہے پہلے اسے خوب اچھی طرح پڑھ کر سمجھ لے، بہتر ہے کہ کسی عالم کے سامنے پڑھ کر سمجھے، پھر لوگوں کو سنائے۔

(۲) اگر خود پڑھ کر سمجھ لیا؛ لیکن عالم کو سنانے کا موقع نہیں مل سکا، تو پھر اس بات کی پابندی کرے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے یا جہاں اشکال پیدا ہو، وہاں نشان لگا کر بعد میں کسی عالم سے سمجھ لے، پھر لوگوں کے سامنے اس کی وضاحت کر دے، بہر حال اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہے۔

ترجمہ وتفسیر کی تعلیم دینے اور اس کے سنانے کے سلسلے میں جواز وعدم جواز کے ضابطے اوپر

(۱-۲) أخرجهما الترمذي، ج:۲،ص:۱۲۳، رقم: ۲۹۰۱-۲۹۰۲، باب ما جاء في الذي يفسّر القرآن برأيه.

تحریر کردیے گئے ہیں، جو مرد و عورت دونوں کے لیے یکساں ہیں؛ لیکن آپ نے سوال میں ممبئی کی جو صورتِ حال لکھی ہے، اس میں چند امور تنقیح طلب ہیں:

(۱) ترجمہ وتفسیر کا درس دینے والی خواتین کو صحیح عقائد وفکر کے سلسلے میں پختگی حاصل ہے یا نہیں؟

(۲) ان خواتین کی علمی صلاحیت، اردو خوانی، مطلب فہمی کس درجہ کی ہے؟

(۳) ترجمہ وتفسیر کو بہ الفاظہ سناتی ہیں یا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کرتی ہیں؟

(۴) کس کا لکھا ہوا ترجمہ وتفسیر سناتی ہیں؟

**نوٹ:** بہتر ہے کہ مقامی مفتیانِ کرام کو ان کلاسوں کی صورتِ حال سے واقف کرایا جائے، وہ واقعات کی تحقیق، اسباب وعوامل کی جانچ کرکے ترجمہ وتفسیر سے متعلق مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں حکم شرعی واضح کردیں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/۲/۱۴۳۶ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## راشد شاز کی گمراہیاں ان کی تحریرات کی روشنی میں

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

حضرات مفتیان کرام دار الافتاء دارالعلوم دیوبند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

**سوال:** ﴿۱۴﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلے میں:

بعدہ خدمات عالیہ میں عرض یہ ہے کہ اس وقت علی گڑھ کی مشہور ومعروف مسلم یونیورسٹی کے ایک شعبے کے ذمہ دار راشد شاز صاحب کے عقائد ونظریات کو لے کر ہمارے یہاں لوگ کافی تشویش میں مبتلا ہیں، موصوف ایک ایسے شعبے کے ذمہ دار ہیں جس میں اکثر مدارسِ اسلامیہ سے فارغ ہونے

والے طلبہ کا داخلہ لیا جاتا ہے، اُن کی راہنمائی کے لیے راشد شاز صاحب کو مقرر کیا گیا ہے، راشد شاز صاحب کی بہت سی کتابیں ہیں، جن کا گہرائی سے جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ واقعی اُن کے عقائد اور نظریات قابلِ تشویش ہیں؛ لیکن چونکہ موصوف کو لکھنے اور بولنے کا ایک خاص طریقہ حاصل ہے؛ جس کی وجہ سے عام قاری حدیث وفقہ کے سلسلے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور فقہاء ومحدثین؛ بلکہ صحابہ کرام اور تابعین کے دینی فہم پر سے اس کا اعتماد اٹھ جاتا ہے، اس لیے ہم آپ حضرات کی خدمت میں ان کی کتابوں کو ارسال کر رہے ہیں، ان کتابوں کی روشنی میں چند امور کا جواب مطلوب ہے:

[۱] راشد شاز کے عقائد ونظریات کیسے ہیں؟ اگر غلط ہیں تو براہ کرم غلطیوں کی نشاندہی فرما کر، اُن کا مدلل ومفصل جواب بھی عنایت فرمادیں۔

[۲] کیا یہ شخص اپنے عقائد کی وجہ سے کافر ہے؟

[۳] ایسے عقائد کے حامل شخص کا کسی مسلم ادارے یا یونیورسٹی میں مسلمانوں خصوصا مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کی تعلیم وتربیت اور راہنمائی کے لیے ذمہ دار بننا کیسا ہے؟

[۴] مسلمانوں کے لیے ان کی کتابوں کو پڑھنا اور ان کی تقریروں کو سننا کیسا ہے؟

[۵] ایسے شخص کا کسی بھی طرح کا تعاون کرنا، اس کی کتابوں کا ترجمہ کرنا، اس کے مشن میں ساتھ دینے کا شرعی حکم کیا ہے؟

امید ہے کہ ہر سوال کا مدلل ومفصل تشفی بخش اور واضح جواب دیا جائے گا، تاکہ اس شخص کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنا آسان ہو جائے۔ فقط والسلام

المستفتي: محمد غزالی ندوی، علی گڑھ

(۹۴۰/د ۱۴۳۶ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التّوفیق:

’’راشد شاز‘‘ نامی شخص سے متعلق آپ کا استفتاء اور ان کی لکھی ہوئی کتابیں موصول ہوئیں،

ان کتابوں کو گہرائی سے پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ موصوف کے عقائد نہایت گمراہ کن اور ملحدانہ ہیں، ان کے عقائد ونظریات قرآن وحدیث کی صریح نصوص کے خلاف ہیں، ان کی کتابوں میں لکھی ہوئی بعض عبارتوں کی اگر تاویل نہ کی جائے، تو فقہائے کرام کی تصریحات کی روشنی میں ایسے شخص کے کافر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

موصوف نے اپنی کتابوں میں پورے دین اسلام کی جمہور اہل السنہ والجماعۃ سے ہٹ کر ایسی تعبیر اور تشریح کی ہے، جس کی وجہ سے احادیثِ رسول، اجماعِ امت اور قرآن وحدیث کی صریح نصوص سے مستنبط بہت سے مسلمہ و متفقہ عقائد اور مسائل مسترد ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے قرآن کریم کی اُن آیتوں کا بھی انکار لازم آتا ہے جن میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور جن سے احادیث کا قرآن کریم کی طرح حجت ہونا صراحتا ثابت ہے؛ بلکہ انھوں نے بہت سی احادیث اور روایتوں کا صراحتا انکار بھی کیا ہے، ان کی کتابوں میں جگہ جگہ سلف سے خلف تک دین کے مختلف شعبوں سے متعلق کی گئی کوششوں کو نہ صرف غلط قرار دیا گیا ہے، بلکہ ان کوششوں کو غلط اور منفی رخ دینے کی کوشش کی ہے اور جگہ جگہ اس بات پر زور دیا ہے کہ دور نبوی کے بعد سے اب تک سب سے بڑے مجرم وہ لوگ ہیں جنھوں نے دینِ اسلام کو صحیح سمجھانے کے لیے حدیث، فقہ اور دیگر علوم دینیہ کو ایجاد کیا۔ اُن کی ساری تحریروں کا حاصل یہ ہے کہ دینِ اسلام کو اب تک کسی نے صحیح نہیں سمجھا، مفسرین، محدثین، فقہاء، علماء اور سلفِ صالحین امت مسلمہ کے سامنے دینِ اسلام کو صحیح پیش نہ کر سکے؛ بلکہ یہ شخصیات وحی الٰہی کے صحیح سمجھنے میں حجاب بنی رہیں۔ ذیل میں راشد شاز کے چند گمراہ کن اور ملحدانہ عقائد ونظریات ملاحظہ فرمائیں:

راشد شاز کا سب سے گمراہ کن عقیدہ احادیث رسول ﷺ کی حجیت کا انکار ہے، موصوف نے اپنی کتابوں میں سارا زور اسی پر صرف کیا ہے کہ شریعتِ اسلام کا اصل ماخذ صرف قرآن کریم ہے، احادیث کی حیثیت تاریخ سے زیادہ نہیں ہے، انہوں نے نہ صرف احادیث کو شریعت کا ماخذ ماننے سے انکار کیا ہے؛ بلکہ احادیث کو ماخذ شرعی ماننے، اور اقوالِ رسول ﷺ کو قرآن فہمی کے لیے ذریعہ سمجھنے کو دنیا میں مسلمانوں کی ترقی کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ اور اس کو یہودیوں کے فکری

بحران کے مماثل قرار دیا ہے، نیز اس حوالے سے انھوں نے محدثین اور احادیث کی تحقیق و تثبیت میں ائمہ جرح وتعدیل کی کوششوں کا استہزاء بھی کیا ہے، چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں :

"انسانوں کے مرتب کردہ صحیفہ اقوال رسول کو وحی غیر متلو کی لازوال حیثیت دینا اور پھر اسے فہمِ قرآنی کے لیے مفتاح بنانا ایک ایسا عمل تھا، جس نے فکرِ اسلامی کو اسی بحران سے دوچار کر دیا، جس میں اہلِ یہود پہلے سے مبتلا تھے"۔　　(ادراک زوال امت:۱/۵۸)

"جس فکری چوکھٹے میں قرآن مجید کے بالمقابل آثار وروایات، قدماء کے اجماع اوران کے قیاس کو تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا ہو، بھلا اس سے کیوں کر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کوئی نیا ذہن اور نئے آسمان کی تشکیل پر منتج ہوگا"۔

(اسلام: مسلم ذہن کی تشکیل جدید، مسئلہ اجتہاد پر ایک اجتہادی نظر، (ص:۱۱۲)

"ہمارے پاس یہ ماننے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ایامِ رسول کو رکارڈ کرنے والی اقوال وآثار کی یہ بیش قیمت کتابیں ایک مقدس عہد کی تاریخ کو محفوظ کرنے کی کوشش ہے اور بس"۔　　(ادراک زوالِ امت:۱/۲۴۶)

"اسی طرح محتاط الفاظ میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہماری تمام تر فکری انحراف کی بنیادی وجہ ماخذ وحی سے باہر ایک ایسے وحی کی دریافت ہے، جس کا تمام تر انحصار تاریخ کے کاندھوں پر ہے اور جس کا کوئی حتمی، متفقہ اور مستند ترین ایڈیشن چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی امت کی دسترس میں نہیں آسکا"۔　　(ادراک زوالِ امت:۱/۱۲۰، ۲۱۷)

"اقوال وآثار کے ضخیم ذخیرے میں چند ایسے اقوالِ رسول کی نشاندہی بھی ممکن نہیں، جسے تاریخ سے بالاتر مستند یا متواتر قرار دیا جاسکے"۔

(ادراک زوال امت:۱/۱۹۹)

"پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسانی تالیفات کو جس کی جمع وتدوین اور تحقیق و تجزیے میں انسانی ذہن کی کارفرمائی ہو، اسے لازوال دینی ماخذ کی حیثیت

عطا کردی جائے اور وہ بھی اس طرح کہ صحاح ستہ کی بنیاد پر سنی اسلام کا
خرمن تشکیل پائے''۔　　　(متحدہ اسلام کا منشور، ص:۳۴)

ان اقتباسات کی روشنی میں احادیثِ رسول اور اُن پر مشتمل کتابوں کے بارے میں راشد شاز صاحب کا نظریہ صاف ظاہر ہے کہ وہ احادیث رسول کو شریعتِ اسلام کا ماخذ ماننے اور ان کے وحی الٰہی ہونے کے منکر ہیں، اسی وجہ سے وہ اقوالِ رسول ﷺ پر مشتمل اب تک لکھی گئی کتابوں کو محض ایک عہد کی تاریخ کو محفوظ کرنے والی کتابوں کا درجہ دیتے ہیں، ان کے نزدیک شریعت کو سمجھنے اور اُس پر عمل کرنے کے حوالے سے اِن کتابوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے؛ حالانکہ اہل السنۃ والجماعۃ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ قرآن کی طرح وحی غیر متلو (یعنی: جس کے الفاظ اللہ کے یہاں سے نہیں آئے؛ بلکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنے الفاظ میں حکم خداوندی پہنچایا یا اللہ تعالیٰ نے نبی پاک ﷺ کے دل میں جو معنیٰ القا فرمائے ہیں، ان سے آپ نے قرآن کریم میں بیان کردہ احکام کی تشریح فرمائی، اُن اقوال ہی کو حدیث کہا جاتا ہے) بھی وحی اور حجت ہے، احادیث کا قرآن کریم کی طرح وحی اور حجت ہونا ایک ایسا قطعی عقیدہ ہے جس کا انکار ایک بدیہی اور قطعی بات کا انکار ہے، ہم بصیرت کے لیے قرآن کریم ہی سے چند دلائل ذکر کرتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَمَایَنطِقُ عَنِ الھویٰ، اِن ھو اِلّا وحی یُوحٰی'' یعنی: آپ ﷺ اپنی خواہشِ نفسانی سے باتیں نہیں بناتے، آپ کا ارشاد نری وحی ہے، جو آپ پر بھیجی جاتی ہے، خواہ الفاظ وحی کیے گئے ہوں، جو قرآن کہلاتا ہے یا صرف معانی کی وحی ہو، جو سنت کہلاتی ہے''۔

(بیان القرآن، النجم:۳)

یہ آیت اگر چہ اپنے مَورِد یعنی: شانِ نزول کے اعتبار سے وحی متلو (قرآن) کے ساتھ خاص ہے؛ لیکن اس کے الفاظ عام ہیں اور ایسی صورت میں خاص شانِ نزول کا اعتبار نہیں ہوتا؛ بلکہ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے، تفسیر کا قاعدہ ہے: ''**العبرة لعموم اللّفظ لا لخصوص المورد**''، یعنی: ''آیت اگر کسی خاص موقع کے لیے نازل ہوئی ہو؛ مگر الفاظ عام ہوں، تو حکم اس خاص موقع تک مقصور نہیں رہے گا؛ بلکہ الفاظ کے عموم تک عام رہے گا'' پس اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ

کی احادیث بھی وحی الٰہی ہیں، نیز آیت کے الفاظ میں بھی غور کرنے سے یہی بات ثابت ہوتی ہے؛ اس لیے کہ آیت میں ''وَما ینطِقُ'' کا لفظ ہے ''و مایتلو'' نہیں ہے، اگر آیت سے ''وحی متلو'' مراد ہوتی، تو اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتے: ''وَمَا یَتلُو عَنِ الھوی'' یعنی: آپ ﷺ جو کلام تلاوت فرمارہے ہیں، وہ اُن کا گھڑا ہوا نہیں ہے؛ بلکہ اُن کی طرف وحی کیا ہوا ہے، مگر جب ''وَمَا یَنطِقُ'' فرمایا، یعنی: رسول جو بولیں اور بولنا عام ہے، خواہ قرآن کے الفاظ تلاوت کریں، خواہ اس کی تبیین وتشریح میں کوئی بات ارشاد فرمائیں، سب وحی ہے، پس ثابت ہوا کہ قرآن کی طرح احادیث بھی وحی ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم میں (سورۂ قیامہ، آیت:۱۹) میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''ثُمَّ اِنَّ عَلَینَا بَیَانَه'' پھر اس کا بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے، یعنی نازل کردہ قرآنی وحی کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے اور (سورۂ نحل، آیت:۴۴) میں ارشاد پاک ہے: ''واَنزَلنَا اِلَیكَ الذِّکرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیهِم وَلَعَلَّهُم یَتَفَکَّرُونَ'' یعنی: ہم نے آپ کی طرف یہ قرآن اتارا ہے، تاکہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ہیں، آپ اُن کو کھول کر سمجھادیں، دونوں آیتوں کو ملانے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیان کی جو ذمہ داری لی ہے، اُس کی تکمیل رسول اللہ ﷺ کریں گے، آپ کا بیان اللہ ہی کا بیان ہوگا اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے کہ آپ نے قرآن کی تبیین وتشریح وحی کے ذریعے کی ہو ورنہ اس کو اللہ کا بیان کیسے کہہ سکتے ہیں۔ (تحفۃ الالمعی :۱/۴۹-۵۰)

نیز احادیث کا حجت ہونا، یعنی: امت کے لیے احادیث سے ثابت شدہ اوامر ونواہی پر عمل کا ضروری ہونا قرآن کریم کی بہت سی آیات سے ثابت ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا آتَاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوہ وَمَا نَهَاکُم عَنه فَانتَهُوا ''جو کچھ رسول (احکامِ شرع میں سے) تم کو دیں، اسے لےلو اور جن چیزوں سے روکیں، اُن سے رک جاؤ'' اِس آیت سے احادیث کا قرآن کریم کی طرح حجت ہونا واضح ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ امت کو مخاطب کرکے ارشاد فرمارہے ہیں کہ حلال وحرام کے سلسلے میں میرے رسول تم کو جو حکم دیں، تمہارے لیے اس کا ماننا ضروری ہے، مفسرین کی تفسیر کے مطابق اس آیت میں آپ ﷺ کے سارے مامورات اور ساری منہیات داخل ہیں، اس آیت کی رو سے امت کے لیے آپ کے ہر حکم کو ماننا ضروری ہے، اور جس سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے،

امت کے لیے اس سے بچنا ضروری ہے۔ ( دیکھئے: تفسیر کشاف: ۵۰۳/۴، الحشر: ۷، ط: دار الکتاب العربی، بیروت، روح المعانی: ۲۴۳/۱۴، الحشر: ۷، ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت )

اس کے علاوہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے ساتھ ہر جگہ اپنے رسول کی بھی اطاعت کا حکم دیا ہے، ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی اطاعت کا حکم دیا ہو اور اپنے رسول کی اطاعت کا حکم نہ دیا ہو( حجیت حدیث، ص: ۲۰، مؤلفہ: مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی)؛ اس لیے کہ رسول کی اطاعت کے بغیر عملاً اللہ کی اطاعت ممکن ہی نہیں ہے، اسی وجہ سے قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے صرف رسول کی اطاعت کا ذکر کیا ہے، اپنی اطاعت کا ذکر نہیں کیا؛ اس لیے کہ رسول کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **وَ مَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَد اَطَاعَ اللّٰه** ( سورۂ نساء، آیت: ۸۰ ) اس طرح کی آیات سے بھی احادیث کا حجت ہونا اور دینِ اسلام میں اس کی تشریعی حیثیت کا ہونا ثابت ہے؛ اس لیے آپ ﷺ کی اطاعت کا حکم آپ کے زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے؛ بلکہ آپ کے زمانے کے بعد بھی امت کو آپ کی اطاعت کا مکلّف بنایا گیا؛ کیونکہ اطاعتِ رسول پر مشتمل آیاتِ قرآنیہ عام ہیں، جن میں آپ ﷺ کی اطاعت کو آپ کے زمانے کے ساتھ خاص نہیں کیا گیا ہے۔

(السّنة ومكانتها في التّشريع الإسلامي، ص: ۷۰، مؤلفہ: مصطفیٰ السباعی )

اسی وجہ سے چودہ سو سالہ تاریخ میں پوری امت نے تسلسل کے ساتھ اس عقیدے کو تسلیم کیا ہے، اس کا انکار وہی شخص کرسکتا ہے، جو اپنے آپ کو اور پوری امت کو شرعی احکام کی بندشوں سے آزاد رکھنا چاہتا ہے، اور اس کی غرض دینِ اسلام کی غلط تشریحات سے آزاد فکری کا خاکہ پیش کرکے لوگوں کو عقلی اور فکری باتوں میں الجھائے رکھنا ہوتا ہے، اس کی تحریروں کا مقصدِ وحی اور مومن کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا؛ اس لیے کہ جب صرف قرآن کی حجیت کا خوشنما عنوان لگا لیا جائے گا اور احادیث کو وحی کا درجہ نہیں دیا جائے گا، اس سے ثابت شدہ احکام پر عمل کو ضروری قرار نہیں دیا جائے گا اور آیاتِ قرآنیہ کی تشریح اور تبیین کے حوالے سے احادیث کو اصل قرار نہیں دیا جائے گا، تو مذہبی پابندیاں یکسر نیست و نابود ہوجائیں گی، قرآن کے معنی ومفہوم میں پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے

سے تصرف کرنا آسان ہو جائے گا، اگر کوئی شخص ٹوکے گا کہ یہ مفہوم احادیث کے خلاف ہے تو بڑی آسانی سے کہہ دیا جائے گا کہ وہ مفہوم راوی نے اگر اپنی سمجھ سے بیان کیا ہے، تو ہم اس کے پابند نہیں ہیں اور اگر حدیث نبوی سے بیان کیا ہے، تو حدیث قابلِ اعتبار و استناد نہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: نصرۃ الحدیث، ص: ۷۰-۷۱)

حجیت حدیث کے انکار پر جو مذکورہ خطرناک نتائج مرتب ہوتے ہیں، راشد شاز صاحب کی کتابوں میں بھی اس کی مثالیں بھری ہوئی ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنی کتابوں میں قرآن کی حجیت کا عنوان قائم کرکے دین اسلام کے جو احکام احادیث سے مستنبط ہیں، جگہ جگہ ان پر سخت تنقیدیں کی ہیں؛ بلکہ سرے سے بہت سی روایات اور احادیث کا انکار کر دیا ہے۔

درحقیقت یہ دعوی کہ "وحی ربانی کا لازوال مأخذ موجود ہوتے ہوئے کسی اور مأخذ کی ضرورت نہیں ہے" اس کے مدعی تنہا شاز صاحب نہیں ہیں؛ بلکہ ماضی میں اس طرز فکر کے حامل ایسے بہت سے نام نہاد مصلحین گزرے ہیں جو درحقیقت مغرب کے آلۂ کار اور الحاد و دہریت کے علمبردار تھے، "نیاز فتحپوری اسلم جیراج پوری، عبداللہ چکڑالوی، مسٹر پرویز" یہ سب اسی ملحدانہ فکر کے حامی اور اس کے پرزور داعی تھے، ان سب کا مقصد درپردہ تعلیماتِ اسلامی، اسوۂ نبوی اور شریعت کے اوامر و نواہی؛ بلکہ پورے دین کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر دہریت اور اباحیت پھیلانا تھا؛ کیونکہ انکارِ حدیث کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مکمل اسلام اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسوۂ نبوی، امت کے ہاتھ سے نکل جائے یا کم از کم مسلمانوں کو اس حوالہ سے تشکیک میں ڈال دیا جائے کیوں کہ احادیث کو ناقابلِ عمل قرار دے کر کیا کسی شخص کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ نمازوں کے اوقات، رکعات کی تعداد، فرائض و واجبات کی تفصیل، صوم و زکات کے مفصل احکام، حج کے مناسک، قربانی و عقیقہ، داڑھی و لباس، امور خانہ داری، معاشرت کے قوانین، صلح و جنگ کے احکام، حدود و قصاص، جنایات و تعزیرات کی تفصیلات صرف قرآن کریم سے ثابت کر دے؟ ہرگز نہیں۔

اگر احادیث کو اس لیے ناقابلِ عمل قرار دے دیا جائے کہ اس کا مدار انسانی کاندھوں پر ہے جیسا کہ شاز صاحب کا کہنا ہے، تو اس دلیل کی رو سے قرآن کریم بھی قابلِ عمل نہیں رہ جاتا، اس لیے کہ جن واسطوں سے احادیث ہم تک پہونچی ہیں، قرآن بھی انھیں واسطوں سے ہم تک پہونچا ہے،

اگر یہ کہا جائے کہ قرآن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کا وعدہ ہے "**إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ**" (سورۂ حجر، آیت: ۹) تو سوال یہ ہوگا کہ خود اس آیت کی صداقت پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ یہ بھی تو انھیں لوگوں کی وسائط سے ہم تک پہنچی ہے جن کے واسطے سے احادیث ہمیں ملی ہیں۔

درحقیقت موصوف شاذ صاحب کی اباحیت پسندی، گمراہ کن عقائد ونظریات، ملحدانہ افکار وخیالات کی اشاعت اور اصلاح مذہب کے مشن میں جو چیز بھی رکاوٹ بن سکتی تھی یا جس کی بنیاد پر موصوف پر اعتراض کیا جا سکتا تھا موصوف نے ایک ایک کر کے سب کی اعتباری حیثیت کو ختم کرنے کی مذموم کوشش کی ہے، احادیثِ رسول کو "تاریخ محض" کے زمرے میں لا کر نا قابلِ اعتبار گردانا، اجماعِ امت کو "تلمودی ادب" کی دَین اور طریقۂ یہود کہہ کر اس کی حیثیت کو ختم کیا، ائمہ اربعہ اور سلفِ صالحین کی نصوص فہمی، ان کی تفہیم، توضیح کو وحی ربانی کے گرد تعبیراتِ انسانی کا آہنی حصار کہہ کر مسترد کیا، متواترات اور دینی مسلمات پر عمل کو فکری گمراہی اور زوالِ امت کا اساسی سبب قرار دیا۔

قرآن کریم کا تو صاف طور پر انکار نہیں کیا؛ البتہ جو آیات ان کی ملحدانہ افکار کی اشاعت میں رکاوٹ بن سکتی تھیں انھیں قرنِ اول کے ساتھ مختص کر دیا، چنانچہ تقسیمِ میراث کا مشہور ضابطہ (**للذّکر مثل حظّ الانثیین**) کہ لڑکے کو لڑکی کا دو گنا ملے گا، چونکہ یہ مغرب کے مشہور نعرے: مساوات مرد وزن کے خلاف تھا، تو اس آیت کو یہ کہہ کر نا قابلِ عمل قرار دیا کہ یہ حکم اس زمانہ کے ساتھ خاص تھا۔

راشد شاذ کی ایک بڑی گمراہی اجماع امت کی حجیت کا انکار ہے، وہ اجماع کو دین اسلام کا ماخذ ماننے کے منکر ہیں، انہوں نے اجماع کو حجت قرار دینے والوں پر استہزاء اور تمسخر کیا ہے اور فقہاء امت پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ انہوں نے (نعوذ باللہ) اجماع کو اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے خوب استعمال کیا اور علماء نے اجماع کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے، راشد شاذ صاحب نے اجماع کی حجیت کا صرف انکار نہیں کیا؛ بلکہ اس کی حجیت کو منفی رخ دینے کی کوشش کی ہے اور اپنے ناقص زعم کے مطابق اجماع کی حجیت کے مفروضہ نقصانات بھی گنوائے ہیں۔ ذیل میں اجماع کے سلسلے میں ان کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''عملی طور پر فقہاء نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے اجماع کا خوب خوب سہارا لیا''

''عہدِ شافعی سے ہمارے عہد تک اجماع علماء کے ہاتھوں میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتا رہا''

''اجماع کو دلیل کے طور پر پیش کرنے سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ امت میں مختلف ادوار میں جن التباساتِ فکری کو داخلہ مل گیا تھا اور جن اجنبی افکار کے سلسلے میں رفتہ رفتہ مانوسیت کا احساس پیدا ہو چلا تھا، اُن کے بارے میں تنقیدی اور تحقیقی نقطہءِ نظر پیدا نہ ہو سکا، مثال کے طور پر وہ تمام التباسات جو روایتوں کے ذریعے مفسرین کے قرآنی حاشیوں میں جگہ پانے میں کامیاب ہو گئے تھے، اس کے بوجھ سے امت اب تک نجات حاصل نہ کر سکی ؛ بلکہ ہر آنے والا نیا دن اس مفروضہ اجماع اور قبول پر ایک دن طویل کرتا جاتا تھا اور اس طرح اجماع کی ہیبت ہمارے تقلیدی ذہن پر گہری ہوتی جاتی تھی''۔

مذکورہ اقتباسات میں راشد شاز صاحب ''تمام التباسات'' اور'' مفروضہ اجماع'' کے الفاظ سے کیا کہنا چاہتے ہیں، اسے اجماع کی مثال کے طور پر ذکر کرنا قابلِ تنقیح ہے؛ لیکن سطور بالا میں اجماع کا انکار اور استہزاء صاف ظاہر ہے۔

اجماع کی حجیت کا انکار کرنے کے بعد ان کے لیے شریعتِ اسلام کے اُن متفق علیہ مسائل کا انکار کرنا آسان ہو گیا جن کا ثبوت ان کے گمان کے مطابق صرف اجماع سے ہے، مثلاً: زانی محصن کے لیے رجم کی سزا، ایک مجلس میں تین طلاق کا وقوع ، وغیرہ وغیرہ، حالانکہ اہل السنۃ والجماعۃ کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ اجماعِ امت حجت ہے، پوری امت کسی بات پر متفق ہو جائے، تو دین میں اس کا اعتبار ہے، اجماع کی حجیت قرآن کریم کی اس آیت سے ثابت ہے : **وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعدِ مَا تَبَيَّنَ لَه الهُدىٰ و يَتَّبِع غَيرَ سَبِيلِ المُؤمِنِينَ نُوَلِّه مَا تَوَلّٰى وَ نُصلِه جَهَنَّمَ وسَاءَت مَصِيراً** (سورۂ نساء، آیت:۱۱۵) ''جو شخص رسول کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس کے لیے

امرِحق ظاہر ہو چکا ہو اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے پر ہو لے، تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے''۔

حضرت امام شافعیؒ نے اپنی کتاب ''الرّسالة'' میں اس آیت سے اجماع کی حجیت پر استدلال کیا ہے۔ اسی طرح اجماعِ امت کا حجت ہونا بہت سی احادیث سے ثابت ہے، مثلاً: حدیث میں ہے: **'' لا يَجمَعُ اللّٰهُ هذه الأمةَ على الضَّلَالة أبداً، وقال: يَدُ اللّٰه على الجَمَاعة، فاتَّبِعُوا السَّوَادَ الأعظم ، فإنَّه مَن شَذَّ شذ في النار'' (التّرمذي، رقم: ٢١٦٦)** ''اللہ تعالیٰ اس امت کو گمراہی پر کبھی بھی جمع نہیں ہونے دیں گے (معلوم ہوا کہ صرف صحابہ کا اجماع حجت نہیں ہے؛ بلکہ قیامت تک امت کا اجماع حجت ہے) اور ارشاد فرمایا: اللہ کا ہاتھ (تایید ونصرت) جماعت پر ہے، پس امت کی اکثریت کا اتباع کرو، پس جو امت کی اکثریت سے علیحدہ ہوا، وہ دوزخ میں اکیلا ہوگا''۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی بات پر امت کا اجماع ہو گیا، امت متفق ہوگئی، تو یہ عند اللہ اس چیز کے حق ہونے کی دلیل ہے۔

اس کے علاوہ راشد شاز صاحب نے بہت سے ایسے مسلمہ اور متفقہ عقائد کا انکار کیا ہے جن کا منکر فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں کافر یا بدعتی ہے، مثلاً: نزول عیسیٰ علیہ السلام، ظہورِ مہدی، خروج دجال وغیرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''قرآن مجید اور صحیح حدیث کی اس واضح تصریح کے بعد اُن روایات کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے، جن میں امت کے زوال، خلافت کا خاتمہ، مسیح موعود کی آمد، مہدی کا ظہور، دجال کا ورود وغیرہ واقعات کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ ان روایات کو بلا چوں و چرا کسی تاریخی اور نظری تنقید کے بغیر قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک بار پھر خود کو جبری تاریخ کے حصار میں گھرا پائیں، جہاں سے نکلنے کا راستہ اس وقت تک مسدود ہو، جب تک کہ ندائے غیب خود یہ اعلان نہ کر دے کہ ہوشیار! تاریخ اب آگے بڑھنا چاہتی ہے۔''
>
> (ادراک زوال امت: ۱؍۴۴، مسئلے کی بازیافت)

ایک اور جگہ لکھا ہے: ''مہدی آخر الزمان کی آمد ہو یا مسیح موعود کے ظہور کا مسئلہ، امام غائب کا انتظار ہو یا مستقبل کے مجدد کی تلاش، واقعہ یہ ہے کہ یہ تصورات ختمِ نبوت سے براہِ راست متصادم ہیں۔ آنے والا آچکا ہے، اب اس کے بعد کوئی نہ آئے گا، زمین کا آسمان سے رابطہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو چکا ہے، اب جو کچھ کرنا ہے، اسی امت کو کرنا ہے، جس کے لیے کتاب محفوظ کے حوالے سے ''انَّا لَه لَحَافِظُونَ'' کا وعدہ ہے اور بس''۔

(ادراک زوال امت: ۱/۳۵، مسئلے کی بازیافت)

حاصل یہ ہے راشد شاز صاحب نے اپنی کتابوں میں جگہ جگہ یہ غلط بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دین کو سمجھنے کے لیے صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین، فقہاء میں سے کسی کی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ ان لوگوں نے جو کوششیں کی ہیں، اُن کی وجہ سے سب سے زیادہ دین اسلام کو نقصان پہنچا ہے، ان کا دعوی یہ ہے کہ دین کو براہِ راست قرآن سے سمجھنا چاہیے، اسی وجہ سے انہوں نے دین فہمی کے لیے اسلاف کے سلسلے کو کاٹ دیا، اور نہایت جرءت اور بے باکی کے ساتھ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ دینی خدمات کا نہ صرف انکار کیا؛ بلکہ اس کو استہزاء اور تمسخر کے ساتھ غلط اور منفی رخ دینے کی کوشش کی ہے، حالانکہ صحابہ نے قرآن وحدیث تابعین کو سکھایا، تابعین نے تبع تابعین کو، اسی طرح دین سیکھنے کا یہ سلسلہ ہم تک پہنچا ہے۔

اسی طرح کے لوگوں کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

**أَلَاوَ انِّي قَدْ أُوتِيتُ الْكِتَابَ وَ مِثْلَه مَعَه ، أَلَا يُوشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلَى أَرِيكَتِه ، يَقُولُ: عَلَيْكُم بِهٰذَا الْقُرآن ، فَمَا وَجَدتُم فِيه مِن حَلَال، فَأَحِلُّوه، وَمَا وَجَدتُم فِيه مِن حَرَام فَحَرِّمُوه الخ .**

**(أبو داؤد، كتاب السنة ، بابٌ في لزوم السنة ، برقم: ٤٦٠٤)**

یعنی: سن لو! مجھے کتاب اللہ کے ساتھ مزید اس جیسا علم عطا ہوا ہے، ہوشیار رہو! عنقریب پیٹ بھرا شخص اپنے تخت پر بیٹھ کر یہ کہے گا کہ تم اس قرآن کو لازم پکڑو! جو تم اس میں حلال پاؤ، بس اسے حلال سمجھو اور جو تم اس میں حرام پاؤ، بس اسے ہی حرام جانو''۔

بہرحال! راشد شاز کا قرآن کریم سے براہِ راست اکتسابِ فیض جیسا خوشنما عنوان صرف ایک دھوکہ ہے، درپردہ احادیث اور مسلماتِ دین کا انکار کر کے مسلمانوں کو فکری اباحیت میں مبتلا کرنے اور مغربی ملحدانہ طرز زندگی کو مسلمانوں میں رائج کرنے کی مذموم کوشش ہے، یہ شخص اپنے عقائد اور نظریات کی بناء پر حد درجے گمراہ اور ملحد، ضال اور مضل ہے؛ بل کہ بعض عقائد کی اگر تاویل نہ کی جائے، تو اس کے دائرہ اسلام سے خارج ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے، ایسے مسلماتِ دین کے منکر اور ملحد شخص کا مسلم ادارے یا یونیورسٹی میں کسی شعبے کا ذمہ دار بننا افسوسناک ہے، نیز ایسے بدعقیدہ اور دین بیزار شخص کی راہنمائی میں ادیان کا مطالعہ کرنا سخت نقصان دہ ہے، لوگوں کے لیے ایسے شخص کی کتابوں کو پڑھنا یا اس کی تقریروں کو سننا ہرگز جائز نہیں ہے، ایسے شخص کی کتابوں کا ترجمہ کرنا، اس کے مشن میں شریک ہونے کی شریعت کی رو سے قطعاً اجازت نہیں ہے۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۰/ ۸/ ۱۴۳۶ھ، مطابق ۸/ ۶/ ۲۰۱۵ء

الجواب صحیح ابوالقاسم نعمانی غفرلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند ۲۱/ ۸/ ۳۶ھ

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام عفی عنہ

وقار علی غفرلہ، محمد اسد اللہ غفرلہٗ، محمد مصعب عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

(۱)

فتویٰ تیار ہونے کے بعد راشد شاز سے متعلق ''حدیثِ دوستاں'' نامی کتاب میں حضرت مولانا اعجاز احمد صاحبؒ کا تحریر کردہ ایک مفید مضمون دستیاب ہوا، جو حضرت مرحوم نے اُن کے ایک خط کے جواب کے طور پر تحریر کیا تھا، افادۂ عام کے لیے اسے شامل کیا جا رہا ہے۔

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

گرامی قدر جناب مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گذشتہ ایک سال کے اندر مجلّہ ''فیوچر اسلام'' نے عالمی سطح پر اپنی شناخت ایک ایسے رسالہ کی حیثیت سے مستحکم کر لی ہے۔ ==

== جہاں مشرق ومغرب کے اہل فکر مستقبل کے ایجنڈے کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔ابھی حال ہی میں اس سلسلۂ بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم نے امت مسلمہ کے مستقبل کے سلسلے میں ایک مذاکرہ منعقد کیا تھا جس میں مختلف حلقۂ فکر کے اصحاب علم ودانش نے اس بارے میں اپنی تجاویز پیش کیں کہ امت مسلمہ کی دوبارہ تنصیب امامت کے لیے کیا کچھ کیا جانا چاہیے۔آنے والے دنوں میں ہم مذاکرہ کی یہ مجلس دنیا کے مختلف دارالحکومتوں میں منعقد کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں؛ تاکہ اس ظلمت شب سے جہاں اہل زمین فی زمانہ جینے پر مجبور ہیں، ایک نئی صبح کے طلوع کی راہ ہموار ہوسکے۔

مجلّہ ''فیوچر اسلام'' چوں کہ بیک وقت اردو، عربی، اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے، جسے دنیا کے مختلف حصوں میں انٹرنیٹ پر لاکھوں قارئین پڑھتے ہیں، اور جسے ہم آنے والے دنوں میں ترکی، بنگالی اور دوسری بڑی زبانوں میں بھی شروع کرنا چاہتے ہیں، ہماری خواہش ہے کہ اس بین الاقوامی مباحثے میں آپ کی ضرور شرکت ہو۔آپ کو شاید یاد ہو کہ اس سے پہلے بھی ہم نے مجلّہ ''فیوچر اسلام'' کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا:

ہمارے زوال کی تلافی صرف اندرونی مسئلہ نہیں، آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے پوری انسانیت کا مستقبل ہم سے وابستہ ہے؛ اس لیے امت مسلمہ کے موجودہ انتشار اور اس کے فکری زوال کو نظر انداز کردینا دنیائے انسانیت کے لیے خطرناک مضمرات کا حامل ہوگا، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے زوال پر بحث و مباحثہ کا حوصلہ پیدا کریں، اپنی طویل تہذیبی تاریخ اور فکری انحرافات کا وحی کی روشنی میں سخت محاسبہ کریں، جو امت صدیوں سے فقہی طریقۂ فکر کی عادی ہے اور جس کے دل و دماغ کو علمائے متقدمین کی شخصیت نے مبہوت کر رکھا ہے، اس کے لیے یقیناً یہ آسان نہیں کہ وہ صدیوں پر مشتمل اپنے تہذیبی اور علمی سرمائے پر تنقیدی نظر ڈال سکے، جہاں قال فلان اور روی فلان پر معاملات فیصل کرنے کا رواج ہو، وہاں ہر مسئلہ پر وحی ربانی کی روشنی میں اپنے دل ودماغ کو متحرک کرنے کی دعوت خواہ کتنی معقول ہو، اجنبی ضرور لگے گی، ہوسکتا ہے بعض لوگوں کو اس پر تجدد پسندی کا گمان ہو؛ لیکن جو لوگ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے مقصد بعثت سے متعلق ارشاد سے واقف ہیں ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (سورۂ اعراف، آیت:۱۵۷) ان کے لیے اس نکتے کا ادراک مشکل نہیں کہ جس طرح قرآن مجید خدا اور بندے کے مابین کسی ''ربائیت'' یا ''پاپائیت'' کو قابل استرداد سمجھتا ہے۔ ==

== اسی طرح وہ مولویت کے ادارے کا بھی انکاری ہے، نہ تو تشریح و تعبیر پر کسی کی اجارہ داری ہے اور نہ ہی کسی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی کی صحیح العقیدگی پر شبہ وارد کرے، اہلِ ایمان کو تو چھوڑیئے، اللہ تعالیٰ نے تو حلقۂ اسلام سے باہر افراد کا فیصلہ بھی اپنے ہاتھوں میں محفوظ رکھا ہے۔ **إنّ اللّٰــه یفصل بینهم یوم القیامة .**

جیسا کہ ہم نے عرض کیا، دائرۂ وحی سے ہمارے باہر آ جانے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ہم خیر امت کے منصب جلیل سے معزول ہو گئے؛ بلکہ پوری انسانی تاریخ جس کی آخری لمحے تک ہمیں قیادت کرنی تھی، سخت بحران سے دو چار ہو گئی، تاریخ کے اس سب سے بڑے انحراف سے درستگی کے لیے لازم ہے کہ ہم ان اسباب پر ایمان دارانہ غور کریں، جس نے ہمیں انسانیت کی قیادت سے ہٹا کر تاریخ کے **Dustbin** میں ڈال دیا ہے، تاریخ کے اس بحران عظیم کی درستگی کے لیے اب کیا کیا جائے؟ اور اس کا آغاز کہاں سے ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب دینے کے لیے ہم نے طے کیا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر امت کے علماء و دانشوروں کا ایک مستقل فورم قائم کیا جائے، جہاں ایک نئی ابتداء کے لیے سنجیدہ غور و فکر کی طرح ڈالی جا سکے۔

اس سلسلے میں مزید تفصیلات انگریزی، عربی اور اردو زبانوں میں ہماری ویب سائٹ **www.futureislam.com** پر موجود ہے، جسے آپ راست انٹرنیٹ پر ملاحظہ کر سکتے ہیں انٹرنیٹ پر آپ کے مضامین کی اشاعت مذکورہ بحث کو آگے بڑھانے کے علاوہ آپ کی بیش قیمت تحریروں کو دنیا کے مختلف گوشوں میں ایسے قارئین فراہم کرے گی جن تک یقیناً آپ کی تحریر پہونچنے کی مستحق ہے، توقع ہے کہ آپ ہماری دعوت کو قبول کرتے ہوئے اس بنیادی مسئلہ پر اپنی تحریریں روانہ کریں گے کہ دنیا کی موجودہ بے سمتی کا ازالہ کیسے ہو سکتا ہے، امت مسلمہ کے موجود زوال کو کیسے روکا جا سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امت مسلمہ کی دوبارہ تنصیب امامت کیسے ہو سکتی ہے؟ ضروری نہیں ہے کہ آپ ہمارے تجزیے سے اتفاق رکھتے ہوں، اور نہ ہی ہم اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ اس سوال کے مختلف جوابات میں یکسانیت ہوگی؛ البتہ ہم چاہتے ہیں کہ اس سوال کے ہر ممکنہ جواب کو سنجیدہ غور و فکر کا مستحق سمجھا جائے۔ آپ کے فی الفور جواب کا انتظار رہے گا۔

والسلام

راشد شاز، مدیر فیوچر اسلام ڈاٹ کام ==

..............................................................................

== بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

**الحمد للّٰہ ربّ العالمین، والصّلاۃ والسّلام علیٰ خاتم النّبیّین و آلہٖ وأصحابہٖ أجمعین أمّا بعد!**

گرامی قدر جناب راشد شاز صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

آپ کا مطبوعہ مکتوب ملا، اسے پڑھ کر میں نے سمجھنے کی کوشش کی؛ مگر مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نہ مجھے یہ سمجھ میں آیا کہ آپ کی دعوت کا کیا مقصد ہے؟ اور نہ یہ سمجھ میں آیا کہ اس کے لیے آپ نے کیا طریقۂ کار اختیار کیا ہے؟ آپ شاید تعجب کریں کہ اتنی بلید اور موٹی سمجھ والے کو آپ نے کیوں مخاطب کیا؟ تو آپ کا تعجب حق بہ جانب ہے، میں بھی حیرت میں ہوں کہ میرے پاس یہ چیستاں اور معمہ کیوں بھیجا گیا؟

آپ کے مکتوب کا اجمالی جواب تو میں نے لکھ دیا؛ لیکن تھوڑی سی اپنی ناسمجھی کی تشریح بھی پیش خدمت کرنا چاہتا ہوں؛ تاکہ میرا ناقابلِ التفات ہونا پختہ ہوجائے۔

آپ نے جس زبان میں خط لکھا ہے، اس سے مجھے مناسبت نہیں، میں نے ابتداء عمر سے قرآن و حدیث کی زبان پڑھی ہے، اور وہی زبان سمجھتا ہوں، آپ کے خط کے وہ الفاظ وکلمات جو مجھے بنیادی اور مرکزی معلوم ہوئے انہیں میں نے قرآن وحدیث کے الفاظ ومفاہیم کی روشنی میں دیکھنا چاہا، تو وہ مجھے نہیں ملے، حالاں کہ آپ نے خط میں قرآن کے ایک دو جملوں کا حوالہ بھی دیا ہے؛ مگر ان کی روشنی میں بھی آپ کے مدعا پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

یہاں میں ان بنیادی الفاظ کو نوٹ کیے دیتا ہوں:

{۱} مستقبل کا ایجنڈا {۲} امت مسلمہ کا مستقبل {۳} تنصیب امامت۔

{۴} بین الاقوامی مباحثہ {۵} آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے پوری انسانیت کا مستقبل ہم سے وابستہ ہے۔

{۶} جو امت صدیوں سے فقہی طریقہ فکر کی عادی ہے۔ {۷} کسی ربّائیت وپاپائیت کو قابل استرداد سمجھتا ہے، اسی طرح مولویت کے ادارے کا بھی انکاری ہے۔ ==

== {۸} نہ تو تشریح وتعبیر پر کسی کی اجارہ داری ہے۔

{۹} اہلِ ایمان کو تو چھوڑیئے اللہ تعالیٰ نے حلقۂ اسلام سے باہر افراد کا فیصلہ بھی اپنے ہاتھوں میں محفوظ رکھا ہے۔

{۱۰} ہم خیر امت کے منصب جلیل سے معزول ہوگئے ۔

{۱۱} پوری انسانی تاریخ جس کی آخری لمحے تک ہمیں قیادت کرنی تھی۔

{۱۲} دوبارہ تنصیب امامت وغیرہ۔

مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان الفاظ سے آپ نے کیا سمجھانا چاہا ہے، ''مستقبل'' کیا چیز ہے؟ ہمارے زمانے کے بعد سے قیامت آنے تک کے زمانے کو آپ نے مستقبل قرار دیا ہے یا دنیا کے بعد والی زندگی کو مستقبل کہا ہے؟ بہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے موجودہ زمانے کے بعد سے قیامت آنے تک کے زمانے کو مستقبل کہا ہے، تو اس کا ایجنڈا کیا ہے؟ ساری دنیا پر امت مسلمہ کا سیاسی غلبہ؟ اقتصادی غلبہ؟ یا علمی غلبہ؟ فکری اور تہذیبی وغیرہ صرف خوش نما الفاظ ہیں، جن کا کوئی مفہوم شاید اب تک متعین نہیں ہوسکا، یا اس سے مراد تدین وتقویٰ، صداقت وامانت اور اخلاق حمیدہ میں امامت ہے ۔

پوری دنیا پر سیاسی غلبہ اور اس اعتبار سے امت کی امامت کے وعدے سے قرآن وحدیث کے صفحات خاموش ہیں، اور ایسا کبھی تاریخ میں بھی نہیں ہوا؛ اس لیے پوری دنیا پر سیاسی امامت وغلبہ کا خواب دیکھنا، یا اس میں سر کھپانا ایک فضول کام ہے، ہاں جہاں جہاں مسلمانوں کی حکمرانی ہے، انہیں خالص مسلمان بننے، اسلامی قانون کو نافذ کرنے اور یہود ونصاریٰ کی تقلید، ان کے رعب وتسلط اور ان کے خوف ودہشت سے آزاد ہونے کی دعوت دی جانی چاہیے؛ لیکن آپ نے اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا ہے۔

اور اگر امامت سے مراد اقتصادی غلبہ ہے؛ تو یہ چیز مطلوب کیا ہوتی؟ قرآن وحدیث کی تصریحات کے مطابق تو حرص مال سخت خطرناک ہے، اور فی زمانہ اقتصادی غلبہ مال کی بے تحاشا حرص وہوس کے بغیر ممکن نہیں، انفرادی سطح پر یا اجتماعی سطح پر اصحاب ثروت کون ہیں؟ یہود ونصاریٰ اور ان کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ یہ دونوں قومیں مال وجاہ کی جوع البقر میں مبتلا ہیں، اس لیے ہرنا کردنی ان کے یہاں رَوا ہے، تو کیا آپ اسی راہ پر امت کو ڈالنا چاہتے ہیں؟

اور اگر امامت سے مراد علمی امامت ہے، تو آج کل جسے علم کہا جاتا ہے، وہ دنیاوی علوم وفنون ہیں، مثلاً سائنس اور اس کی مختلف شاخیں، ڈاکٹری وغیرہ، ان علوم کا تعلق صرف دنیا کی زندگی تک ہے۔ ==

== موت کے بعد یہ سب علوم جہالت کے خانے میں چلے جاتے ہیں ان میں امامت مفید تو ہے؛ مگر امت اسلامیہ کے مقاصد میں نہیں ہے۔

اور دوسری چیز جو حقیقۃً علم ہے، مگر آج کی خدا فراموش اور آخرت سے غافل دنیا اسے علم ماننے کے لیے تیار نہیں ہے، وہ علم آخرت ہے، اس میں بحمد اللہ آج بھی امامت امت مسلمہ ہی کو حاصل ہے، کوئی اقتداء کرے یا نہ کرے۔

تدین وتقویٰ، صداقت وامانت اور اخلاق حمیدہ میں امامت البتہ مطلوب ہے؛ مگر وہ نہ عالمی مجلس مذاکرہ سے حاصل ہوگی، نہ بین الاقوامی مباحثہ سے؛ لیکن آپ کے یہاں اس کا اشارہ بھی نہیں ہے۔

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، فکری، تہذیبی وغیرہ محض الفاظ ہی الفاظ ہیں، بے معنی الفاظ؛ اس لیے وہ درخورِ اعتناء نہیں۔ ''بین الاقوامی مباحثہ'' میں کیا دنیا کی ہر قوم شریک ہوگی؟ اگر ایسا ہے تو اس کا امت مسلمہ سے کیا تعلق؟ وہ تو کفر وشرک کا مجموعی سنڈاس بن کر رہ جائے گا۔

''پوری انسانیت کا مستقبل ہم سے وابستہ ہے'' الفاظ تو بہت خوش نما ہیں؛ مگر آپ ہی بتائیں کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ کس اعتبار سے مستقبل وابستہ ہے؟ اور کون سا مستقبل؟ اس وابستگی کی خبر کس نے دی، اللہ نے، رسول نے یا آپ نے؟

''جو امت صدیوں سے فقہی طریقۂ فکر کی عادی ہے'' کیوں صاحب فقہی طریقۂ فکر کا عادی ہونا کوئی جرم ہے، آخر علم فقہ قرآن وحدیث اور سنت نبوی ہی کی صراحتوں، اشاروں سے ماخوذ ومستنبط ہے، فقہی طریق فکر ترجمان ہے قرآن وسنت کا، کیا آپ فقہی طریقۂ فکر سے بغاوت کی دعوت دے کر امت کو قرآن وسنت سے بغاوت کی دعوت نہیں دے رہے ہیں؟ اگر آپ کہیں کہ:

''ہم وحی ربانی کی روشنی میں اپنے دل ودماغ کو متحرک کرنے کی دعوت'' دے رہے ہیں، تو معاف کیجئے گا یہ امت کو فریب دینا ہے، آپ درحقیقت یہ کہنا چاہتے ہیں، کہ وحی ربّانی کی روشنی میں علمائے اسلاف نے جو طریقۂ فکر متعین کیا ہے اس سے بغاوت کر کے اس طریقۂ فکر پر آجاؤ، جو ہمارے دل ودماغ کی پیداوار ہے، جس کو اسلاف کے طریقۂ فکر سے بچایا گیا ہے، یہ دعوت وحی ربانی کی طرف نہیں ہے، اس انسانی فکر وفہم کی طرف ہے، جو مغربیت کی چکاچوند اور دنیا پرستی کے شوروغوغا سے مرعوب ہو کر قرآنی تعلیمات اور اسلامی احکام کو بوجھ محسوس کر رہی ہے، اور اسے کسی بہانے سے اتار پھینکنا چاہتی ہے۔ ==

== یاد رکھیے! اسلاف کے فقہی طریقۂ فکر سے آزاد ہوکر اپنے دل و دماغ کو متحرک کیجئے گا، تو وہ کچھ اور ہی مذہب ہوگا، اسلام نہ ہوگا۔ اور اس مذہب کی امامت سے جو اسلام نہ ہو ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

''جس طرح قرآن مجید خدا اور بندے کے درمیان کسی ربّائیت و پاپائیت کو قابل استرداد سمجھتا ہے، اسی طرح مولویت کے ادارے کا بھی انکاری ہے''۔

بے شک قرآن کریم نے یہودیوں کی احبار پرستی اور عیسائیوں کی رہبان پرستی کا انکار کیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے: **اتّخذوا أحبارهم ورهبانهم أربابًا من دون الله**، انہوں نے اللہ کے مدمقابل اپنے علماء اور اپنے درویشوں کو رب بنالیا تھا، اس میں **من دون الله** کا لفظ بہت اہم ہے، جب کسی بندے کے لیے خدائی اختیارات مان لیے جائیں تو یہ کفر و شرک ہے؛ لیکن اگر علماء نے اللہ کے بندے بن کر اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہوئے اللہ کے کلام کو سمجھنے کی پوری کوشش کی اور اسی میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کیں، اپنی عمر اسی میں کھپائی، پھر پیروی کرنے والوں نے بھی انہیں خدا نہیں قرار دیا، بندہ ہی مانا؛ البتہ اپنے سے زیادہ واقف کار سمجھ کر ان کے علم و فہم پر اعتماد کیا اور ان کی پیروی کی تو قرآن اس کا انکاری کب ہے؟ وہ تو کہتا ہے: **فاسئلوا أهل الذّكر إن كنتم لا تعلمون.** علم والوں سے پوچھو، اگر تمہیں علم نہیں اور فرمایا: **واتّبع سبيل من أناب إليّ.** اس شخص کی پیروی کرو جس نے میری طرف انابت اختیار کی۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ مخلص اور متدین علماء کی پیروی کی جائے، اگر اللہ اور بندے کے درمیان اس واسطہ کو آپ پاپائیت سمجھتے ہیں تو یہ وہم ہے، اسے دور کیجئے۔

یہود و نصاریٰ تو مجموعی طور پر احبار و رہبان کو **أربابًا من دون الله** بنانے میں مبتلا ہو گئے تھے؛ لیکن امت مسلمہ اجتماعی اعتبار سے اس بیماری سے بحمد اللہ پہلے بھی محفوظ تھی، اور اب بھی محفوظ ہے، کچھ گمراہ لوگ اگر اس بیماری میں مبتلا ہوئے ہوں تو علماء نے اسے رد کر دیا ہے، اس کی وجہ سے پوری امت کو اس کا مریض نہیں قرار دیا جا سکتا۔

''پاپائیت'' اور ''مولویت'' کو ایک جیسا ادارہ قرار دینا علم و عقل سے تہی دامنی کی دلیل ہے، بحمد اللہ اس امت نے مولویوں کو قرآن و حدیث کا عالم تو مانا ہے، خدا نہیں مانا ہے، اس کے لیے ثبوت درکار ہے کہ قرآن مولویت کے ادارے کا انکاری ہے، یہ قرآن پر غلط الزام ہے، بے جا تہمت ہے۔ ==

== ''نہ تو تشریح وتعبیر پر کسی کی اجارہ داری ہے''یعنی قرآن کی تشریح وتعبیر پر کسی کی اجارہ داری نہیں، یہ جملہ بیسویں صدی میں ایجاد ہوا ہے، اور اس کو قرآن وحدیث کو بوجھ سمجھنے والوں نے اتنی مرتبہ دہرایا ہے کہ اب ان لوگوں کے لیے ضرب المثل یا سکہ رائج الوقت بن گیا ہے، جو قرآن کی اور دین کی من مانی تشریح کرنا چاہتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ دین اسلام کو اسی طرح مسخ کردیں کہ جیسا مغربیت زدہ ذہنیتوں نے اپنی صورتوں، سیرتوں اور طور وطریق کو بگاڑ لیا ہے کہ دیکھنے میں کہیں اسلام کا اثر اور نشان نظر نہ آئے؛ لیکن مسلمان ہونے کے مدعی رہیں، اسی طرح اسلام کی ایسی تعبیر وتشریح کی جائے کہ دورِ صحابہ کے اسلام کا کوئی نشان باقی نہ رہے، اور دعویٰ کیے جائیں کہ یہ اسلام ہے؛ بلکہ یہی اسلام ہے۔

''اجارہ داری'' ایک بھونڈے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اور اس سے علماء اسلام کی توہین ظاہر ہو رہی ہے، ورنہ مطلب یہ ہے کہ علماء نے قرآن وحدیث کی جو تشریح کی ہے اور احکام اسلام کی جس طرح تعبیر کی ہم اس کے پابند نہیں، ہم خود بھی جیسے چاہیں تشریح کرسکتے ہیں، اور تعبیر کرسکتے ہیں اور امت کو چاہئے کہ ہماری تشریح وتعبیر ...........خواہ علماء کے خلاف ہی ہو...........قبول کرلے۔

لیکن اللہ کے بندوں سے کوئی پوچھے کہ کسی اور فن کی تعبیر وتشریح کی اجازت آپ ہر شخص کو دے سکتے ہیں؟ قانون کی تشریح ایک ڈاکٹر کرسکتا ہے،؟ میڈیکل سائنس کی تعبیر وتشریح ایک قانون داں وکیل یا جج کرسکتا ہے؟ سائنسی ایجادات میں کامرس کے محققین دخل دے سکتے ہیں؟ اس زمانے میں یہ تو قاعدہ مسلم ہے کہ ہر فن میں صاحب اختصاص (اسپیشلسٹ) ہونا چاہیے، ایک کے دائرے میں دوسرا دخل نہیں دے سکتا، پھر یہ کیا مذاق ہے کہ دین اسلام اور وحی الٰہی کی تشریح وتعبیر کا حق ہر شخص کو ہو، کیا اس میں صاحب اختصاص کی ضرورت نہیں ہے؟ یہ لوگ جو دنیاوی فنون کے حلقے میں نہایت صاحب عقل ہوتے ہیں، قرآن اور دین کے باب میں زبان کھولتے، اور قلم اٹھاتے ہیں، تو عقل کے دشمن ہوتے ہیں، اور یہی لوگ معزول شدہ امت کو امامت کے منصب پر دوبارہ فائز کریں گے۔ إنّا للّٰه وإنّا إليه راجعون.

شاز صاحب! معاف کیجئے گا، میرا لہجہ گرم ہوگیا؛ مگر کیا کروں کہ ان بے تکی باتوں پر غیرت کو تاب نہیں رہتی، علمائے امت کا وقار گرا کر اور قرآن کی من مانی تعبیر وتشریح کرکے امت کو امامت کے منصب پر نہیں دنیا و آخرت کے خسران میں ڈھکیل دیں گے۔

آپ نے لکھا ہے: ''اہل ایمان کو تو چھوڑیئے اللہ تعالیٰ نے حلقہ اسلام سے باہر افراد کا فیصلہ بھی اپنے ہاتھوں میں محفوظ رکھا ہے'' اس ارشاد پر غور کر رہا ہوں تو حیرت بھی ہوتی ہے اور عبرت بھی! ==

== آپ کا منشاء شاید یہ ہے کہ قیامت کے آنے سے پہلے کسی آدمی کے صحیح العقیدہ ہونے یا بدعقیدہ ہونے کا فیصلہ تو در کنار، اس کے صحیح العقیدگی پر شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ آپ نے لکھا:

''اور نہ ہی کسی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی کی صحیح العقیدگی پر شبہ وارد کر سکے''۔

یعنی کسی کا عقیدہ خواہ کچھ بھی ہو، وہ قرآن کی تعبیر وتشریح کے نام پر کچھ بھی کہتا ہو، کچھ بھی نظریہ رکھتا ہو، اس کی خوش عقیدگی پر شبہ نہیں وارد کیا جا سکتا ہے؛ کیوں کہ اللہ نے فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور وہ قیامت کے دن فیصلہ کرے گا، آپ نے حوالہ بھی دیا ہے: **إنّ اللّٰہ یفصل بینھم یوم القیامۃ** .

چلئے چھٹی ہوئی، آپ نے قرآن کے اس جملہ سے جو مطلب اخذ کیا، اور جو تشریح آپ کرنی چاہتے ہیں اس کی رو سے حق و باطل کا فیصلہ دنیا میں ہو ہی نہیں سکتا، قیامت پر یہ فیصلہ اٹھ گیا ہے، اب کس منہ سے کسی کو کوئی گمراہ اور بدعقیدہ کہے۔

تو پھر ماضی کے ایک گمراہ شخص (نیاز فتح پوری (م: ۱۹٦٦ء) ایڈیٹر نگار) کی طرح یہی کیوں نہیں کہہ دیا جاتا کہ اس وقت جو لوگ دنیا کی قیادت کر رہے ہیں وہی حق پر ہیں، یا کم از کم یہ کہ انہیں گمراہ نہیں کہا جا سکتا، خواہ وہ یہود ونصاریٰ ہوں یا ہنود و بت پرست۔

قرآن کی ایسی ہی تعبیر وتشریح ہوگی، تو قرآن کا اور اسلام کا تو کچھ نہ بگڑے گا، اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ کر رہے ہیں؛ لیکن اس طرح کی تعبیر وتشریح کرنے والے کہاں جائیں گے؟ اس پر غور کر لینا چاہیے۔

اللہ ہی جانتا ہے کہ دائرۂ وحی سے کون باہر آ گیا؟ وہ لوگ جو اس خط کے ذریعے دائرۂ وحی میں واپس آنے کی دعوت دے رہے ہیں، یا اس کے مخاطب اہل اسلام؟

خط کی تحریر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ داعی حضرات ہی کچھ باہر نکلے ہوئے ہیں۔

آپ نے طے کیا ہے بین الاقوامی سطح پر امت کے علماء و دانشوروں کا ایک مستقل فورم قائم کیا جائے، جہاں ایک نئی ابتداء کے لیے سنجیدہ غور وفکر کی بنیاد ڈالی جا سکے۔

یہ نئی ابتداء کیا ہوگی؟ کیا سنت ہوگی؟ تب تو وہ بہت پرانی ہے، کیا بدعت ہوگی، تب تو وہ قابل رد ہے۔

آپ کی یہ کوشش اگر اسے اہمیت دی جائے تو امت میں ایک انتشار کا پیش خیمہ ہوگی، اس سے زوال کی رفتار مزید بڑھے گی، امت کے لیے یہ نئی نئی راہیں مت کھولیے؛ البتہ اگر اسے اہمیت نہ دی گئی تو فنا ہو کر رہ جائے گی۔ ==

== امت مسلمہ کی ترقی اور بہبود کے لیے وہی راستہ اور طریقہ متعین ہے، جسے رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے، یعنی ما أنا علیہ و أصحابي وہ طریقہ جس پر میں ہوں، اور جس پر میرے صحابہ ہیں، اس معیار سے جو قریب تر ہو اور جس طریقے میں صحابۂ کرام کے مزاج وطبیعت کی خوشبو زیادہ ہو، وہی راستہ حق کے قریب ہے، اس کے لیے کسی فورم کی ضرورت نہیں، صحیح تربیت کی ضرورت ہے، اپنی زندگی میں اسی اسلام کو نافذ کرنے کی ضرورت ہے، جو حضراتِ صحابہ کی زندگیوں میں تھا، وہی اسلام حق ہے۔ **فما ذا بعد الحقّ إلاّ الضّلال**

شاز صاحب! میں نے اپنی ناسمجھی کی تفصیل لکھ دی، یقیناً آپ کو گرانی ہوئی ہوگی؛ لیکن جس طرح کی باتیں آپ نے ہمیں سنائی ہیں، اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ بھی سننے کا حوصلہ پیدا کریں۔

اب سنئے کہ آپ کے خط کو پڑھ کر مجھے جو الجھن ہوئی وہ تو ہوئی، میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ ہم لوگوں کا ایمان کیا اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ لوگ اس طرح کے باغیانہ خیالات کا مخاطب ہم لوگوں کو بنانے کا حوصلہ کرنے لگے ہیں، ہم نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اور سلف سے خلف تک اجتماعی طور پر دین کو ایمان کو طریق رسول اللہ ﷺ کو دستورِ صحابہ کو جو کچھ پایا ہے یہ راگنی اس سے بالکل الگ اور بے جوڑ ہے، اسے بھی اگرچہ اسلام اور قرآن کے نام پر پیش کیا جارہا ہے؛ لیکن اسے اصل اسلام اور قرآن سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ ان خود ساختہ خیالات کے پھندے سے نکلئے، اور قرآن وسنت کی جو تشریح بالاتفاق چلی آرہی ہے، اس سے انحراف مت کیجئے، فروعی اختلاف کوئی مضر چیز نہیں ہے اصول میں کوئی اختلاف نہیں ہے، **ما أنا علیہ و أصحابي** کو خلوص دل سے مضبوط پکڑ یئے۔

خدا کے حضور اپنا مصنوعی اسلام لے کر نہ جایئے، وہ قبول نہ ہوگا، وہی اسلام قبول ہوگا، جو امت میں اجماعی طور پر مقبول رہا ہے۔

ان نئی نئی تشریحات وتعبیرات سے ممکن ہے دولت کے انبار سے آپ مستفید ہوں، خواہشات کی آزادی میں آپ کو لطف آئے؛ لیکن نہ یہ دولت کام آئے گی، اور نہ شہرت باعث نجات بنے گی، نہ خواہشات کی لذتیں باقی رہیں گی، اللہ سے ڈریئے، اور صراط مستقیم پر قائم رہئے۔

﴿رَبَّنَا اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ . رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ . رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾

(سورۂ آل عمران، آیت: ۱۹۲-۱۹۴) ==

== ترجمہ: اے ہمارے رب! جسے آپ نے جہنم میں ڈال دیا، اسے آپ نے ذلیل وخوار کر دیا اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے۔ اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا، وہ ایمان کی صدا لگا رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب! تو ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی مغفرت فرما دیجئے، اور ہم سے ہماری برائیوں کو محو کر دیجئے اور نیکوں کی معیت میں ہمیں وفات دیجئے۔ اے ہمارے رب! اور ہمیں وہ بات عطا فرمائیے جس کا آپ نے ہم سے اپنے رسولوں کی زبان پر وعدہ فرمایا ہے، اور ہم کو بہ روز قیامت رُسوا نہ فرمائیے، بلاشبہ آپ وعدہ کے خلاف نہیں کرتے۔

# یوگا کی شرعی حیثیت

مکرمی ومحترمی زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خدا کرے مزاج گرامی بہ عافیت ہو !

**سوال:** ﴿۱۵﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں؟

اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے، اللہ تعالیٰ کو واحد و یکتا ماننا، اللہ تعالیٰ کی صفات میں کسی اور کو شریک نہ سمجھنا اور جو افعال عبادت کے طور پر انجام دیئے جاتے ہیں، اُن کو اللہ ہی کے لیے خالص رکھنا، یہ ساری باتیں عقیدۂ توحید میں شامل ہیں، مخلوق خواہ اپنے حجم، نافعیت اور تأثیر کے اعتبار سے کتنی بھی بڑی نظر آئے، وہ معبود نہیں ہوسکتی، وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی اور انسان کے لیے اپنے حقیقی خالق و مالک کے پہچاننے کا ذریعہ ہے، اس سلسلہ میں مسلمان ہرگز کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتا؛ بلکہ اگر وہ ایسا کرے تو وہ مسلمان ہی باقی نہیں رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں اپنی جو بے شمار نشانیاں رکھی ہیں، ان میں ایک سورج بھی ہے، جو ہمارے لیے روشنی کا خزانہ ہے، جس کی گردش سے موسموں کی تبدیلی، تاریخوں کی تعیین اور جس کی شعاؤں سے ہمارے ماحول کی حفاظت متعلق ہے؛ اسی لیے قرآن مجید میں بار بار اللہ کی ایک نعمت کی حیثیت سے اس کا ذکر کیا گیا ہے؛ لیکن اس بات کو بھی واضح فرما دیا گیا ہے کہ وہ بہرحال عبادت کے لائق نہیں، عبادت تو اسی ذات کی کی جائے گی، جس نے سورج کو اور اس پوری کائنات کو پیدا کیا ہے، قرآن مجید میں سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ موجود ہے، جس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ ان کی قوم بتوں کے ساتھ ساتھ سورج، چاند اور ستاروں کی بھی پرستش کیا کرتی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو اس سے باز آنے کی دعوت دی اور فرمایا کہ جو چیز نکل کر ڈوب جاتی ہو، جس کو دوام واستمرار اور بقاء وقرار حاصل نہ ہو، وہ خدا کیسے ہوسکتی ہے؟ چوں کہ جزیرۃ العرب کے گرد و پیش آفتاب پرست قومیں بھی موجود تھیں؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درجہ احتیاط برتی کہ سورج کے طلوع ہونے،

سورج کے نصف آسمان پر ہونے اور سورج کے غروب ہونے کے وقت نماز پڑھنے سے بھی منع فرما دیا؛ کیوں کہ سورج کی پرستار قومیں عام طور پر انہیں اوقات میں سورج کی پوجا کیا کرتی ہیں؛ اس لیے یہ بات ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے کوئی بھی ایسا عمل قابل قبول نہیں ہے، جس میں سورج کے معبود ہونے کا شبہ ہو اور اس کے ساتھ پوجا یا اس کے مماثل عمل کیا جائے۔

ہمارا ملک ہندوستان مختلف مذاہب اور ثقافتوں کا گلدستہ ہے؛ اسی لیے اس کی بنیاد سیکولرزم پر رکھی گئی ہے، جس میں عوام کو نجی طور سے اپنے اپنے مذاہب پر عمل کرنے کی اجازت ہے؛ لیکن حکومت کسی خاص مذہب کی نمائندہ نہیں ہوسکتی، وہ سرکاری اداروں میں کسی ایسے طریقے کو رواج نہیں دے سکتی، جو کسی ایک گروہ کے مذہبی فکر و عمل کو ظاہر کرتی ہو، اسی طرح وہ کسی ایک گروہ کی ثقافت کو تمام لوگوں پر مسلط نہیں کرسکتی، اسی اصول پر قائم رہنے میں اس ملک کا وقار، اس کی سلامتی اور مختلف طبقوں کے درمیان ہم آہنگی موقوف ہے۔

افسوس کہ ماضی میں جب سے فرقہ پرست طاقتیں بام اقتدار پر پہنچی ہیں، انہوں نے کوشش شروع کردی ہے کہ ایک خاص مذہب اور تہذیب کو پورے ملک پر مسلّط کردیا جائے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی ''یوگا'' اور ''سوریہ نمسکار'' ہے، سوریہ نمسکار کا اسلامی نقطۂ نظر سے غلط اور ناقابلِ قبول ہونا بالکل واضح ہے؛ لیکن جو قومیں دوسری قوموں کو اپنے اندر جذب کر لینے کا مزاج رکھتی ہیں، ان کا ایک پر فریب طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کو کسی عام قسم کے عمل میں شامل کر کے پیش کرتی ہیں؛ تاکہ جو لوگ اس کے قائل نہ ہوں وہ بھی اس کو قبول کرلیں، ہندوستان میں برہمنوں کے اس طریقۂ کار کی ایک تاریخ رہی ہے، اہلِ نظر کا خیال ہے کہ یوگا اور سوریہ نمسکار بھی اسی طرح کی ایک کوشش ہے، جہاں سوریہ نمسکار کے مشرکانہ عمل ہونے پر اتفاق ہے، وہیں یوگا کی ایسی صورت جس میں سوریہ نمسکار یعنی سورج کے سامنے ہاتھ جوڑنا نہ پایا جاتا ہو اور مختلف مرحلوں میں اشلوک نہ پڑھے جاتے ہوں، کے بارے میں ایک حد تک نقطۂ نظر کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اس سلسلے میں عوامی سطح پر بھی تحریک شروع کرنے جارہا ہے، جس میں مسلمانوں کو مسئلہ کی حقیقت سے واقف کرایا جائے گا اور سیکولر برادرانِ وطن کو ساتھ لیا جائے گا

نیز عدالتی سطح پر بھی دستوری تقاضوں کی حفاظت کی جدو جہد کی جائے گی، اس پسِ منظر میں یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ علماء وارباب افتاء کی ایک نشست رکھ کر متفقہ نقطۂ نظر تک پہنچنے کی کوشش کی جائے؛ لہٰذا آپ سے گذارش ہے کہ درج ذیل سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں :

{۱} جو لوگ توحید کا عقیدہ رکھتے ہوئے سوریہ نمسکار نہ کریں؛ بلکہ اس کو غلط سمجھنے کے باوجود رواداری اور ایک رسمی عمل کے طور پر اس کے مرتکب ہوں، ان کے لیے کیا حکم ہے؟ وہ فسق عملی کے مرتکب ہیں یا فسق اعتقادی کے؟

{۲} یوگا میں سوریہ نمسکار کے علاوہ مختلف اشلوک بھی پڑھے جاتے ہیں، اگر کوئی شخص سوریہ نمسکار تو نہ کرے؛ لیکن اشلوک پڑھے تو اس طرح یوگا کرنے کا کیا حکم ہوگا؟

{۳} یوگا میں ابتداء میں اور مختلف مرحلوں میں بھی ''اوم'' کا لفظ بولا جاتا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سنسکرت میں خدا کو پکارنے کی تعبیر ہے اور یہ گویا ''اللہ'' ہی کے مفہوم کو ادا کرتا ہے، تو کوئی شخص سورج کے سامنے ہاتھ تو نہ جوڑے؛ لیکن ''اوم'' کا لفظ استعمال کرے، کیا یہ بات جائز ہوگی؟

{۴} اگر سوریہ نمسکار بھی نہ ہو، اشلوک بھی نہ پڑھے جائیں اور ''اوم'' بھی نہ کہا جائے، تب بھی بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ یوگا کے مختلف آسنوں کے مطابق ورزش برہمنی مذہبی پیشواؤں کا عمل رہا ہے اور مذہبی کتابوں میں اس کی ترغیب دی گئی ہے تو کیا یہ عمل تشبہ بالکفار کے دائرہ میں نہیں آئے گا؟

والسلام

محمد ولی رحمانی

کارگزار جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

۱۱۳۸ر۶ر۱۴۳۶ھ

**باسمہٖ تعالیٰ**

**الجواب وباللہ التّوفیق :**

یہ حقیقت ہے کہ ''یوگا'' محض حفظانِ صحت کا ذریعہ اور صرف ایک جسمانی ورزش نہیں ہے؛

بلکہ یہ ہندوانہ طریقۂ عبادت اور ''پرماتما'' تک پہونچنے کا برہمنی مذہبی طریقہ ہے جیسا کہ ہندو دھرم کی مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے (۱)

یوگا کی اہمیت و فضیلت، تعلیمات و ہدایات ویدوں اور بھگوت گیتا وغیرہ میں تفصیل سے موجود ہیں، چناں چہ اس کا طریقہ بتاتے ہوئے کرشن جی نے ارجن سے کہا:

'' آدمی کو چاہیے کہ گوشۂ تنہائی میں صاف ستھری جگہ پر آسن (نشست) لگائے آسن ستھر ہو یعنی بالکل حرکت نہ کرے سر گردن اور پیٹھ کی ہڈی کو ایک سیدھ میں قائم رکھے اپنی نظر کو صرف ناک کی نوک میں جمائے رکھے، کسی طرف نہ دیکھے اس وقت کسی طرح کا خوف فکر دل میں نہ لائے اور ''من'' کی تمام لہروں (خیالات) کو روکنے کی کوشش کرے اور صرف ''پرماتما'' کا دھیان کرے، اس طرح ابھیاس (مشق) کرنے سے من آتما میں محو ہوکر ایک ناقابل بیان آنند محسوس کرتا ہے، جسم اور دنیا سے بے تعلق ہو جاتا ہے'' (۲)

مذکورہ اقتباس میں تقریبًا وہ تمام چیزیں ہیں جن سے مروجہ ''یوگا'' پہچانا جاتا ہے؛ چناں چہ آسنا (جسم کی خاص ساخت اور وضع) دھارنا (کسی خاص چیز پر توجہ مرکوز کرنا) دھیانا (آنکھیں بند کر کے مراقبہ کرنا) اور ضبطِ نفس وغیرہ کی تعلیم اس طریقے میں موجود ہے، پھر یہ طریقہ خود ہندوؤں کے بھگوان ''شری کرشن'' کا تلقین کردہ ہے جو پرماتما تک پہونچنے اور برہم (ذاتِ حق) میں واصل ہونے کے لیے اپنے خاص بھگت (عقیدت مند) اور متر کو بتلایا گیا ہے جیسا کہ شریمد بھگوت گیتا میں اس کی صراحت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مروجہ یوگا اصلاً وہی ''یوگ ابھیاس'' ہے جس کی تعلیم و تفصیل ویدوں اور بھگوت گیتا وغیرہ میں موجود ہے؛ اس لیے اصل مذہبی تعلیم کے مطابق یہ پرماتما تک پہونچنے کا ایک مؤثر ذریعہ اور بہترین طریقۂ عبادت ہے۔

(۱) دیکھئے نغمۂ الوہیت ترجمہ بھگوت گیتا، ص:۴۲/۱۳۳/۱۳۶/ گیتا امرت چھٹا ادھیائے، یوگ ابھیاس، ص: ۷۱/۷۲، گیتا گیان چھٹا ادھیائے ص:۳۶، شریمد بھگوت گیتا، دوسرا ادھیائے، ص:۵۶/۵۷/۵۸، تیسرا ادھیائے، ص:۶۰/۶۷، چوتھا ادھیائے:۶۸، چھٹا ادھیائے، ص:۹۳/۹۴، گیتا امرت یوگ ابھیاس، ص:۷۱/۷۲، گیتا گیان چھٹا ادھیائے ص:۹۳/۹۴ وغیرہ)

(۲) گیتا امرت چھٹا ادھیائے، یوگ ابھیاس ص:۶۷/۶۸۔

رہا جسمانی فائدہ اور بدنی ورزش تو یہ اس کی ثانوی حیثیت ہے؛ اسی لیے مذہبی کتابوں میں یہ صراحت ملتی ہے کہ ''یوگا'' روح کو پاکیزہ کرنے، مکتی (نجات) حاصل کرنے اور عبادت کی نیت سے کرنا ضروری ہے، اگر کوئی شخص صرف جسمانی ورزش یا کسی دنیوی فائدے کے لیے یوگا کرتا ہے تو بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے، گاندھی جی یوگا کے لیے ''تصحیح نیت'' پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اور میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ورزشوں میں یہ ورزش نہایت اچھی ہے، جسمانی ورزش کے خیال سے اس کی عادت ڈالنا نہایت ضروری ہے؛ لیکن جب یہ عمل دنیاوی کامیابی اور چمتکار دیکھنے کے لیے کیا جاتا ہے، تو میں نے دیکھا ہے کہ فائدہ کے بجائے نقصان ہی ہوتا ہے'' (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ مذہبی تعلیم کے اعتبار سے یوگا عبادت ہے اور اسے عبادت کی نیت سے ہی کرنا چاہیے۔

نیز یوگا کے ارکان وافعال، حرکات وسکنات، مخصوص وضع، خاص ہیئت اور اشلوک وآسن وغیرہ سے بھی واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس کی جڑیں ہندوانہ مذہبی تعلیمات سے جڑی ہوئی ہیں اسی طرح عرفاً بھی اسے ہندؤں کی عبادت اور ان کا مذہبی شعار ہی سمجھا جاتا ہے۔

اور یہ طے شدہ امر ہے کہ غیر مسلم جن کاموں کو مذہبی نقطۂ نظر سے یا عبادت کے طور پر کرتے ہیں، ان کاموں کو اختیار کرنا، ان کے قومی یا مذہبی شعار کو اپنانا مسلمانوں کے لیے مطلقاً ناجائز اور حرام ہے، قرآن کریم میں کفار ومشرکین کی طرف ''میلان ورکون'' یعنی مذہبی امور میں ان کی موافقت ومخالطت؛ بلکہ مشابہت پر بھی عذابِ نار کی وعید وارد ہوئی ہے، **قال تعالیٰ: ولا ترکنوا إلی الّذین ظلموا فتمسّکم النّار** (۲)

اس آیت کے ذیل میں تفسیر قرطبی میں ہے: **فتمسّکم النّار أي تحرقکم بمخالطتهم وموافقتهم في أمورهم** (۳) ......

(۱) گیتا گیان، ص: ۳۶، چھٹا ادھیائے، ط: گرام سیوا پرکاش، کرنال۔

(۲) سورۂ ہود، آیت: ۱۱۳۔

(۳) تفسیر قرطبی، سورۂ ہود، آیت: ۱۱۳۔

اسی طرح صاحب **البحر المحیط** اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں: **والنّهيُ متناول لانحطاطٍ في هَوَاهُم والانقطاع إليهم ......... والتّشبّه بهم والتزيّ بزيّهم**(۱)

یعنی ظالمین وکفار کی مذہبی امور میں مشابہت اختیار کرنے والا، اوران کے قومی یا مذہبی شعار کو اپنانے والا بھی اس قرآنی وعید کا مصداق ہے، اسی طرح حدیث میں بھی اس پر بڑی سخت وعید وارد ہوئی ہے، مشہور حدیث ہے: **من تشبّه بقومٍ فهو منهم**(۲)

آپ ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ کسی مذہبی چیز میں اگر غیروں کی مشابہت دیکھتے تو اس پر نکیر فرماتے: چناں چہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے چھوٹے بچے کے سر پر بالوں کی دو چوٹیاں دیکھیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: انہیں کاٹ دو اس لیے کہ یہ یہود کا مذہبی شعار ہے۔ **احلقوا هذين ، أو قُصُّوهما؛ فإن هذا زِيّ اليهود، قال في عون المعبود: زيّ اليهود أي شعارهم وعاداتهم في رؤس أولادهم فخالفوهم ......... فعُلِمَ أن زيَّ اليهود حتّى في الشّعر ممّا يطلب عدمه** (۳)

اسی طرح نماز جو اسلامی عبادت ہے، طلوع آفتاب، غروب آفتاب اور زوالِ آفتاب کے وقت مسلمانوں کو اس کے پڑھنے سے روک دیا گیا؛ کیوں کہ سورج پرست قومیں ان اوقات میں سورج کی عبادت کرتی ہیں (اس لیے ان اوقات میں نماز پڑھنے سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے) اسی طرح روزہ اسلامی عبادت ہے؛ لیکن آپ ﷺ نے صرف ایک دن یوم عاشورہ کا روزہ رکھنے سے یہود کی مشابہت سے بچنے کے لیے منع کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس مذہبی عمل میں غیروں کی مشابہت ہو اس میں اگر چہ ان کی مشابہت کا قصد وارادہ نہ ہو، تب بھی وہ ناجائز اور ممنوع ہوتا ہے، اس کی اور واضح مثال قرآن کریم کی یہ آیت ہے۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوْا انْظُرْنَا﴾(۴)

(۱) البحر المحيط لأبي حيان الغرناطي: ۳۵۰/۵، سورۂ ہود، آیت: ۱۱۳۔
(۲) أخرجه أبو داؤد، باب في لبس الشّهرة، رقم: ۴۰۳۰۔
(۳) عون المعبود: ۱۶۸/۱۱، باب في أخذ الشّارب .
(۴) سورۂ بقرہ، آیت: ۱۰۴۔

اس آیت میں صحابۂ کرام کو لفظ "راعنا" کہنے سے منع کر دیا گیا ہے اگر چہ صحابۂ کرام کے حاشیۂ خیال میں بھی وہ معنی نہیں تھے جس معنی میں یہود اس کلمہ کو استعمال کرتے تھے؛ لیکن ان کی مشابہت ضرور تھی اس لیے "راعنا" کے بجائے "انظرنا" کہنے کا حکم دیا گیا تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کے ذیل میں ہے: **نهى الله تعالىٰ عباده أن يتشبّهوا بالكافرين في مقالهم وأفعالهم**(۱)

اسی طرح علامہ ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: **ولا يخفى نزاهة ساحة الصحابة أن يوَرُّوا كما كانت اليهود يُوَرُّونَ ومع هذا تراهم نُهُوْا عن هذه اللّفظة، وما هذا إلاّ من باب سدّ الذرائع وقطع التّشبّه بالكفّار** (۲)

لہٰذا ''یوگا'' چاہے صرف جسمانی ورزش کی نیت سے کیا جائے، ہندوؤں کی مذہبی عبادت اور ان کے اعتقاد و نظریات کا بالکل قصد نہ ہو تب بھی مسلمانوں کے لیے یہ عمل ممنوع ہوگا۔

اسلام حفظانِ صحت کا مخالف نہیں ہے، اسلام کی نظر میں صحت کی حفاظت نہ صرف جائز بلکہ واجب اور ضروری ہے، ہر وہ عمل جو صحت کو خراب کر دے اسلام کی نظر میں ممنوع ہے، **المؤمن القويُّ خير وأحبّ إلى الله من المؤمن الضّعيف** (۳) (یعنی طاقت ور مومن اللہ کے نزدیک کمزور مومن سے بہتر ہے) سے اسلام کی نظر میں حفظانِ صحت کی اہمیت واضح ہے؛ لیکن جو چیز اسلامی اصولوں سے متصادم ہوگی اسلام کی روح اور اس کے مزاج کے خلاف ہوگی اسلام ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا؛ اگر چہ اس میں کچھ منافع بھی ہوں۔ **قال تعالىٰ: وإثمهما أكبر من نفعهما**(۴)

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں آپ کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

{۱} یوگا میں ''سوریہ نمسکار'' رواداری کے طور پر کرنا بھی حرام و ناجائز ہے یہ چوں کہ غیر اللہ کی عبادت ہے؛ اس لیے کسی مسلمان کے لیے اس کا کرنا باعث اندیشہ کفر ہے۔

(۱) التّفسير لابن كثير: ۱/۳۲۸. سورۂ بقرہ، آیت: ۱۰۴۔

(۲) أحكام القرآن للتّهانوي: ۱/۵۴۔ سورۂ بقرہ، آیت: ۱۰۴۔

(۳) مسلم: رقم: ۲۶۶۴، باب في الأمور بالقوّة.

(۴) سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۹۔

{۲-۳} بعض ''اشلوک'' شرکیہ مفہوم پر مشتمل ہیں اسی طرح لفظ ''اوم'' ان کے مذہبی ''یوگ'' کا جز ہے؛ لہٰذا اس طرح کے کلمات کہہ کر یوگا کرنا ناجائز اور ممنوع ہے۔

{۴} ''یوگا'' اپنی مجموعی ہیئت اور مخصوص وضع کے ساتھ جس طرح بھی کیا جائے خواہ اشلوک وغیرہ نہ پڑھے جائیں، لفظ ''اوم'' کی جگہ لفظ خدا کہا جائے یا جسمانی ورزش کے طور پر کیا جائے، بہرحال مسلمانوں کے لیے یہ قابل احتراز ہے، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں: طرقِ ورزش میں بھی تشبہ باہل باطل ممنوع ہے، جب کہ دوسرے طرق ورزش کے اس محظور سے خالی پائے جاویں۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

۱۷/۱۱/۱۴۳۶ھ/۳/۹/۲۰۱۵ء

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری

فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ، العبد محمد مصعب عفی عنہ، محمد اسد اللہ غفرلہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

(۱) إمداد الفتاویٰ: ۲۶۷/۴، ط زکریا دیوبند.

# طہارت اور نماز سے متعلق مسائل

## بلا وضو آیات واحادیث کی کمپیوزنگ کا حکم

**سوال:** ﴿۱۶﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

اگر کوئی شخص بے وضو کمپیوٹر سے قرآن وحدیث کی کوئی عبارت ٹائپ کرے تو کیا اس کو لکھنے کا اجر ملے گا؟ یا گناہ ہوگا؟ اس بارے میں کیا حکم ہے؟ ویسے تو بے وضو قرآن کو لکھنا اور چھونا جائز نہیں ہے؛ لیکن کمپیوٹر سے لکھنے والے کا اگر بار بار وضو ٹوٹ جاتا ہو اور بار بار وضو بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے، اس بارے میں کیا حکم ہوگا؟ تسلی بخش جواب دیں۔

(۶۵۸/ د۱۴۳۵ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

صورتِ مذکورہ میں کمپیوز کرنے والے اور قرآن کی عبارت کے درمیان چوں کہ واسطہ منفصلہ موجود ہے؛ اس لیے بے وضو کمپیوٹر کے ذریعے قرآن پاک کی عبارت ٹائپ کرنے کی گنجائش ہے، اور اگر اخلاص کے ساتھ بہ نیت ثواب ٹائپ کرے گا تو ثواب کی امید بھی کی جاسکتی ہے، اور رہا حدیث تو اس کی عبارت بے وضو ٹائپ کرنا جائز ہے، **يستفاد ممّا في الدّرّ مع الرّدّ : لا تكره كتابة قرآن والصّحيفة أو اللّوح على الأرض عند الثّاني خلافًا لمحمّد ............ حيث قال : أحبّ إليّ أن لا يكتب ، لأنّه في حكم الماس للقرآن ............ قال في الفتح : والأوّل**

أقيس؛ لأنّه في هٰذهِ الحالة ماس بالقلم وهو واسطة منفصلة. (۱)

مذکورہ بالاعبارت میں صاحبِ فتح القدیر نے جنبی وغیرہ کے لیے اس تختی پر قرآن لکھنے کی گنجائش دی ہے، جو ہاتھ میں نہ لی جائے؛ بلکہ کسی چیز پر رکھ کر لکھا جائے، اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ یہاں قلم کے ذریعے چھونا پایا جارہا ہے، اور قلم واسطہ منفصلہ ہے، پس اس بنیاد پر اگر دیکھا جائے تو کمپیوٹر میں بھی ''کی بورڈ''(Keyboard) کا واسطہ موجود ہے؛ بلکہ نقش حروف بنانے میں قلم سے بھی زیادہ دور کا واسطہ ہے، اس طور پر کہ قلم سے براہِ راست نقوش وحروف بنتے ہیں اور کمپیوٹر میں حروف ''کی بورڈ'' (Keyboard) پر لکھے ہوتے ہیں، ٹائپنگ کے ذریعے ان کا ظہور اسکرین پر ہوتا ہے، براہ راست لکھنا نہیں پایا جاتا؛ لہٰذا کمپیوٹر کے ذریعہ بے وضو قرآنی عبارت ٹائپ کرنے کی بہ درجۂ اولیٰ گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۵/۶/۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## کمپیوٹر پر ماؤس اور کی بورڈ کے بٹنوں سے بلا وضو قرآن مجید کی ورق گردانی کا حکم

**سوال:** ﴿۱۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

قرآن مجید کے ہر ہر صفحہ کی تصویر لے کر پی-ڈی-ایف فائل کی صورت میں اس کو کمپیوٹر میں محفوظ کرلیا جاتا ہے، جب کبھی قرآن مجید دیکھ کر تلاوت کرنا چاہیں، تو کمپیوٹر چلاکر اس پر یہ قرآن مجید کھول کر تلاوت کرتے رہتے ہیں۔

(۱) پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس طرح قرآن مجید کی تلاوت کے لیے بھی وضو کرنا ضروری ہوگا

(۱) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۱/۳۱۷.

یا نہیں؟ کیوں کہ بعض اوقات مصروف مرد و خواتین کو قرآن مجید ہاتھ میں لے کر پڑھنے کا موقع نہیں ملتا، یا بعض لوگوں کا وضو زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تو کیا وہ بغیر وضو کے اس قسم کے قرآن مجید پر تلاوت کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) نوٹ: اس قسم کے قرآن مجید کی کمپیوٹر پر ورق گردانی کے لیے ماؤس اور کی بورڈ کے بٹنوں کو ہاتھ سے حرکت دی جاتی ہے، کیا وضو نہ ہونے کی حالت میں ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سائل: محمد عبداللہ

(۲۲۱/ د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفيق :**

(۱) پی-ڈی-ایف سے بلا وضو تلاوت کرنے میں تو کوئی حرج نہیں؛ البتہ اسکرین پر جس وقت قرآنی آیات نظر آتی ہوں، اس وقت اس پر ہاتھ نہ لگائیں؛ اس لیے کہ یہاں اگر چہ درمیان میں شیشہ حائل ہے؛ لیکن وہ بہ ظاہر منفصل نہیں ہے۔ **ففي الدّرّ المختار ويحرُمُ بهِ أي بالأكبرِ وبالأصغرِ مسُّ مصحفٍ أي ما فيه آية ......... إلّا بغلاف متجاف غير مشرّز إلخ وفي ردّ المحتارلكنْ لايحرُمُ في غيرِ المُصحفِ إلّا بالمكتوبِ:أي موضِع الكتابةِ (١)**

(۲) جائز ہے۔ **لعدم صدق تعريف المسّ عليه، ويستفاد ممّا في الدّرّ: حلّ قلبه بعود قال العلاّمة الشّامي أي تقليب أوْرَاق المصحفِ بعود ونحوه لعدم صدق المسّ عليه (٢)** فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۴/۲/۱۳ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

**(١) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ٣١٥/١، مطلب : يطلق الدّعاء على ما يَشْتمِلُ الثّناء .**

**(٢) المصدر السّابق: ٣١٦/١.**

# عقائد واحکام سے متعلق سعودی عرب میں حنفی مسلمانوں کو درپیش کچھ سوالات کے جوابات

مکرمی ومحترمی حضرت مفتی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

راقم الحروف کا سعودی عرب کے شہر ''ریاض'' میں چند دن قبل ایک ماہ قیام رہا، عام طور سے لوگ مجھ سے سوالات بہ کثرت کرتے رہے، جس سے اندازہ ہوا کہ علاقے میں مقیم حنفی مسلمانوں کو اس سلسلے میں اطمینان بخش معلومات کی ضرورت ہے؛ اس لیے خیال ہوا کہ ان سوالات عامہ کے جوابات آں محترم سے طلب کر کے متعلقین تک پہنچا دیے جائیں اور اشاعت عام بھی ہوجائے؛ تاکہ نفع متعدی ہوسکے۔ امید کہ عام مسلمانوں کی ضرورت کے مدنظر خصوصی توجہ فرما کر جوابات سے مشرف فرمائیں گے واضح رہے کہ ان امور کے قائلین چوں کہ ثبوت میں احادیث کا حوالہ دیتے ہیں؛ اس لیے بہتر ہوگا کہ جواب میں بھی اس کی رعایت فرمائی جائے تاکہ مزید اطمینان کا سبب ہو۔

والسلام

محمد عبدالقوی، حیدرآباد، ۱۲۸۱/ ۵؍ ۱۴۳۴ھ

## دورانِ خطبہ سنن ونوافل پڑھنے کا حکم

**سوال:** ﴿۱۸﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

یہاں کی اکثر مساجد میں زوال کے معاً بعد اذان اور خطبہ شروع ہوجاتا ہے، مقامی لوگ دورانِ خطبہ بھی سنتیں پڑھ لیتے ہیں، ہمارے یہاں خطبہ کے آغاز کے بعد ہر عمل حتی کہ نماز بھی ممنوع ہے، تو ایسی صورت میں جمعہ کی سنن قبلیہ کا کیا حکم ہوگا؟ کس وقت ادا کی جائیں؟

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

خطبہ کے دوران سنن ونوافل پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ قال في التّنویر : وکلّ ما حرم في

الصّلاة حرم فيها ، قال الشّامي: حاصله ما في الجوهرة أن عنده (الإمام أبي حنيفة) خروج الإمام يقطع الصّلاة والكلام ، وعندهما (صاحبيه) خروجه يقطع الصّلاة ، وكلامه يقطع الكلام .(۱) مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے : عن ابن عبّاسٍ وابن عمر رضي الله عنهما أنّهما كانا يكرهان الصّلاة والكلام يوم الجمعة بعد خروج الإمام (۲) اسی طرح جب حضرت قتادہؓ سے یہ مسئلہ معلوم کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: ایسے موقع پر میں بیٹھ جاتا ہوں۔ سألت قتادةً عن الرّجل يأتي و الإمام يخطب يوم الجمعة ولم يكن صلّى أيصلي ؟ فقال: أمّا أنا فكنت جالسًا.(۳)

وعن ابن عمر قال: سمعت النّبيّ صلّى الله عليه وسلّم يقول إذا دخل أحدكم المسجد والإمام على المنبر فلا صلاة ولا كلام حتّى يفرغ الإمام. (۴)

قال في الدّرّ المختار بخلاف سنّة الظّهر وكذا الجمعة فإنّه يتركها ثمّ يأتي بها في وقته.(۵)

ان عبارات سے واضح ہوا کہ خطبہ شروع ہوجانے کے بعد سنتیں نہیں پڑھی جائیں گی؛ البتہ فرض کے بعد ادا کی جائیں، جیسا کہ ظہر کی پہلی سنتیں چھوٹ جانے کی صورت میں فرض کے بعد پڑھی جاتی ہیں۔

## سعودی عرب میں رائج کسی بھی نمازی کی اقتداء کرنے کا حکم

**سوال:** ﴿۱۹﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

(۱) التّنوير مع الدّرّ والرّدّ :۳/ ۳۵، باب الجمعة .

(۲) مصنّف ابن أبي شيبة:۱/ ۴۴۸، رقم: ۵۱۷۵، باب : من كان يقول إذا خطب الإمام فلا تُصلِّ .

(۳) مصنّف عبد الرّزّاق :۳/ ۲۴۵،باب الرّجل يجيء والإمام يخطب، رقم الحديث: ۵۵۱۹.

(۴) رواه الطّبراني في الكبير: ۱۳/ ۷۵، رقم: ۱۳۷۰۸، مسند عبد الله بن عمر بن الخطّاب.

(۵) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۳/ ۵۱۲، باب إدراك الفريضة .

یہاں عام طور سے کسی بھی نمازی کو پیچھے سے اشارہ دے کر اس کی نماز میں شامل ہو جانے کا رواج ہے، بسا اوقات ہم فرض ادا کر کے ''سنن بعدیہ'' پڑھ رہے ہوتے ہیں، کوئی بھی آنے والا اپنی فرض ادا کرنے کے لیے ہمارا مقتدی بن جائے تو کیا حکم ہے؟

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰه التّوفيق :**

جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ شخص کون سی نماز ادا کر رہا ہے، نفل یا فرض اور فرض میں بھی کس وقت کی، کسی دوسرے کے لیے اس کی اقتداء کرنا جائز نہیں؛ کیوں کہ امام مقتدی کی نماز کا ضامن ہوتا ہے؛ لہٰذا فرض کے مختلف ہونے کی صورت میں اقتداء صحیح نہیں ہوگی، اسی طرح نفل یا سنت پڑھنے والے کی اقتداء وہ شخص نہیں کر سکتا جو فرض ادا کرنا چاہتا ہے، ہاں فرض پڑھنے والے کی اقتداء نفل پڑھنے والا کر سکتا ہے۔ **عن أبي هريرةؓ قال : قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم الإمام ضامن والمؤذّن مؤتمن الحديث** (۱) ضامن اعلیٰ درجے کا ہونا چاہیے، یا کم از کم برابر درجے کا، فرض پڑھنے والا اعلیٰ ہے اور سنن ونوافل پڑھنے والا اس سے ادنیٰ ہے؛ اس لیے فرض پڑھنے والے کے لیے نفل پڑھنے والے کی اقتداء درست نہیں، مسلم شریف میں ہے: **عن أبي هريرة رضى اللّٰه عنه أنّ رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم قال: إنّما جعل الإمام ليؤتم بهٖ فلا تختلفوا عليه** (۲) امام اس لیے ہے تاکہ اس کی اقتداء کی جائے، پس تم اس سے اختلاف نہ کرو، فرض پڑھنے والا جب متنفّل کی اقتداء کرے گا تو دونوں کی نمازوں میں اختلاف پایا جائے گا **قال في الدّرّالمختارمع ردّالمحتار : ولايصحّ اقتداء رجل بامرأة......... ولامفترض بمتنفّل وبمفترض فرضًا آخر.** (۳)

(۱) رواه التّرمذي: ۱/۵۱، رقم: ۲۰۷، باب ما جاء أنّ الإمام ضامن .

(۲) رواه مسلم: ۱/۱۷۶، رقم: ۴۱۴ ، باب ائتمام الماموم بالإمام .

(۳) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار : ۲/ ۳۲٤، باب الإمامة .

## مسبوق کی اقتداء کرنا صحیح نہیں

**سوال:** ﴿۲۰﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟
اسی طرح اگر ہم مسبوق ہوں اپنی چھوٹی ہوئی رکعتیں پڑھ رہے ہوں اور کوئی ہمارا مقتدی بن جائے تو کیا حکم ہے؟

**باسمہٖ تعالیٰ**

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

مسبوق کی اقتداء کرنا بھی صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ ایک گونہ یہ امام کے پیچھے ہی ہے؛ لہٰذا یہ خود امام نہیں بن سکتا۔ مراقی الفلاح شرح نور الایضاح میں ہے: **و أن لا یکون الإمام مصلّیًا فرضًا غیر فرضہٖ ......... ولا مسبوقًا لشبھة اقتدائہٖ**[1] پس آپ کے مسبوق ہونے کی حالت میں جو شخص آپ کی اقتداء کرے گا اس کی نماز صحیح نہ ہوگی۔

## نمازِ مغرب سے قبل سنت پڑھنے کی شرعی حیثیت

**سوال:** ﴿۲۱﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟
مغرب سے قبل سنتوں کا معمول ہے، وقت بھی دیا جاتا ہے، بعض مرتبہ متشدد لوگ زبردستی کھڑا کر دیتے ہیں، ایسے وقت کیا کرنا چاہیے؟

**باسمہٖ تعالیٰ**

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

سورج غروب ہوتے ہی مغرب کا وقت شروع ہو جاتا ہے، اور حدیث شریف میں مغرب کی نماز جلد پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے؛ چنانچہ ابوداؤد شریف میں ہے: **لا تزال أمّتي بخیر أوقال**

(۱) **مراقي الفلاح شرح نور الإیضاح، ص:۲۹۱، باب الإمامة، ط: أشرفیة دیوبند.**

علی الفطرة ما لم یؤخّروا المغرب إلی أن تشتبك النّجوم (۱) اس لیے نماز مغرب کو جلد پڑھنے پر امت کا اجماع ہے، اور حنفیہ تعجیل مغرب کا لحاظ کرتے ہوئے مغرب سے قبل نفل نماز کو مکروہ کہتے ہیں کہ لوگ کہیں نوافل میں مشغول ہو کر مغرب میں تاخیر نہ کرنے لگیں، رہی وہ روایتیں جن سے نفل قبل المغرب کا ثبوت ہوتا ہے تو ان میں بعض بعض سے متعارض ہیں، اس سے سنیت ثابت نہیں ہوتی، ہاں اگر کوئی شخص بغیر سنت سمجھے ادا کرلے تو مباح درجے کی چیز ہے، انکار میں تشدد برتنے کی ضرورت نہیں، اعلاء السنن میں ہے: فرجّحت الحنفيّة أحاديث التّعجيل لقيام الإجماع علی کونه سنّة، و کرهوا التّنفّل قبلها ؛ لأنّ فعل المباح والمستحبّ إذا أفضی إلی الإخلال بالسّنّة یکون مکروهًا، ولا یخفی أنّ العامّة لو اعتادوا صلاة رکعتین قبل المغرب لیخلون بالسّنّة حتمًا، و یؤخّرون المغرب عن وقتها قطعًا، و أمّا لو تنفّل أحد من الخواص قبلها ولم یخل بسنّة التّعجیل فلا یلزم علیه ؛ لأنّه قد أتی بأمر مباح في نفسه أو مستحبّ عند بعضهم — فحاصل الجواب أنّ التّنفّل قبل المغرب مباح في نفسه، وإنّما قلنا بکراهته نظرًا إلی العوارض، فالکراهة عارضة (۲)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جب لوگ پڑھ رہے ہیں اور چاہ رہے ہیں کہ آپ بھی پڑھیں تو پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، نہ انہیں پڑھوانے پر اصرار اور تشدد کرنا چاہیے اور نہ آپ کو انکار میں تشدد اختیار کرنا چاہیے، نفل سمجھ کر پڑھیں سنت سمجھ کر نہیں۔

## درستگیٔ صفوف کے لیے نماز میں چلنا

**سوال:** ﴿۲۲﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

دورانِ نماز صفوں کی درستگی ہوتی رہتی ہے، حالتِ نماز میں ہی چل کر جاتے رہتے ہیں، ایسی صورت میں داہنے بائیں یا آگے کس حد تک بڑھ سکتے ہیں؟

(۱) أبو داؤد: ۱/۶۰، رقم: ۴۱۸، باب في وقت المغرب .

(۲) إعلاء السّنن: ۲/ ۶۹، مبحث الرّکعتین قبل المغرب ، ط: أشرفیة ، دیوبند .

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

استقبال قبلہ برقرار رہتے ہوئے ایک صف کی حد تک چلنا مفسد صلاۃ نہیں اور اس سے زیادہ اگر لگاتار ہو تو مفسد ہے، اور اگر ایک صف کے بہ قدر چل کر توقف کیا پھر چلا تو مفسد نہیں، قال في الهندية: **ولَو مَشٰی في صلاتِهٖ مقدارَ صفٍّ واحدٍ لَمْ تَفْسُدْ صلاتُهٗ و لَو كانَ مِقدارَ صفَّيْنِ إنْ مَشٰی دفعةً واحدةً فَسدَتْ صَلاتُهٗ ، و إن مَشٰی إلٰی صَفٍّ وَ وَقَفَ ثُمّ إلٰی صفٍّ لا تَفْسُدُ كذَا فِي فتاوٰی قَاضِي خَانْ.** (۱)

لہٰذا ایسی ضرورت کے وقت کہ اگلی صف میں جگہ خالی ہو، چل کر اس جگہ کو پُر کر سکتے ہیں **كما قالوا فيمن رأى فرجة في الصّفّ الأوّل فمشى إليها فسدّها فإن كان هو في الصّفّ الثّاني لم تفسد صلاته و إن كان في الصّفّ الثّالث فسدت.** (۲)

## حنفیہ کے نزدیک جمع حقیقی جائز نہیں ہے

**سوال:** ﴿۲۳﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

سفر کے دوران اسی طرح ایئر پورٹ، بس ڈپو وغیرہ پر مغرب عشاء کو مغرب کے وقت ہی میں جمع کر لیا جاتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ اور اگر مقامی لوگوں کے ہمراہ اس کی نوبت آ جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

مغرب کے وقت میں عشاء کو جمع کر کے پڑھنا دلائل کی روشنی میں حنفیہ کے یہاں جائز نہیں،

(۱) الفتاوى الهندية: ۱/۱۰۳، النّوع الثّاني في الأفعال المفسدة للصّلاة .

(۲) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۲/۳۸۹، مطلب في المشي في الصّلاة .

لہٰذا حنفی مصلی صرف مغرب کی نماز پڑھ لے، پھر عشاء کا وقت شروع ہو جانے پر عشاء کی نماز ادا کرے قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾(۱) یعنی ہر نماز اپنے وقت مقررہ کے ساتھ فرض کی گئی ہے، اور جن حدیثوں میں جمع بین الصلاتین کا ذکر ہے ان سے جمع صوری مراد ہے کہ ایک نماز اس کے آخری وقت اور دوسری نماز اس کے اوّل وقت میں پڑھی جائے، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ **وعن أنس أنّه كان إذا أراد أن يجمع بين الصّلاتين في السّفر أخّر الظّهر إلى آخر وقتها وصلّاها وصلّى العصر في أوّل وقتها، ويصلّي المغرب في آخر وقتها، ويصلّي العشاء في أوّل وقتها، ويقول: هكذا كان رسول الله صلّى الله عليه وسلّم يجمع بين الصّلاتين في السّفر** (۲) اسی طرح عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بھی جمع صوری پر دلالت کرتی ہے(۳)

## فجر کی سنتیں چھوٹ جانے کی صورت میں اُن کی ادائیگی کب کرے؟

**سوال:** ﴿۴۴﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

فجر کی نماز جلدی ہوتی ہے، اشراق کے لیے کافی وقت ہوتا ہے، اگر کسی کی فجر کی سنتیں رہ گئیں، تو کب ادا کرے؟ یہاں بعض لوگ نماز کے فوراً بعد ادا کرلیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی صحیح ہے۔

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وبالله التّوفيق :**

سنتیں فجر کی فرض کے بعد نہیں پڑھی جائیں گی؛ کیوں کہ فجر کے بعد سورج بلند ہونے تک

---

(۱) سورۂ نساء، آیت: ۱۰۳۔

(۲) **مجمع الزّوائد، رقم: ۲۹۷۳، باب مدّة الجمع .**

(۳) **إعلاء السّنن: ۲/۹۵، باب عدم جواز الجمع بين الصّلاتين، جمعًا حقيقيًا، ط: أشرفي ديوبند .**

سوائے قضا نماز کے کسی اور نماز کا پڑھنا منع ہے۔ عن أبي سعيد الخدريّ رضي الله عنه يقول : سمعت رسول الله صلّى الله عليه وسلّم يقول : لا صلاةَ بعد الصّبح حتّى ترتفع الشّمس ، ولا صلاةَ بعد العصر حتّى تغيب الشّمس رواه البخاريّ[1] وفي العزيزي أخرجه الشّيخان والنّسائيّ وابن ماجة عن أبي سعيد مرفوعًا و أحمد و أبوداؤد وابن ماجة عن عمرو مرفوعًا ، قال المناوى: هذا متواتر، وعن حفصة رضي الله عنها قالت: كان رسول الله صلّى الله عليه وسلّم إذا طلع الفجر لايصلّى إلاّ ركعتين رواه مسلم وعن ابن عمرو أنّ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم قال : لا صلاةَ بعد الفجر إلاّ سجدتين ، أخرجه الخمسة إلاّ النّسائي [2] ان احادیث سے معلوم ہوا کہ فجر کی فرض کے بعد سورج بلند ہونے تک سنت فجر پڑھنے کی گنجائش نہیں۔

## نائلون کے مروّجہ موزوں پر مسح کرنے کا حکم

**سوال:** ﴿۲۵﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

یہاں نائلون کے معمولی سے موزوں پر مسح کر لینے کا رواج ہے، بعض لوگ بنا وضو پہنے ہوئے موزوں پر بھی وضو کے وقت مسح کر لیتے ہیں، بعض لوگ جوتوں پر بھی مسح کر لیتے ہیں، بعض لوگ پھر ان جوتوں کو نماز کے وقت اتار بھی دیتے ہیں، بعض لوگ قدمین پر بھی مسح کر لیتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ اور ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ تفصیلاً مطلع فرمائیں۔

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وبالله التّوفيق :**

نائلون کے مروّجہ موزوں پر مسح کرنا درست نہیں، اگر کوئی شخص اس طرح کے موزے پر مسح کر کے نماز پڑھا رہا ہے، تو اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا درست نہیں۔

(۱) رواه البخاري:۱/۸۲–۸۳، رقم:۵۸٦، باب: لا تتحرى الصّلاة قبل غروب الشّمس .

(۲) إعلاء السّنن:۲/٦۱–٦۲، باب أوقات المكروهة ، ط: أشرفية ، ديوبند .

کپڑے کے اعتبار سے جرابوں کی دو قسمیں ہیں: ثخین اور رقیق، ثخین اصطلاح فقہاء میں وہ جراب ہے جس کا کپڑا اس قدر دبیز موٹا اور مضبوط ہو کہ اس میں تین میل بغیر جوتے کے سفر کر سکیں اور ساق (پنڈلی) پر بغیر (گیٹس وغیرہ سے) باندھے ہوئے قائم رہ سکیں، بہ شرطیکہ یہ قائم رہنا کپڑے کی تنگی اور چستی کی وجہ سے نہ ہو، بلکہ اس کی ضخامت اور جرم کی وجہ سے ہو، نیز یہ کہ وہ پانی کو جلدی سے جذب نہ کرے اور پانی اس میں نہ چھنے۔(۱)

الغرض ثخین کے لیے درج ذیل تین شرطیں ہیں:

(۱): اس میں تین میل بغیر جوتے کے سفر کریں تو پھٹے نہیں۔

(۲): ساق پر بغیر باندھے ہوئے قائم رہ جائے۔

(۳): اس میں پانی چھنے نہیں اور جلدی سے جذب نہ ہو، اور جس جراب میں ان شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے وہ رقیق ہے۔ **قال في المنية : وحدّ الجوربين الثّخينين أن يستمسك أي يثبت ولا ينسدل على السّاق من غير أن يشده بشيء ، هٰكذا فسروه كلّهم ............ والحدّ بعدم جذب الماء كما في الأديم على ما فهم من كلام قاضي خان أقرب وبما تضمنه وجه الدّليل وهو ما يمكن فيه متابعة المشى أصوب (۲) قال في إمداد الأحكام: والمراد استمساكه بصلابته وغلظته دون جدّته وضيقه.** (۳)

**اتّفق الأئمّة على جواز المسح على الجوربين المجلّدين والمنعّلين ، وكذٰلك اتّفقوا على عدم جوازه على الرّقيقين يشفان ، واختلفوا في الثّخينين فالجمهور جوزوه، ومنعه أبوحنيفة، وروى عنه الرّجوع إلى قول صاحبيه قبيل وفاته بأيّام** (۴)

(۱) مستفاد امداد الفتاویٰ:۱/۷۶-۷۷ ، ط: زکریا، دیوبند .

(۲) كبيري،ص:۱۰۵-۱۰۶، فصل في المسح على الخفّين ، ط: دارالكتاب ، ديوبند .

(۳) إمداد الأحكام:۱/۳۸۸، فصل في المسح على الخفّين ، ط: زكريا، ديوبند .

(۴) معارف السّنن: ۱/۳٤٦،ط:زكريا، ديوبند. حاشية إعلاء السّنن: ۱/۳٤۷،ط:أشرفي.

عن المغيرة بن شعبة قال: توضّأ النّبيّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم ومسح على الجوربين والنّعلين (رواه التّرمذيّ وقال حسن صحيح)(۱) قال الشّيخ ظفر أحمد العثماني: قلت: لأنّ المسح على الجوربين ثبت بخبر الواحد وغسل الرّجلين قطعيّ فلا يكون المسح على الجوربين بدلاً عنه إلّا إذا كان الجورب كالخفّ الثّابت مسحه بالتّواتر وبعد ما ثبت رجوعه وكان عليه الفتوى(۲)

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ اصل حکم جو قرآن سے ثابت ہے وہ غسل رجلین کا ہے، لیکن جب احادیث متواترہ سے خفین کا جواز ثابت ہوا تو قرآن کے قطعی حکم غسل رجلین کی جگہ مسح خفین کو رکھ دیا گیا، لیکن جوربین کا مسح احادیث متواترہ سے ثابت نہیں ہے؛ بلکہ خبر واحد سے ثابت ہے؛ لہٰذا قرآن کے "حکم قطعی" کی جگہ مسح جوربین کو رکھنا صحیح نہیں ہوگا؛ ہاں اگر جورب ثخین ہو یا اس کے اوپر نیچے چمڑہ لگا ہو؛ تو اوصاف کے لحاظ سے خفین کے برابر ہونے کی وجہ سے اسے غسل رجلین کی جگہ رکھا جا سکتا ہے اور اس پر مسح کی گنجائش ہوگی، پس جو جورب رقیق ہوگا خفین کے اوصاف اس میں نہیں پائے جائیں گے، انہیں خفین کا حکم نہیں دیا جا سکتا، اور ان پر مسح کرنا جائز نہ ہوگا؛ لہٰذا نائلون کے موزے اور باریک موزوں پر مسح کرنا جائز نہیں، اس مسئلے کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے: قد روى الإمام أبوبكربن أبي شيبة في مصنّفه: هشيم قال: أخبرنا يونس عن الحسن و شعبة عن قتادة، عن سعيد بن المسيّب والحسن أنّهما قالا: يمسح على الجوربين إذا كانا صفيقين، و رجاله رجال الجماعة.(۳)

قال في أحكام القرآن للجصّاص: والأصل فيه أنّه قد ثبت أنّ مراد الآية الغسل على ما قدمنا فلو لم ترد الآثار المتواترة عن النّبيّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم في المسح على الخفّين لما أجزنا المسح .......... ولما لم ترد الآثار في جواز المسح

(۱) رواه التّرمذي: ۱/۲۹، رقم: ۹۹، باب: في المسح على الجوربين.
(۲) إعلاء السّنن: ۱/ ۳۴۹، باب المسح على الجوربين، ط: أشرفية، ديوبند.
(۳) إعلاء السّنن: ۱/۳۴۹، باب المسح على الجوربين، ط: أشرفية، ديوبند.

علی الجوربين في وزن ورودها في المسح على الخفّين أبقينا حكم الغسل على مراد الآية إلخ (۱) قال في فتح القدير: لا شكّ أنّ المسحَ علٰى الخُفِّ علٰى خِلاَفِ القِياسِ فلا يصلُحُ إلحاقُ غيرِهٖ بهٖ إلّا إذا كان بطريق الدّلالة، وهو أن يكون في معناه، ومعناه السّاتر لِمَحِلِّ الفرضِ الّذي هو بِصَدَدِ مُتَابَعَةِ المَشْيِ فيهِ في السّفرِ وغيرهٖ إلخ. (۲)

نیز موزوں کو باوضو پہننا بھی ضروری ہے، اگر باوضو نہیں پہنا یا پہننے کے بعد اتار دیا تو پھر اس پر مسح جائز نہیں، اسی طرح ایسے جوتوں پر مسح کرنا جن پر خفین کی تعریف صادق نہیں آتی مسح جائز نہیں ــــ اور پاؤں پر مسح کرنا تو ائمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک جائز نہیں۔

## دوسرے وقت کے فرض پڑھنے والے کی اقتداء کرنا

**سوال:** ﴿۲۶﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

ایئر پورٹ، پٹرول پمپ وغیرہ کی مساجد میں مغرب عشاء کے درمیان مسلسل جماعتیں ہوتی رہتی ہیں، جمع بین الصلاتین بھی چلتی رہتی ہے، آنے والے کو پتہ نہیں ہوتا کہ مغرب کی نماز ہو رہی ہے یا عشاء کی تو جماعت میں کس طرح شامل ہوں؟ بعض لوگ مغرب کے لیے عشاء میں شریک ہو کر اپنی مغرب پوری کر لیتے ہیں، پھر عشاء پڑھتے ہیں۔

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰه التّوفيق:**

ایک فرض پڑھنے والے کے لیے دوسری فرض پڑھنے والے کی اقتداء درست نہیں۔ قال في الهداية: ولا يصلّي فرضًا خلف من يصلّي فرضًا آخر (۳) وفي مسلم عن أبي هريرة

(۱) أحكام القرآن للجصّاص: ۳/۳۵۶، دار أحياء التّراث العربي، ط: بيروت.
(۲) فتح القدير: ۱/۱۳۹، باب المسح على الخفّين، ط: الرّشيدية، باكستان.
(۳) الهداية: ۱/۱۲۷، باب الإمامة، ط: تهانوي، ديوبند.

رضي الله عنه أنّ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم قال إنّما جعل الإمام ليؤتمّ به فلا تختلفوا عليه(۱) قال في إعلاء السّنن وفي الحديث دلالة على فساد اقتداء من يصلّي فرضًا آخر فإنّه أيضًا من الاختلاف عن الإمام في النّيّة (۲)وقال أيضًا قد تقدّم كلّ ذلك، ولم نجد نصا في جواز اقتداء المفترض خلف المتنفّل.(۳)

## جماعت پر جماعت کا تسلسل

سوال:﴿۲۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

چین کی طرح مسلسل جماعتیں ہر نماز کے بعد ہوتی رہتی ہیں، اس طرح کہ ہر مسبوق کو امام بنا لیا جاتا ہے، ایسے وقت کیا اس جماعت میں ہم شریک ہو سکتے ہیں؟ نیز اگلی جماعت کے لیے جاریہ جماعت ختم ہونے کا انتظار کرنا کیسا ہے؟

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب وبالله التّوفيق:

اوپر مسبوق کی اقتداء سے متعلق سوال کے ضمن میں یہ مسئلہ تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسبوق کی اقتداء کرنا جائز نہیں، کیوں کہ ابھی تو وہ خود ہی ایک گونہ دوسرے کا مقتدی ہے، پس وہ امام نہیں بن سکتا، لہٰذا مسبوق کو امام بنانے کا جو چین سسٹم کے مشابہ طریقہ ہے یہ غلط ہے، اگلی جماعت کا انتظار کیا جائے۔

## فرض شروع ہوجائے تو درمیان میں سنن ونوافل توڑنے کا حکم

سوال:﴿۲۸﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

(۱) رواه مسلم: ۱/ ۷٦۱، رقم الحديث: ۴۱۴، باب ائتمام المأموم بالإمام.

(۲) إعلاء السّنن: ۴/۲۹۰، باب جواز النّافلة خلف المفترض وعلم جواز عكسه، ط: أشرفية، ديوبند.

(۳) إعلاء السّنن: ٤/ ۲۹۰، باب جواز النّافلة خلف المفترض وعدم جواز عكسه، ط: أشرفية، ديوبند.

کہا جاتا ہے کہ فرض نماز شروع ہو جائے تو نفل نماز فوراً توڑ کر فرض میں شامل ہو جانا چاہیے، یہی حدیث کے مطابق ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

اگر جماعت شروع ہونے سے پہلے سنن ونوافل شروع کر چکا ہے، تو درمیان میں نماز توڑنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ درمیان میں نماز توڑنے سے وہ نماز باطل ہو جائے گی اور قرآن کریم میں اپنے اعمال کو باطل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ﴿وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ﴾ (سورۂ محمد، آیت: ۳۳) (اپنے اعمال کو باطل نہ کرو)؛ لہٰذا ایسا شخص دو رکعت مکمل کر کے پھر امام کے ساتھ جماعت میں شریک ہو، اور اگر تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو چکا تھا تو چار رکعت مکمل کر کے امام کے ساتھ جماعت میں شریک ہو(۱) بہر صورت نماز کو درمیان میں توڑنا درست نہیں ہے اور جو حدیث شریف قیام جماعت کے وقت سنن ونوافل کی عدم مشروعیت پر دلالت کرتی ہے یعنی حدیثِ (إذا أقیمت الصّلاۃ فلا صلاۃ إلّا المکتوبۃ)(۲) اوّلاً اس حدیث شریف کا مرفوع اور قول نبی ہونا مشکوک ہے۔ واختلف علی عمرو بن دینارٍ في رفعہٖ و وقفہ ، وقیل: إنّ ذلك ھو السّبب في کون البخاري لم یخرجہ (۳) ثانیاً اگر اس حدیث کو مرفوع تسلیم کر لیا جائے تو حدیث شریف میں مذکور حکم عام نہیں ہے (وأیضًا: فإنّ حدیث إذا أقیمت الصّلاۃ إلخ ، لیس علی عمومہٖ لما في حدیث الحارث عن عليّ أنّہ کان یصلّي رکعتین عند الإقامۃ، وإذا خصّ منہ الإمام بطل عمومُہ)؛(۴) بلکہ اس شخص کے ساتھ خاص ہے، جو قیام جماعت کے بعد ابتداءً سنن ونوافل شروع کر رہا ہو؛ لیکن اگر کوئی شخص قیام جماعت سے پہلے سنن ونوافل شروع کر چکا، تو وہ اس

(۱) انظر: ردّ المحتار علی الدّرّ المختار: ۲/۵۰۶، باب إدراك الفریضۃ .

(۲) أخرجہ مسلم ، رقم الحدیث : ۷۱۰ ، باب کراھۃ الشّروع في نافلۃ إلخ .

(۳) فتح الباري: ۲/ ۱۴۹ ، باب إذا أقیمت الصّلاۃ فلا صلاۃ إلّا المکتوبۃ .

(۴) إعلاء السّنن: ۵/۱۱۵، باب جواز سنّۃ الفجر عند شروع الإمام في الفریضۃ، ط: أشرفیۃ دیوبند

حدیث شریف کے تحت داخل نہیں، اور اس کے لیے اپنی سنت یا نفل نماز کو درمیان میں توڑنا جائز نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اس سے آیت کریمہ: ﴿ولاَ تُبْطِلُوْا اَعْمَالَکُمْ﴾ (۱) کی مخالفت لازم آئے گی۔

## کالمس (ستون) کے درمیان صف بنانا

**سوال:** ﴿۲۹﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کالمس (ستون) اور کمانوں کے درمیان صف بنانا صحیح نہیں ہے، ایسا کرنے سے نماز نہیں ہوتی، اس کی حقیقت کیا ہے؟

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

اگر مسجد میں گنجائش ہے تو کالمس (ستون) کے درمیان صف بنانا مکروہ ہے، کیوں کہ اس سے صف درمیان سے منقطع ہوجاتی ہے، جب کہ دورانِ جماعت صفوں میں مل مل کر کھڑا ہونا ضروری ہے **عن عبد الحميد بن محمود قال: صلّينا خلف أمير من الأمراء فاضطرّنا النّاس، فصلّينا بين السّاريتين (ولفظ الحاكم: فتأخّر أنسؓ) فلمّا صلّينا قال أنس بن مالك: كنّا نتقى هذا على عهد رسول الله صلّى الله عليه وسلّم رواه التّرمذيّ، وقال حسن صحيح** (۲)

البتہ اگر مسجد میں جگہ کی تنگی ہے تو کالمس کے درمیان صف بنانے کی گنجائش ہے۔ **وقال ابن العربي: ولاخلاف في جوازہٖ عند الضّيق، وأمّا عند السّعة فهومكروه للجماعة** (۳)

یہ حکم جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کے لیے ہے، منفرد کے لیے دوستونوں کے درمیان نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہے۔ **(أمّا الواحد فلا بأس بہٖ وقد صلّى صلّى الله عليه وسلّم**

---

(۱) سورۂ محمد، آیت: ۳۳۔

(۲) رواه التّرمذي: ۱/۵۳-۵۴، رقم: ۲۲۹، باب: ما جاء في كراهية الصّفّ بين السّواري.

(۳) إعلاء السّنن: ۴/۳۸۳، باب: كراهة الصّفّ بين السّواري دون الصّلاة منفردًا، ط: أشرفية، ديوبند.

**فـي الكعبة بين سواريها** (۱) اسی طرح امام کے لیے جب کہ اس کے دونوں پیر در سے باہر ہوں، دو ستونوں کے درمیان کھڑا ہونا درست ہے۔ (**ولـكـن يـنـبـغي إذا قام الإمام بين السّاريتين أن تكون قدماه خارجتين والسّجود بينهما.** (۲))

## فرض نمازوں اور وعظ وتقریر کے بعد دعا کی شرعی حیثیت

**سوال:** ﴿۳۰﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

نمازوں کے بعد دعا کو بدعت کہہ کر منع کیا جاتا ہے، اس کے بجائے ذکر کا خاص اہتمام ہوتا ہے حتی کہ سنن مؤکدہ سے بھی زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے، نیز بیان اور وعظ کے بعد جو اجتماعی دعا کی جاتی ہے اس کو خلاف سنت؛ بلکہ بدعت قبیحہ کہا جاتا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ کہتے ہیں کہ دعائیں انفراداً ہونی چاہیے۔

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وبالله التّوفيق :**

نمازوں کے بعد انفراداً دعا مسنون ومشروع ہے، احادیث قولیہ وفعلیہ سے اس کا ثبوت بھی ہے، اور ترغیب بھی ہے، نیز نمازوں کے بعد دعا کی مقبولیت کی طرف اشارہ ہے، **عن أبي أمامة رضي الـلّـه عنه قال: ما دنوت من رسول الله صلّى الله عليه وسلّم في دبر صلاة مكتوبة ولا تـطـوّع إلّا سمعته يقول : اللّهمّ اغفرلي ذنوبي و خطاياي كلّها اللّهمّ أنعِشْنِيْ واجبـرنـي واهـدنـي لـصالح الأعمال والأخلاق ، إنّه لا يهدي لصالحها ولا يصرف سيئها إلّا أنت** (۳) **عـن أبـي أمامة رضي الله عنه قال: قيل يا رسول الله : أي الدّعاء**

(۱) إعـلاء السّنن: ۳۸۳/۴، بـاب: كـراهة الـصّفّ بيـن السّـواري دون الصّلاة منفردًا، ط: أشرفية ، ديوبند .

(۲) إعـلاء السّنن: ۳۸۲/۴، بـاب: كـراهة الـصّفّ بيـن السّـواري دون الـصّلاة منفردًا، ط: أشرفية ، ديوبند .

(۳) عمل اليوم واللّيلة لابن السّنّي: رقم: ۱۱۶، ۱۰۴/۱، ط: جدّة .

أسمع، قال: جوف اللّيل الآخر ودبر الصّلوات المكتوبات رواه التّرمذيّ وقال هذا حديث حسن (۱) عن معاذ بن جبل رضي اللّٰه عنه قال: لقيت النّبيّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم فقال لي: يا معاذ! إنّي أحبّك فلا تدع أن تقول في دبر كلّ صلاة: اللّٰهمّ أعِنّي على ذكرك وشكرك وحسن عبادتك (۲) اسی طرح کی متعدد احادیث سے نماز کے بعد دعا کا مشروع و ماٴمور و مطلوب ہونا ثابت ہوتا ہے؛ لہٰذا نماز کے بعد دعا کو بدعت کہنا درست نہیں۔

نماز کے بعد حضور ﷺ سے ذکر کرنا ثابت ہے، اور کتب احادیث میں مختلف اذکار مروی ہیں (۳) مگر خصوصیت کے ساتھ التزام کرنا یعنی اس کو واجب اور ضروری سمجھنا اور نہ کرنے والے پر ملامت کرنا شرعًا ثابت نہیں؛ لہٰذا نفس ذکر جائز ہے؛ مگر التزام منع ہے۔ الإصرار على المندوب يبلغ إلى حدّ الكراهة (۴) دعا انفرادًا اور اجتماعًا دونوں طریقہ سے ثابت ہے، اجتماعی دعا کا ثبوت بھی قرآن و حدیث اور عمل صحابہ سے ہے۔ قوله تعالىٰ: ﴿قَدْ أُجِيبَتْ دَّعْوَتُكُمَا﴾ (۵) کے تحت مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی، اور حضرت ہارون نے آمین کہا۔ حدیث میں ہے: لا يجتمع مَلَأٌ فيدعو بعضهم ويؤمن بعضهم إلّا أجابهم اللّٰه (۶) نیز حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبد اللہ بن جحش نے غزوۂ اُحد میں اس طرح دعا مانگی کہ پہلے ایک نے دعاء کی اس پر دوسرے نے آمین کہا، پھر دوسرے نے دعا کی اور پہلے نے آمین کہا (۷) نصوص مذکورہ سے مختلف مواقع پر اجتماعی دعا کا ثبوت ملتا ہے، نیز حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: الدّعاء مخّ العبادة (۸)

(۱) رواه التّرمذي: رقم: ۳۴۹۹، باب: بلا عنوان.
(۲) عمل اليوم واللّيلة لابن السّنّي: رقم: ۱۱۸، ۱/۱۰۶، ط: جدّة.
(۳) المنتقى المختار من كتاب الأذكار – للصّابوني، ص: ۲۰، بعنوان: الأذكار بعد الصّلاة
(۴) السّعاية: ۲/۲۶۵، باب: صفة الصّلاة، ط: شيخ الهند، ديوبند.
(۵) سورۂ یونس، آیت: ۸۹۔
(۶) تلخيص الذّهبيّ مع مستدرك: ۳/۳۹۰، رقم: ۵۴۷۹، ط: دار الكتب العلميّة، بيروت.
(۷) حياة الصّحابة: ۲/ ۱۱۸، باب تمني عبداللّٰه بن جحش الشّهادة، ط: مؤسّسة الهالة، بيروت
(۸) أخرجه التّرمذي: ۲/۱۷۵، رقم: ۳۳۷۱، باب: منه أي فضل الدّعاء.

(دعا عبادت کا مغز اور خلاصہ ہے) اور تبلیغ دین کے لیے وعظ کرنا بھی من جملہ عبادات کے ہے؛ لہٰذا وعظ اور بیان کے اختتام پر اجتماعی دعا کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ التزام ممنوع ہے۔

## دورانِ نماز محراب میں لگی اسکرین میں دیکھ کر نماز پڑھنا

**سوال:** ﴿۱۳۱﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

محراب میں لگے ہوئے اسکرین پر دیکھ کر یا جیب سے موبائل یا حمائل نکال کر اس میں دیکھ کر نماز پڑھانے والے امام کے پیچھے نماز کا کیا حکم ہے؟ اور کیا نماز میں نظراً تلاوت کی گنجائش ہے؟

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

نماز میں دیکھ کر قرآن کریم پڑھنا مفسد صلاۃ ہے، اس لیے کہ یہ تلقن من الخارج ہے، جو کہ مفسد ہے، جیسا کہ کسی خارج نماز شخص سے لقمہ لینا مفسد ہے۔ شامی میں ہے : **أنـه تلقن من المصحف فصار كما إذا تلقن من غيره** (۱) نیز اعلاء السنن میں ابوداؤد اور ترمذی کی ایک روایت سے اس پر استدلال کیا گیا؛ چناں چہ اعلاء السنن میں ہے: **عـن رفـاعة بن رافع أنّ رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عـليـه وسلّم علم رجلاً الصّلاة فقال : إن كان معك قرآنًا فاقرأ، و إلاّ فاحمد اللّٰه وكبّره وهلّله ثمّ اركع – رواه أبـوداؤد والتّرمذي، وقال: حديث حسن. فنقول: لو كانت الـقـراء ة منه مباحة في الصّلاة غير مفسدة لها كما زعمه بعضهم لكان ذلك واجبًا عـلـى العاجز عن الحفظ ، لكونهٖ قادرًا على القراء ة من وجهٍ** (۲) (ترجمہ: یعنی حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز سکھلائی، پھر اس سے کہا: اگر تمہارے پاس کچھ قرآن ہے، یعنی تمہیں اگر قرآن کا کچھ حصہ حفظ ہے تو (نماز میں) اسے پڑھو، ورنہ (قراءت کی جگہ) اللہ کی حمد کرو، اور تکبیر وتہلیل پڑھو، اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے

(۱) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۲/۳۸۴، باب ما يفسد الصّلاة وما يكره فيها .

(۲) إعلاء السّنن: ۵/ ۵۹، باب: فساد الصّلاة بالقرأة من المصحف ، ط: أشرفية، ديوبند .

روایت کیا پھر فرمایا: (یہ حدیث) حسن ہے، میں (صاحبِ اعلاء السنن) کہوں گا: نماز میں دیکھ کر قرآن پڑھنا اگر مباح ہوتا، مفسد صلات نہ ہوتا جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے تو حفظ سے عاجز شخص پر (نماز میں دیکھ کر تلاوت کرنا) واجب ہوتا؛ اس لیے کہ وہ من وجہٍ تلاوت پر قادر ہے)۔

# نابالغ بچے کی امامت کا حکم

**سوال:** ﴿۳۲﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

بعض مرتبہ نابالغ بچے امامت کر دیتے ہیں، بعض مسجدوں میں مستقلاً پڑھاتے ہیں، ان کی اقتدا کا کیا حکم ہے؟

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق:**

نابالغ بچے کی امامت خواہ کسی بھی نماز میں ہو درست نہیں ہے **عن ابن مسعود رضي اللّٰه عنه لا يؤم الغلام حتّى تجب عليه الحدود. وعن ابن عبّاس قال لا يؤم الغلام حتّى يحتلم (رواهما الأثرم) في سننه، وأثر ابن عبّاس رواه عبد الرّزّاق مرفوعًا بإسناد ضعيف. وعن ابن عبّاس قال: نهانا أمير المؤمنين عمر أن تؤمّ النّاس في المصحف ونهانا أن يؤمنا إلّا المحتلم كذا في كنز العمّال** [۱] (ترجمہ: یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بچہ امامت نہ کرے؛ تاوقتیکہ اس پر حد واجب نہ ہو جائے (یعنی بالغ ہو جائے؛ کیوں کہ بلوغت سے پہلے حد واجب نہیں ہوتی) اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: بچہ امامت نہ کرے، یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے ...... ابن عباس رضی اللہ عنہما کے (ایک دوسرے) اثر میں ہے کہ انہوں نے فرمایا: امیر المؤمنین عمر نے ہمیں منع کیا کہ ہم قرآن کریم دیکھ کر لوگوں کی امامت کریں، اسی طرح نابالغ کو امامت سے منع فرمایا)۔

---

(۱) **كنز العُمّال، ص:۲۶۲۰، رقم: ۲۲۸۳۷، فصل في آداب الإمام.**

## روضۂ اقدس پر دوسروں کا سلام پہنچانا

**سوال:** ﴿۴۳﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

کہا جاتا ہے کہ روضۂ اقدس رسول اللہ ﷺ پر خود تو سلام عرض کر سکتا ہے، لیکن دوسروں کا سلام پہنچانا صحیح نہیں ہے، اس کی اصل کیا ہے؟

**باسمہٖ تعالیٰ**

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

انسان جس طرح خود اپنی طرف سے سلام کر سکتا ہے دوسرے کی طرف سے بھی سلام پہنچا سکتا ہے۔ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے اپنے والد کی طرف سے آپ ﷺ کو سلام پہنچایا تو آپ ﷺ نے جواب دیا اور فرمایا: **علیك وعلٰی أبیك السّلام** (۱) نیز اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک دلائل شرعیہ سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور ﷺ قبر اطہر میں ہوتے ہوئے سلام پیش کرنے والوں کا سلام سنتے ہیں؛ لہٰذا انسان خود اپنا سلام پیش کرے یا کسی دوسرے کا، بہر صورت آپ ﷺ دونوں کا سلام سنیں گے، فرق کی کوئی وجہ نہیں۔

## کیا بڑوں، بزرگوں کے لیے حضرت، یا مولانا کہنا شرک ہے؟

**سوال:** ﴿۴۴﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

کہا جاتا ہے کہ بڑوں بزرگوں کے لیے ’’حضرت‘‘ یا ’’مولانا‘‘ جیسے الفاظ کا استعمال شرک ہے، اس کے بجائے ’’شیخ‘‘ کہنا چاہیے، صحیح کیا ہے؟

**باسمہٖ تعالیٰ**

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

’’حضرت‘‘ یا ’’مولانا‘‘ اعزازی لقب کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں

(۱) أبوداؤد: ۷۱۰/۲، رقم: ۵۲۳۱، باب في الرّجل یقول فلان یقرئك السّلام .

اسے شرک کہنا غلط ہے، ایک لفظ کے مختلف معانی ہوتے ہیں، موقع اور محل کے اعتبار سے مرادی معنی کی تعیین ہوتی ہے، مثلاً لفظ ''مولیٰ'' اس کے عربی اور اردو لغت میں آقا، سردار، جناب، سلطان، آزاد کردہ، غلام وغیرہ بہت سے معانی لکھے ہیں، اور حدیث میں بھی لفظ ''مولانا'' غیر اللہ کے لیے استعمال ہوا ہے، چناں چہ بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت زید کو **أنت أخونا ومولانا** فرمایا، نیز ابن ماجہ وغیرہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے حضور ﷺ کا یہ جملہ ثابت ہے، **من كنت مولاه فعليٌّ مولاه**.(۱)

## ویزٹ ویزا پر آنے والوں کا قانوناً ممنوع ہونے کے باوجود حج وعمرہ کرنا

**سوال:** ﴿۳۵﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

ویزٹ ویزا پر آنے والوں کو عمرہ یا حج کرنا قانوناً ممنوع ہے، لیکن عام طور سے کیا جاتا ہے، کیا یہ حاکم اسلام کی نافرمانی ہے؟

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰه التّوفيق :**

''ویزا'' درحقیقت حکومت کے ساتھ ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ وہ فلاں کام کے لیے آپ کے ملک میں آنے کی اجازت چاہتے ہیں، اور ''معاہد'' پر شرائط کی پابندی ضروری ہے، بہ شرطیکہ کوئی شرط خلافِ شرع نہ ہو، ترمذی کی حدیث میں ہے : **والمسلمون على شروطهم إلاّ شرطًا حرّم حلالاً أو أحلّ حرامًا** ؛(۲) لہٰذا اگر شرائط ویزا میں یہ بھی داخل ہو کہ وہ اس ضمن میں حج یا عمرہ نہ کرے گا، تو اس کی رعایت ضروری ہے، ورنہ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے والا شمار ہوگا، باقی اگر بااختیار حکام صراحۃً یا دلالۃً کسی موقع پر اجازت دے دیں تو یہ الگ بات ہے۔

---

(۱) أخرجه التّرمذي ، رقم: ۳۷۱۳، باب مناقب عليّ بن أبي طالب رضي الله تعالىٰ عنه .

(۲) أخرجه التّرمذي : ۲۵۱/۱، رقم:۱۳۵۲، بـاب : مـا ذكر عن رسول الله – صلّى الله عليه وسلّم – في الصّلح بين النّاس .

## بے ڈھب اور اشتہار چھپے ہوئے لباس میں نماز پڑھنے کا حکم

**سوال:** ﴿۳۶﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

عام طور سے نوجوان سوتے وقت اور کھیلتے وقت پہنے جانے والے لباس میں نماز کے لیے آتے ہیں، جو بالکل بے ڈھب قسم کے ہوتے ہیں، ٹی شرٹ کی آستین نہیں ہوتی، کمپنیوں کے اشتہار یا نمبر چھپے ہوتے ہیں، پینٹ اتنے ملائم کہ اعضاء کی حرکات نمایاں ہوتی ہیں، چھوٹے اس قدر کہ گھٹنے سے متصل ہوتے ہیں، سر تو سب کے کھلے رہتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ شریعت میں نماز کے لیے لباس کے اہتمام کا کیا حکم ہے؟ یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک یا دو چادروں میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے، یہ سب اہتمام نہیں تھا۔

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

اس قدر چست یا باریک لباس پہننا جس سے اعضائے مستورہ کی حرکات یا حجم نظر آئے ناجائز وحرام ہے۔ تکملہ فتح الملہم میں ہے: **وكذلك اللّباس الرّقيق أو اللّاصق بالجسم الّذي يحكي للنّاظر شكل حصّة من الجسم الّذي يجب ستره فهو في حكم ما سبق في الحرمة وعدم الجواز** (۱) اسی طرح ننگے سر نماز پڑھنا یا کہنیاں کھول کر نماز پڑھنا، خواہ قمیص، شرٹ نیم آستین ہو یا آستین چڑھائی گئی ہو، مکروہ ہے۔ **وكره ......... صلاته حاسرًا أي كاشفًا رأسه للتّكاسل** (۲) **وكذا في معارف القرآن تحت قوله تعالىٰ:** ﴿يَا بَنِيْ آدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ الآية﴾ (۳) نیز کمپنی کے اشتہارات پر مشتمل قمیص، شرٹ، ٹی شرٹ، وغیرہ پہن کر نماز پڑھنا بھی کراہت سے خالی نہیں؛ اس لیے کہ یہ بے ڈھب ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر مصلیوں کے لیے

---

(۱) تکملة فتح الملهم: ۴/۵۳، ط: أشرفي، ديوبند .

(۲) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۲/۴۰۷، باب ما يفسد الصّلاة وما يكره فيها.

(۳) معارف القرآن: ۳/۵۴۳، ط، ربّاني بك ڈپو.

تشویش کا باعث بھی بنتا ہے، حضور ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں بھی خصوصًا نماز کے وقت لباس کا اہتمام ہوتا تھا، خود قرآن کریم میں ہے: ﴿یَا بَنِيْ آدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ﴾(۱) اس آیت میں بہ وقت نماز زینت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا، چنانچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ نماز کے وقت اپنا سب سے بہتر لباس پہنتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جمال کو پسند کرتا ہے؛ اس لیے میں اپنے رب کے لیے زینت و جمال اختیار کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ﴾(۲) رہا حضور ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا دو چادروں میں نماز پڑھ لینا تو عدم اہتمام کی وجہ سے نہ تھا؛ بلکہ یہ اس وقت کا عام لباس تھا، کسی بھی روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ آنحضرت ﷺ یا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے پاس اچھے کپڑے ہونے کے باوجود محض تساہلاً معمولی درجہ کے لباس میں نماز ادا کرتے تھے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲/۱۱/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام غفرلہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## معذورِ شرعی کی تعریف اور کچھ دیگر تفصیلات

سوال: ﴿۳۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

(۱) شریعت میں معذور کس کو قرار دیا جائے گا؟ کیا عذر کے سلسلے میں ابتداء اور بقاء میں کچھ فرق ہے؟ براہِ کرم مفصل اور مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

(۲) معذور کا حکم کیا ہے؟

(۳) اگر ایک وقت میں ایک عذر کے علاوہ کوئی دوسرا عذر پیش آجائے تو کیا حکم ہے؟

(۴) معذور کے کپڑوں کا کیا حکم ہے؟ انتہائی مؤدبانہ گذارش ہے کہ مذکورہ سوالات کا فقہی

(۱) سورۂ اعراف، آیت: ۳۱۔

(۲) ملخّص روح المعاني: ۱۰۹/۵، ط: ملتان، باکستان.

عبارتوں کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔　　والسلام

مستفتی: محمد عبداللہ حیدر آبادی

۵۴۶/د ۱۴۳۳ھ

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

(۱) کسی نماز کا کامل وقت اِس حالت میں گذر جائے جس میں نقضِ وضو کا سبب تسلسل کے ساتھ پایا جائے، یعنی اتنی دیر کے لیے بھی بند نہ ہو کہ وضو کر کے فرض نماز پڑھی جا سکے، اگر ایک نماز کے پورے وقت میں یہ کیفیت پائی جائے، تو شرعًا اسے معذور قرار دیا جائے گا، اس کے بعد جب تک پورے وقت میں ایک مرتبہ بھی وہ عذر پایا جائے گا وہ معذور برقرار رہے گا، اور اگر آئندہ کسی نماز کا پورا وقت اس عذر سے خالی گذر گیا، تو وہ شخص ''معذورِ شرعی'' کے حکم سے خارج ہوجائے گا، گویا ابتدائے عذر کے تحقق کے لیے نقضِ وضو کے سبب میں مذکورہ تفصیل کے ساتھ تسلسل پایا جانا ضروری ہے اور عذر کی بقاء کے لیے وقت میں ایک مرتبہ اس سبب کا پایا جانا کافی ہے، اور عذر کے ختم ہونے کے لیے پورے وقت کا اس سبب سے خالی رہنا ضروری ہے۔ **وصاحب عذر من بہٖ سلس البول إلی قولہ : إن استوعب عذرہ تمامَ وقت صلاۃ مفروضۃ بأن لا یجد في جمیع وقتھا زمنًا یتوضّأ ویصلّي فیہ خالیًا عن الحدث ولو حکمًا** (۱) **وإذا انقطع الدّم ونحوہ من الأعذار وقتًا کاملاً یخرج من أن یکون صاحب عذر** (۲)

(۲) معذور کا حکم یہ ہے کہ وہ نماز کے ہر وقت کے لیے مستقل وضو کرے گا، پھر اُس وضو سے وقت کے اندر اندر جتنی چاہے فرض نفل نمازیں پڑھے۔ درمختار میں ہے : **وحکمہ الوضوء إلی قولہٖ : ثمّ یصلّي بہٖ فیہ فرضًا و نفلاً** (۳)

(۱) ردّ المحتار علی الدّرّ المختار : ۱/۵۰۴ .

(۲) حلبي کبیري، ص: ۱۳۶، ط: أشرفي دیوبند .

(۳) ردّ المحتار: ۱/۵۰۵ .

(۳) اگر اس عذر کے علاوہ کوئی دوسرا ناقض پیش آجائے تو دوبارہ وضو کرنا ضروری ہے۔ ثُـمّ طَرَأَ عليهِ حَدَثٌ آخرُ ، بِأَنْ سَالَ أَحَدُ منخرَيْهِ – فَلاَ تَبْقٰى طَهَارَتُهُ (۱)

(۴) معذور کے کپڑوں کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کو اتنا وقت بھی نہیں مل پاتا کہ مکمل نماز پاک کپڑوں میں پڑھ سکے نماز کے دوران ہی کپڑا ناپاک ہوجاتا ہے تو ایسے شخص کے لیے کپڑوں کا دھونا ضروری نہیں، اُنہیں کپڑوں میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ وإنْ سَـالَ عَلٰى ثَوْبِهٖ فَوْقَ الدِّرْهَمِ جَازَ لَهُ أَنْ لَا يَغْسِلَهُ إنْ كَانَ لَوْ غَسَلَهُ تَنَجَّسَ قَبْلَ الْفَرَاغِ مِنْهَا أي: الصَّلَاةِ.(۲)

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۱/۳/۱۴۳۳ھ
الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہٗ
مفتیان دارالعلوم دیوبند

## صلاۃ المریض سے متعلق بعض جزئیات کا حکم

محترم المقام حضرت مفتی صاحب　　　زید مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

**سوال:** ﴿۳۸﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

عرض یہ ہے کہ مریض معذور حضرات کی نماز کے مندرجہ ذیل سوالات کے جواب شریعت مطہرہ کی روشنی میں عنایت فرما کر ممنون فرمائیں:

(۱) ایک مریض کو ۶ سال سے گھٹنوں میں درد کی شکایت ہے، جس کی وجہ سے رکوع سجدے کے لیے موڑنے اور زمین پر رکھنے میں سخت تکلیف ہوتی ہے، ڈاکٹروں نے کرسی پر نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے، یہ مریض قیام ورکوع کرسکتا ہے سجدہ نہیں کرسکتا، کیا ایسا مریض قیام ورکوع کرلے اور کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے سجدہ کرے یا کرسی پر بیٹھ کر بھی قیام، رکوع، سجود کرے؟

(۱) المصدر السّابق، ص: ۵۰۷–۵۰۸ .
(۲) المصدر السّابق، ص: ۵۰۶ .

(۲) ایک مریض کی ران کی ہڈی گھٹنے کے اوپر سے ٹوٹ گئی ہے، یا گھٹنوں کے جوڑوں میں درد اور ورم کی وجہ سے ان کو موڑنا دشوار ہے، ڈاکٹر نے ٹانگیں موڑنے سے منع کیا ہے، پھیلانے کے لیے تاکیدی حکم ہے، البتہ سہارے سے تکیہ لگا کر بیٹھ سکتے ہیں، ایسے مریض کی نماز کی صورت تحریر فرمائیں۔

(۳) ایک مریض ایسا ہے جس کی ٹانگ ٹوٹ جانے کی وجہ سے پلاسٹر چڑھا ہوا ہے یا اسٹیل کی راڈ ڈلی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے کرسی پر بیٹھ سکتا ہے یا سرین پر کمر کو سہارا لگا کر بیٹھ سکتا ہے، رکوع، سجدہ نہیں کرسکتا، کیا ایسا شخص کرسی یا زمین پر بیٹھ کر رکوع، سجدہ کا اشارہ کرے یا قیام کرے، اور رکوع، سجدے کے لیے کرسی یا زمین پر بیٹھ کر اشارہ کرے، جائز ہے یا ناجائز؟ اولیٰ عدم اولیٰ کی وضاحت سے لکھیں۔

(۴) ایک مریض ایسا ہے جس کی ٹانگ ٹوٹ گئی یا گھٹنوں میں درد، ورم ہے یا دل کا آپریشن ہوا ہے، والیں ڈلی ہیں، یا ایسی کوئی تکلیف ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹروں نے جھکنے، رکوع سجدہ کرنے سے منع کیا ہے؛ لیکن کرسی اور زمین پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھ سکتا ہے، کیا ایسے مریض کے لیے کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنا بہتر ہے یا زمین پر اشارہ سے؟

(۵) کرسی یا زمین پر بیٹھ کر نماز پڑھنے والے معذورین نماز باجماعت کے لیے صفوف کے پیچھے میں رہیں، یا کنارہ پر؟ نیز اگلی صف میں یا پیچھے؟ جو صورت بہتر ہو تحریر فرمائیں؟

(۶) بیٹھ کر یا لیٹ کر اشارہ سے نماز پڑھنے والا آدمی پاؤں سمیٹ نہیں سکتا، کیا یہ شخص چہرہ بہ جانب قبلہ کرنے کے لیے پاؤں قبلہ کی طرف پھیلا سکتا ہے؟

(۷) ایک مریض کی ایک ٹانگ میں ایسی تکلیف ہے، جسے موڑ نہیں سکتا، دوسری کو موڑ سکتا ہے تو کیا بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں دونوں قبلہ رُخ پھیلائے یا صرف عذر والی ٹانگ کو؟

(۸) ایک مریض ایسا ہے جو قیام اور رکوع کرسکتا ہے؛ لیکن سجدہ نہیں کرسکتا، کیا یہ سامنے کوئی چیز اسٹول، کرسی رکھ کر اس پر سجدہ کرے یا تختی، تکیہ وغیرہ اٹھا کر پیشانی سے لگالے، ان دونوں صورتوں میں نماز کا کیا حکم ہے؟ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مستفتی: الحاج حافظ محمد راشد صاحب کولکاتا

معرفت: حضرت الحاج مولانا محمد الطاف صاحبؒ مجناوری، ۵۳۹/ د ۱۴۳۵ھ

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

(۱) صورتِ مذکورہ میں ایسا معذور جو قیام ورکوع پر قادر ہے؛ لیکن سجدہ نہیں کرسکتا، اور شدید تکلیف کی وجہ سے وہ کسی بھی ہیئت میں زمین پر بیٹھنے پر قادر نہ ہوتو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ کرسی پر بیٹھ کرہی رکوع اورسجدے کے اشارے سے نماز پڑھے۔...... **وھو صحیح فیما سوی ذلك یقدر علی الرّکوع والقیام والقراء ۃ یصلّي قاعدًا ویؤمي إیماءً ، ولو صلّی بالرّکوع وقعد و أومأ بالسّجود أجزأہ ، والأوّل أفضل**(۱)

(۲) ایسے معذور شخص کے لیے جس طرح بھی بیٹھنے میں سہولت وآسانی ہوخواہ پیروں کو پھیلا کر یا تکیہ وغیرہ سے سہارا لے کر، اس ہیئت کو اختیار کر کے زمین پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز ادا کرے، یہی افضل وبہتر ہے، البتہ ایسے معذور کے لیے کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز ادا کرنے کی بھی گنجائش ہے۔(۲)

(۳) ایسا شخص جو رکوع وسجدہ نہیں کرسکتا، لیکن وہ زمین پر کسی بھی طرح بیٹھ سکتا ہے، چاہے پیروں کو پھیلا کر یا کسی چیز مثلاً: تکیہ وغیرہ سے ٹیک لگا کر تو زمین پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز ادا کرنا ہی افضل ہے، گواس کے لیے کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنے کی بھی گنجائش ہے، اسی طریقہ سے قیام کر کے رکوع وسجدہ کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے بھی ادا کرسکتا ہے۔ **وإن تَعَذَّرَا لیسَ تعذُّرُھُمَا شرطًا بلْ تعذُّرُ السُّجُودِ کافٍ لا القیامُ أوْمَأَ ...... قاعدًا، وھو أفضلُ من الإیماءِ قائِمًا لِقُربہٖ منَ الأرضِ**(۳)

(۴) ایسے معذور کے لیے جس طرح بھی بیٹھنے میں سہولت وآسانی ہوخواہ پیروں کو پھیلا کر یا آلتی پالتی مار کر یا تورک کی حالت پر (عورت کے تشہد میں بیٹھنے کی طرح) یا تکیہ وغیرہ سے ٹیک اور

---

(۱) الفتاویٰ الھندیة: ۱۳۸/۱ .

(۲) من تعذّر علیه القیامُ ........... لِمَرَضٍ حقیقيّ ، وحَدُّهُ أن یَلحقَه بالقیامِ ضررٌ ........... أو حکمي بأن خاف زیادَتَه أو بُطْءَ بُرْئِهٖ بِقِیامِهٖ ........... أو وجدَ لقیامِهٖ ألمًا شدیدًا ، صلّی قاعدًا ........... کیف شاءَ ....... من تربع أو غیرہ ، الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۵٦٤/۲ .

(۳) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار :۵٦۷/۲، باب: صلاۃ المریض .

سہارا لگا کر، بہر حال اس ہیئت کو اختیار کر کے زمین پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھے، یہی افضل ہے؛ البتہ کرسی پر بیٹھ کر بھی نماز ادا کرسکتا ہے؛ لیکن زمین پر کسی بھی ہیئت میں بیٹھنے پر قدرت کے باوجود کرسی پر بیٹھ کر نماز ادا کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

(۵) ایسے معذور کے لیے کسی صف کی کوئی تعیین نہیں ہے، جس صف میں جگہ ملے وہیں نماز ادا کرے اور وہ شخص درمیان صف میں بیٹھ کر بھی نماز ادا کرسکتا ہے؛ البتہ کرسی پر ادا کرنے والے کے لیے بہتر یہ ہے کہ صف کے کنارے نماز پڑھے، اور اگر صف میں لوگ اتنے کم ہوں کہ کنارے پر ہونے کی صورت میں درمیان صف میں جگہ خالی رہ رہی ہو، تو درمیان صف سے مل کر نماز ادا کرے؛ کیوں کہ تسویۂ صفوف سنت مؤکدہ ہے، اور درمیان صف میں خلا چھوڑ کر کنارے نماز ادا کرنے والے پر احادیث میں وعیدیں وارد ہوئی ہیں، حدیث: **من وصل صفًّا وصله الله، ومن قطع صفًّا قطعه الله عزّ وجلّ.** (۱)

(۶) لیٹ کر نماز پڑھنے والے مریض کے لیے اگر اپنے گھٹنوں کو کھڑا کرنا ممکن ہے، تو بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے گھٹنوں کو کھڑا کر کے لیٹے لیٹے نماز پڑھے؛ لیکن اگر گھٹنوں کو کھڑا کرنا ممکن نہ ہو مثلاً: پلاسٹر چڑھا ہو، یا ناقابلِ برداشت تکلیف ہوتی ہو تو ایسا معذور اپنے پیروں کو قبلہ رخ پھیلا سکتا ہے؛ البتہ اپنے سر کے نیچے تکیہ وغیرہ رکھ لے؛ تاکہ اس کا سر قبلہ رخ ہوجائے۔ **أوْمَأَ مُسْتَلقِيًا علىٰ ظهرِه، و رِجْلاهُ نَحوَ القِبلَةِ غيرَ أنّه يَنْصِبُ رُكْبَتَيْهِ لِكَرَاهَةِ مَدِّ الرِّجْلِ إلى القِبْلَةِ.** (۲)

(۷) بغیر کسی عذر کے پیروں کو قبلہ رخ پھیلانا مکروہ تنزیہی اور بے ادبی ہے، اس لیے جس پیر کو موڑنے میں ناقابلِ برداشت تکلیف ہوتی ہو صرف اسے قبلہ رخ پھیلایا جائے، لیکن جس پیر کو معمولی تکلیف اور قابلِ برداشت درد کے ساتھ موڑا جاسکتا ہو اُسے قبلہ رخ پھیلانے سے گریز کیا جائے، یہی افضل و بہتر ہے۔ (۳)

---

**(۱) أخرجه النّسائيّ، رقم: ۸۱۹، باب: من وصل صفًّا.**

**(۲) الدّرّ مع الرّدّ: ۲/۵۶۹.**

**(۳) وقالوا يكره أن يمدّ رجليه في النّوم وغيره إلى القبلة أو المصحف أو كتب الفقه إلاّ أن يكون علىٰ مكان مرتفع من المحاذاة. (كبيري، ص: ۳۸، مناهي الوضوء)**

(۸) جو معذور شخص سجدہ کرنے پر قادر نہ ہو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ شخص زمین پر بیٹھ کر اشارے سے نماز ادا کرے؛ کیوں کہ عذر کی وجہ سے ارکان ساقط ہوگئے، اور کرسی پر بھی نماز جائز ہے، لیکن افضل اور بہتر نہیں ہے؛ اس لیے اس صورت میں کسی میز، اسٹول اور کرسی وغیرہ پر سجدہ کرنے کی ضرورت نہیں، تاہم اگر ان چیزوں پر سجدہ کرلیا تو چوں کہ سر کا جھکانا پالیا گیا؛ اس لیے سجدہ ادا ہوجائے گا، **بخلاف ما إذا كان موضوعًا على الأرض ......... فإن كانت الوسادة موضوعة على الأرض ، وكان يسجد عليها جازت صلاته.** (۱)

اور سجدہ کرنے کے لیے کوئی چیز اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگانا مکروہ تحریمی ہے؛ لیکن اگر کوئی معذور تختی، تکیہ وغیرہ اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگالے تو یہ دیکھا جائے گا کہ اگر اس نے سجدہ کے لیے اپنا سر رکوع کی بہ نسبت زیادہ جھکایا ہے تو سجدہ ادا ہوجائے گا اور نماز درست ہوگی؛ لیکن اگر اس نے اپنا سر بالکل نہیں جھکایا، یا رکوع سے کم یا اس کے برابر جھکایا اور تختی وغیرہ اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگالی تو اس سے سجدہ ادا نہیں ہوگا، اور نماز فاسد ہوجائے گی۔ درمختار میں ہے: **ولا يرفع إلى وجهه شيئًا يسجد عليه فإنّه يكره تحريمًا ، فإن فعل ...... وهو يخفض برأسه لسجوده أكثر من ركوعه صحّ ...... وإلا يخفض لا يصحّ لعدم الإيماء ...... أي لم يخفض رأسه أصلاً ؛ بل صار يأخذ ما يرفعه ويلصقه بجبهته للرّكوع والسّجود ، أو خفض رأسه لهما ؛ لكن جعل خفض السّجود مساويًا لخفض الرّكوع لم يصح لعدم الإيماء لهما أو للسّجود.** (۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۹/۴/۱۴۳۵ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

(۱) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۲/۵٦۸، باب: صلاة المريض .

(۲) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۲/۵٦۸-۵٦۹، باب: صلاة المريض .

# غیر حنفی کے پیچھے حنفی کا وتر پڑھنا
# اور جمع بین الصلاتین وغیرہ کا حکم

**سوال:** ﴿۳۹﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

(۱) سعودی عرب میں صلاۃ المفترض خلف المتنفل کا رواج تو تھا ہی؛ لیکن عرصے سے لوگوں نے مسبوق کی اقتداء بھی شروع کر دی ہے، ہوتا یہ ہے کہ کوئی شخص جماعت ختم ہونے کے بعد مسجد میں داخل ہوتا ہے، اور کسی مسبوق کی دائیں جانب کھڑا ہو جاتا ہے، اس مسبوق کی اقتداء کی نیت سے، تو کیا ایسے مسبوق کی امامت جائز ہے؟

اگر مسبوق امامت کی نیت نہ کرے، صرف جہراً قرأت کرے، تو اس میں کوئی مضائقہ تو نہیں؟

کیا ایسے مسبوق کی اقتداء مذہب حنبلی میں جائز ہے؟

(۲) ہم لوگ دورانِ سفر مذہب حنفی کے مطابق جمع صوری (فعلی) کرتے تھے، بایں طور کہ ظہر کی نماز کو آخر تک مؤخر کرتے تھے اور پھر عصر کی اذان کے فوراً بعد عصر پڑھتے تھے؛ لیکن کچھ دنوں پہلے ہمارے ذہن میں آیا کہ سعودی عرب میں عصر کی اذان مثل اوّل کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے، جب کہ احناف کے یہاں عصر کا وقت مثل ثانی کے بعد سے ہے، تو ہماری اس طور پر کی ہوئی جمع فعلی کا کیا حکم ہے؟ اور اس جمع فعلی میں پڑھی ہوئی عصر کی نمازوں کا کیا حکم ہے؟

(۳) عرصہ دراز سے ہم رمضان المبارک میں ائمۂ حرم کے ساتھ جماعت سے وتر پڑھتے آئے ہیں، جن میں سے اکثر فصل بالتسلیم بعد الرکعتین کے ساتھ پڑھتے، اور کچھ ائمۂ حرم نے کبھی کبھار تینوں رکعتیں ایک ساتھ پڑھائی ہیں، اور دوسری رکعت میں عمداً قعدہ میں نہیں بیٹھے، تو ہمارے ان کی اقتداء میں پڑھے ہوئے وتروں کا کیا حکم ہے؟

(۴) حرمین میں ایام حج میں نماز ختم ہونے کے بعد کافی دیر تک لوگ اپنی جگہوں پر سنتیں پڑھتے ہیں، نیز کچھ مواقع ایسے ہیں جہاں پر ہر وقت رش رہتا ہے، اور لوگ نماز پڑھتے رہتے ہیں جیسے کہ ریاض الجنۃ، ایسے مواقع میں نمازی کے کتنے آگے سے گذرنا جائز ہے؟ واضح رہے کہ ایسی جگہوں پر نمازیوں کے آگے سے گذرے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

(۵) احقر نے ایک بار جوش میں ایک چیز کے نہ کرنے پر دس مرتبہ ایک ساتھ قسم کھائی تھی؛ لیکن احقر اس پر ثابت نہ رہ سکا، تو احقر پر کتنے کفارے لازم ہوں گے؟

مستفتی: محمد حامد حیات مدنی

مقیم: مدینہ منورہ و مکہ مکرمہ، ۱۹/۵/د ۱۴۳۶ھ

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

(۱) مسبوق چوں کہ یک گونہ مقتدی ہوتا ہے؛ اس لیے حنفیہ کے نزدیک اس کی اقتداء کرنا درست نہیں ہے، خواہ وہ امامت کی نیت کرے یا نہ کرے۔ **ففي المراقي : وأن لا يكون الإمام مقيمًا لمسافر بعد الوقت في رباعية ............ ولا مسبوقًا لشبهة اقتدائه** (۱)

لہٰذا حنفی شخص کو نہ تو مسبوق کی اقتداء کرنا جائز ہے اور نہ ہی اس کی اقتداء میں ادا کردہ نماز حنفیہ کے نزدیک درست ہوگی ـــــــ باقی اس سلسلے میں حنبلی مذہب کی تفصیل ان کے علماء و مفتیان سے معلوم کرلی جائے۔

(۲) وقت ظہر کے بارے میں امام اعظم ابوحنیفہؒ سے جو ظاہر الروایہ منقول ہے، وہ یہی ہے کہ ظہر کا وقت زوال سے شروع ہو کر دو مثل سایہ ہونے تک باقی رہتا ہے، اس روایت کو بدائع، محیط، ینابیع میں صحیح قرار دیا گیا ہے، اصحابِ متون نے اسے اختیار کیا ہے، محققین نے اسے راجح قرار دیا ہے اور اکثر مشائخ احناف نے اس قول پر فتویٰ دیا ہے؛ البتہ امام صاحب سے ایک دوسری روایت ظہر کا وقت ایک مثل پر ختم ہونے کی بھی ہے، اس روایت کو امام طحاویؒ نے اختیار کیا ہے اور حضرات صاحبینؒ اور امام زفرؒ کا یہی مسلک ہے اور بہت سے مشائخ حنفیہ نے اس روایت پر بھی فتویٰ دیا ہے اس لیے صورتِ مسئولہ میں سفر یا کسی اور عذر کی بناء پر مذکورہ طریقے پر کی ہوئی جمع صوری کی بھی حنفیہ کے نزدیک گنجائش ہے، گو کہ یہ خلافِ احتیاط ہے، نیز مثل ثانی میں پڑھی ہوئی عصر کی نمازیں ادا

(۱) **حاشية الطّحطاوي على مراقي الفلاح ، ص:۲۹۱، ط : أشرفي ، ديوبند .**

کہلائیں گی، پڑھی ہوئی نمازوں کا اعادہ ضروری نہیں؛ البتہ بلا عذر ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔(۱)

(۳) حنفیہ کے نزدیک وتر کی تین رکعت ایک سلام کے ساتھ پڑھنا واجب ہے اور چوں کہ اکثر فقہائے احناف کے نزدیک نماز میں مقتدی کے اعتقاد اور رائے کا اعتبار ہے اور حنفی مقتدی کے لیے دو سلاموں سے وتر پڑھنا جائز نہیں ہے؛ اس لیے عام حالات میں بلا ضرورت حنفی مقتدی کے لیے دو سلاموں سے وتر پڑھانے والے کے پیچھے وتر پڑھنا جائز نہیں ہے؛ لیکن حرمین شریفین میں حنفی زائرین و مقیمین کا بڑا مجمع ہوتا ہے اور ان سب کے لیے جماعت کو چھوڑ کر الگ سے وتر پڑھنے میں بہر حال حرج ہے؛ اس لیے بعض فقہائے احناف مثلاً امام ابو بکر جصّاص رازیؒ، فقیہ ابو جعفر الہندوانیؒ، ابن وہبانؒ اور صاحبِ نہایہ وغیرہ کے اقوال پر عمل کرتے ہوئے حنفی زائرین و مقیمین کے لیے حرمین شریفین میں شافعی یا حنبلی ائمہ کی اقتداء میں وتر ادا کرنے کی گنجائش ہوگی۔(۲) ؎

---

(۱) وقت الظّهر مِن زوالِه ............ إلى بلوغ الظّلّ مثليه ، وعنه مثله ، وهو قولهما وزفر والأئمّة الثّلاثة ، قال الإمام الطّحاوي: وبه نأخذ، وفي غرر الأذكار: وهو الماخوذ به ، وفي البرهان وهو الأظهر لبيان جبريل ، وهو نصّ في الباب ، وفي الفيض : وعليه عمل النّاس اليوم ، وبه يفتى (درّمختار) وفي ردّ المحتار: فيه أنّ الأدلّة تكافأت ولم يظهر ضعف دليل الإمام ؛ بل أدلّته قويّة أيضًا كما يعلم من مراجعة المطوّلات و شرح المنية .

(الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۱۴/۲)

وللمزيد من التّفصيل راجع : إمداد الفتاویٰ:۱/۱۵۰-۱۵۱، ط: زكريا.

(۲) ...... وقول أبي بكر الرّازي إن اقتداء الحنفي بمن يسلم على رأس الرّكعتين في الوتر يجوز ويصلّي معه بقيته ؛ لأنّ إمامه لم يخرجه بسلامه عنده ؛ لأنّه مجتهد فيه ......... وكان شيخنا سراج الدّين يعتقد قول الرّازي إلخ .

(فتح القدير:۱/۴۳۷، باب صلاة الوتر، ط: بيروت)

؎ احناف کے یہاں راجح یہی ہے کہ مقتدی کے اعتقاد کا اعتبار ہے نہ کہ امام کے، اس لحاظ سے دو سلاموں کے ساتھ "وتر" پڑھانے والے امام کے پیچھے حنفی مقتدی کی وتر درست نہ ہوگی، راجح قول کے برخلاف حرمین شریفین میں انتہائی ضرورت کی بناء پر قولِ مرجوح پر عمل کرنے کی گنجائش ہے؛ ==

بہ شرطیکہ دو رکعت پر سلام پھیرنے کے بعد امام صاحب منافی صلاۃ کوئی عمل نہ کریں۔ وقال ابن الشّحنة: فالحاصل أنّ قاضيخان قال في فتاواه: لايجوز الاقتداء بمن يقطع الوتر وكذا في الفوائد الظّهيرية ؛ لأنّ المقتدي يرى أن إمامه خرج عن الصّلاة بسلامه ،

== لیکن اس کے ساتھ ایسی کوشش بھی ضروری ہے کہ ائمۂ حرمین شریفین ''وتر'' میں سلام سے فصل نہ کیا کریں اور تینوں رکعتیں ایک ہی سلام کے ساتھ ادا کریں، اس سے خود ائمۂ حرمین شریفین اور شریک جماعت تمام مقتدیوں کی نماز درست ہو جائے گی، خواہ اُن کا تعلق کسی بھی مسلک سے ہو؛ کیوں کہ ''وتر'' دو سلاموں کے ساتھ امام احمد بن حنبلؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک محض ایک امر مندوب اور افضل درجے کی چیز ہے، فرض یا واجب نہیں ہے؛ بل کہ امام شافعیؒ کے ایک قول کے مطابق شافعی امام کے لیے ایک سلام سے ہی ''وتر'' ادا کرنا بہتر ہے، ہاں تنہا پڑھنے والے کے لیے دو سلاموں کے ساتھ افضل ہے ــــ امام مالکؒ کے نزدیک اگر چہ ''وتر'' دو سلاموں کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے؛ لیکن ان کے یہاں یہ تصریح ہے کہ اگر کسی مالکی شخص نے ایک سلام کے ساتھ وتر ادا کرنے والے امام کے پیچھے نماز پڑھ لی، تو اس کی نماز درست ہو جائے گی۔

چناں چہ ''موسوعہ فقہیہ'' میں ہے: وإن أوتر بثلاث فله ثلاث صُوَر : الصّورة الأولى : أن يفصل الشّفع بالسّلام ، ثمّ يصلّي الرّكعة الثّالثة بتكبيرة إحرام مستقلّة ، وهذه الصّورة عند غير الحنفيّة ، وهي المعيّنة عند المالكية ، فيكره ما عداها إلّا عند الاقتداء بمن يصل .

وأجازها الشّافعيّة والحنابلة ، وقالوا: إنّ الفصل أفضل من الوصل لزيادته – عليه السّلام – وغيره ، وفي قول عند الشّافعيّة : إن كان إمامًا فالوصل أفضل ...... وإن كان منفردًا فالفصل أفضل إلخ . (۲۷/۲۹۵، بيان صفة الوتر)

اور مغنی لابن قدامہ میں ہے: ........... الّذي يختاره أبو عبد اللّٰه أن يفصل ركعة الوتر بما قبلها ، و قال : إن أوتر بثلاث ولم يسلّم فيهنّ لم يضيّق عليه عندي ، وقال يعجبني أن يسلّم في الرّكعتين إلخ . (۲/۱۱۵، ط: مكتبة القاهرة)

الغرض اگر ائمۂ حرمین شریفین دو سلاموں کے بجائے ایک سلام کے ساتھ وتر کی تینوں رکعتیں پڑھیں تو شریک جماعت تمام مقتدیوں کی وتر ادا ہو جائے گی؛ ــــ لہٰذا پوری دنیا کے مسلمانوں خصوصًا ــــ فقہ حنفی کی اتباع کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ ائمۂ حرمین شریفین سے اس کی درخواست کریں، یا حرمین شریفین کی انتظامی کمیٹی یا متعلقہ وزارت سے درخواست کریں۔

ومبنى الخلاف على أنّ المعتبر رأي المقتدي أو رأي الإمام ، وعلى الثّاني يتخرّج كلام الرّازي ، و هو يقول الهندواني و جماعة ، و في النّهاية إنّه أقيس. (۱)

(۴) حرمین شریفین اور ہر ایسی جگہ (خواہ مسجد ہو یا صحرا و میدان) جس کی لمبائی ۶۰ فٹ یا اُس سے زیادہ ہو، وہاں مصلی کے سامنے سے تقریباً دو صف کے برابر جگہ چھوڑ کر بغیر سترہ کے گزر سکتے ہیں؛ لیکن حرمین شریفین میں چوں کہ ہر وقت ازدحام اور بھیڑ رہتی ہے اور نمازی کے سامنے سے گزرے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہوتا؛ اس لیے ضرورت کے وقت مصلی کے سامنے سے مطلقاً گزرنے پر امید ہے کہ گناہ نہیں ہوگا، پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ موضع سجود کو چھوڑ کر گزرے۔ قال الشّامي : الرّابعة أن لايتعرّض المصلّي للمرور ولا يكون للمار مندوحة فلا يأثم واحد منهما (۲)

(۵) فقہائے کرام نے صراحت کی ہے کہ اگر حالف نے متعدد قسمیں کھائیں تو حانث ہونے کی صورت میں تعداد قسم کے بہ قدر کفّارے لازم ہوں گے؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں آپ پر دس۱۰ کفّارے لازم ہوں گے۔ ففي الدّرّ المختار: وتتعدّد الكفّارة لتعدّد اليمين، والمجلس والمجالس سواء. (۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۹/۵/۱۴۳۶ھ مطابق ۱/۳/۲۰۱۵ء

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## مرور بین یدی المصلّی (نمازی کے سامنے سے گذرنے) کی مختلف صورتیں اور اُن کے احکام

**سوال:** ﴿۴۰﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین درج ذیل مسئلے کے بارے میں :

(۱) شرح منظومة ابن وهبان: ۱/۶۲-۶۳، شعر :۶۳، ط: ديوبند .

(۲) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۲/۳۹۹، باب ما يفسد الصّلاة وما يكره فيها .

(۳) المصدر السّابق: ۵/۴۸۶، كتاب الأيمان .

(۱): مرور بین یدی المصلّی سے متعلق چند اہم احادیث اور اُن کی تشریح۔
(۲): کیا مرور بین یدی المصلّی کے حکم میں مسجد کبیر اور مسجد صغیر کا کوئی فرق ہے؟
(۳): مسجد کبیر اور مسجد صغیر کی تعریف میں راجح قول۔ (۴): نمازی کے آگے کس قدر فاصلے سے گذرنا مکروہ ہے؟ (فقہائے احناف کا اختلاف اور مفتیٰ بہ قول کی تعیین) (۵): اونچی جگہ نماز پڑھنے والے کے سامنے سے گذرنے کے سلسلے میں شریعت کے حکم کی تفصیل۔ (۶): نمازی کے سامنے سے گذرنے کی صورت میں نمازی اور گذرنے والے کے ارتکاب گناہ کی مختلف صورتیں۔ (۷): نمازی کے آگے سے ہٹنے کا شرعی حکم۔ (۸): نمازی کے سامنے سے گذرنے کے جواز کی مختلف صورتیں۔ (۹): سُترے کی مشروعیت کا مقصد۔ (۱۰): امام کے پہلے سلام کے بعد نمازی کے سامنے سے گذرنا۔ (۱۱): اگلی صف کے نمازیوں کی سہولت کے لیے صف کے دونوں جانب کچھ حصہ خالی چھوڑنا۔ (۱۲): مسجد حرام میں مرور بین یدی المصلّی کا شرعی حکم۔ (۱۳): نمازی کے لیے سامنے سے گذرنے والے کو روکنے کا شرعی حکم۔ (۱۴): فسادِ وضو کی صورت میں نمازی کے سامنے سے گذرنا۔
(۱۵): صف کے خلاء کو پُر کرنے کے لیے نمازی کے سامنے سے گذرنا۔

عرض یہ ہے کہ ''مـرور بیـن یـدی الـمصلّی '' سے متعلق چند اہم سوالات آپ حضرات کی خدمت میں اِرسال ہیں، ان سوالات میں بعض تو وہ صورتیں ہیں، جو عموماً پیش آتی رہتی ہیں اور بعض وہ ہیں، جن کا وقوع اگر چہ کم ہی ہوتا ہے؛ لیکن بہر حال وہ بھی اپنی جگہ اہم ہیں، جب کہ کچھ سوالات کا تعلق اصل مسئلہ کی واقفیت سے ہے۔ واضح رہے کہ دیگر مسئلوں کی طرح اِس مسئلے میں بھی لوگوں کے مابین کچھ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں؛ اِس لیے انتہائی مؤدبانہ گزارش ہے کہ ہر ہر جزء کا صاف، واضح اور مدلل جواب مرحمت فرمائیں، ہم آپ کے بے حد ممنون و مشکور ہوں گے۔

(۱) ''مـرور بیـن یـدی الـمصلّی '' سے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں، ان کو مع حوالہ مختصر تشریح کے ساتھ تحریر فرمادیں۔

(۲) ''مرور بین یدی المصلی'' کے حکم میں کیا مسجدِ کبیر اور مسجد صغیر کا کوئی فرق ہے؟ اگر ہے، تو پھر مسجدِ کبیر اور مسجدِ صغیر کی واضح تعریف فرمادیں، تاکہ مسجدوں میں اِنطباق کرنا آسان ہوجائے، نیز اِس کی بھی وضاحت فرمادیں کہ دونوں کی حد بندی میں لمبائی اور چوڑائی دونوں کا اعتبار ہے، یا صرف لمبائی کا اعتبار ہے، نیز مسجد کے کس سمت کو طول قرار دیا جائے گا اور کس سمت کو عرض؟

(۳) نمازی کے آگے کس قدر فاصلے سے گزرنا مکروہ ہے؟ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نمازی کے قدم سے سجدہ کرنے کی جگہ تک کے مابین گزرنا مکروہ ہے، سجدے کی جگہ کے آگے سے بغیر سترے کے گزرنا ممنوع نہیں ہے اور وہ لوگ اپنے قول کی تائید میں کہتے ہیں کہ فقہِ حنفی کے اکثر متون میں اِسی قول کو لیا گیا ہے اور شمس الائمہ سرخسیؒ، قاضی خانؒ، علامہ زیلعیؒ، علامہ ابن نجیمؒ اور صاحب ہدایہ نے اِسی قول کو راجح قرار دیا ہے۔ اُن کی یہ بات کہاں تک درست ہے اور اس میں فتویٰ کس قول پر ہے؟

(۴) اگر کوئی آدمی اونچی جگہ نماز پڑھ رہا ہے اور راستہ نیچے ہے، تو کیا راہ گزر کے لیے نمازی کے سامنے سے گزرنا درست ہے، یا اِس میں کچھ تفصیل ہے؟

بعض لوگ کہتے ہیں اُس وقت گذرنا مکروہ ہے، جب کہ گذرنے والے کے سارے اعضاء نمازی کے سارے اعضاء کے مقابل ہوں، اِسی طرح بسا اوقات مسجد کا برآمدہ صحن سے تقریباً دو فٹ اونچا ہوتا ہے، یعنی: گذرنے والا اونچائی پر ہوتا ہے اور نمازی نیچے، تو کیا ایسی صورت میں برآمدے سے نمازی کے سامنے سے گذرا جاسکتا ہے؟

(۵) ''مرور بین یدی المصلی'' میں نمازی اور گزرنے والوں میں سے دونوں گناہ گار ہوں گے، یا صرف گزرنے والا گناہ گار ہوگا، یا دونوں کے گناہ کے ارتکاب کی صورتیں الگ الگ ہیں؟

(۶) بعض لوگ مسجد میں ایسی جگہ سنن ونوافل کی نیت باندھ لیتے ہیں، جہاں دیگر مصلیوں کے لیے دقت اور پریشانی ہوتی ہے، اِیسی صورت میں اگر کوئی شخص اُس نمازی کے سامنے سے گزرجائے تو اب گناہ نمازی پر ہوگا یا گزرنے والے پر؟

(۷) اگر کوئی شخص پیچھے بالکل محاذات میں نماز پڑھ رہا ہو، تو ایسی صورت میں وہاں سے الگ ہونا ''مرور بین یدی المصلّی'' میں داخل ہے یا نہیں؟

(۸) اِس وقت بعض لوگ نمازی کے آگے سے گزرنے کے جواز کی مختلف صورتیں اور طریقے اختیار کرتے ہیں، جن میں بہ ظاہر سترے کی مشروعیت کا مقصد پورا ہوتا ہوا نظر نہیں آتا ہے؛ اِس لیے پہلے سترے کے سلسلے میں اصل حکمِ شرعی اور شریعت کے اصل منشاء کو واضح کرنے کے بعد، مندرجہ ذیل مروجہ صورتوں کا شرعی حکم بیان فرمادیں:

(الف) بعض آدمی یہ کرتے ہیں کہ عارضی طور پر سترہ کے بقدر کوئی چیز مثلاً: تپائی وغیرہ نمازی کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور پھر سامنے سے گزر جاتے ہیں، پھر وہ چیز بھی اُس کے سامنے سے ہٹا لیتے ہیں۔

(ب) بعض لوگ کسی دوسرے آدمی کو نمازی کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں اور گزر جاتے ہیں اور پھر وہ سامنے کھڑا ہونے والا شخص بھی ہٹ جاتا ہے۔

(ج) بعض حضرات "عصا" لے کر چلتے ہیں، وہ اپنا عصا نمازی کے سامنے رکھ کر آگے سے گذر جاتے ہیں اور پھر اپنا عصا بھی ساتھ میں لے جاتے ہیں۔

(د) بعض لوگ اپنا رومال نمازی کے سامنے کر دیتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔

(ہ) بعض علاقوں میں سترہ کا یہ طریقہ رائج ہے کہ چند نمازیوں سے آگے ایک خاص طریقہ سے بنی ہوئی تپائی، یا کوئی دوسری چیز رکھ دی جاتی ہے، جس کے بیچ کا حصہ زمین سے مس نہیں ہوتا ہے، صرف دونوں طرف کے کنارے زمین سے لگے ہوئے ہوتے ہیں؛ کیا اِس طرح کی چیزیں سترہ بن سکتی ہیں، کیا سترے کے لیے زمین سے مس رہنا ضروری ہے۔

مذکورہ صورتوں میں سے کس صورت میں گزرنا درست ہے اور کس میں درست نہیں ہے؟

(۹) سلامِ اوّل کے بعد نمازی کے سامنے سے گذرنے کا کیا حکم ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ دونوں طرف سلام پھیرنا واجب ہے؛ اِس لیے پہلے سلام کے بعد دوسرے سلام سے پہلے نمازی کے سامنے سے گذرنا مکروہ ہے۔

(۱۰) بعض علاقوں میں اگلی صف کے نمازیوں کی سہولت کے لیے صف کے دونوں طرف کچھ حصہ خالی چھوڑ دیا جاتا ہے، تاکہ جلدی جانے والوں کے لیے نکلنا آسان ہو، کیا اِس طرح کرنا شرعاً درست ہے؟

(۱۱) مسجدِ حرام میں ''مرور بین یدی المصلی'' کا کیا حکم ہے؟

(۱۲) کن صورتوں میں نمازی کے لیے اجازت ہے کہ وہ اپنے سامنے سے گزرنے والے کو روک دے اور روکنے کے لیے وہ کیا کیا طریقے اختیار کرسکتا ہے؟

(۱۳) فسادِ وضوء کے عذر سے نمازیوں کے سامنے سے گذرنا کیسا ہے اور اِس صورت میں صفوں کو چیرتے ہوئے، درمیان سے نکلنا بہتر ہے، یا نمازیوں کے سامنے سے گذرنا، نیز وضوء کرنے کے بعد پچھلی صف میں کھڑا ہونا چاہیے، یا اپنی جگہ واپس آ کر نماز میں شریک ہونا بہتر ہے؟

(۱۴) صف کے خلا کو پر کرنے کے لیے نمازیوں کے سامنے سے گذرنا کیسا ہے؟

آپ حضرات سے امید قوی ہے کہ مذکورہ سؤالات کا جلد از جلد مدلل و مفصل جواب مرحمت فرما کر، ہم سب کو ممنون فرمائیں گے۔

مستفتی: مفتی محمد فرقان مہاراشٹری

۱۸/۷/ د ۱۴۳۵ھ

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق**

﴿۱﴾ ''**مرور بین یدی المصلّي**'' سے متعلق مختلف سندوں کے ساتھ کئی قسم کی احادیث کتبِ احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔

پہلی قسم اُن احادیث کی ہے، جن میں نمازی کے سامنے (سترے کے بغیر) گذرنے پر وعید بیان کی گئی ہے، اُن میں سب سے معروف و مشہور یہ حدیث ہے:

**عن بسر بن سعيدٍ قالَ: أرسَلنِي أبو جُهيمٍ إلى زيدِ بن خالدٍ، أسأُله عن المارِّ بينَ يدي المُصَلِّي، فقالَ: سَمِعتُ رسولَ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم يقولُ: لو يَعلَمُ المارُّ بينَ يدي المُصلِّي، ماذَا علَيه، كان لأن يقُومَ أربعين خريفًا خيرٌ له من أن يَمُرَّ بينَ يديه.** (۱)

(۱) البحر الزّخّار بمسند البزّار مسند زيد بن خالد الجهني الرّقم: ۳۷۸۲۔

یہ حدیث ''بخاري'' اور حدیث کی دیگر معتمد و مستند کتابوں میں بھی موجود ہے؛ لیکن اِن سب میں متن اور سند دونوں اعتبار سے کافی اختلاف ہے، اِسی لیے علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے ''اِعلاء السّنن'' میں ''مسندِ بزّار'' ہی کی روایت نقل کی ہے، جو متن اور سند دونوں اعتبار سے، اِس باب کی دیگر حدیثوں کے مقابلے میں صحیح سمجھی گئی ہے۔(۱)

بہر حال مذکورہ حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نمازی کے سامنے سے گذرنے والے کو اگر (اپنے گزرنے کے) گناہ کا علم ہو جائے، تو وہ چالیس سال تک ٹھہرنے کو گذرنے پر ترجیح دے۔

اِس حدیث میں ''بین یدی المصلّی'' سے مراد نمازی کے سامنے قریب سے گذرنا ہے، جس کی تفصیل سوال نمبر۳ کے جواب میں اِنشاء اللہ ذکر کی جائے گی۔

دوسری قسم اُن احادیث کی ہے، جو ''مسجدِ حرام'' میں نمازی کے سامنے گذرنے کے سلسلے میں، مختلف صحابۂ کرام مثلاً: حسن بن علیؓ وغیرہ سے روایت کی گئی ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ مسجدِ حرام میں طواف کرنے والوں کے لیے نمازی کے سامنے سے گذرنے کی گنجائش ہے۔

**عن الحسن بن علي – رضي الله عنه – أنَّ رسولَ الله صلّى الله عليه وسلّم: صَلّى والرِّجالُ والنّساءُ يطوفُون بين يديه بغير سُترةٍ مما يَلِي الحجرَ الأسودَ.(۲)**

اِس باب کی حدیث راجح قول کے مطابق طواف کرنے والوں کے ساتھ خاص ہیں، چنانچہ طواف کے بغیر مسجدِ حرام میں بھی نمازی کے سامنے گذرنے کی وہی تفصیل ہے، جو دیگر بڑی مسجدوں کے بارے میں ہے، آج کل لوگ اِس سلسلے میں بہت زیادہ بے احتیاطی برتتے ہیں۔

**قال الشّاميؒ: ذكر في "حاشية المدني" لا يمنعُ المارُ داخلَ الكعبة، وخلف المقام وحاشية الطّواف، لما روى أحمد وأبوداؤد عن المطّلب بن أبي وداعة أنّه**

---

**(۱) قال العثماني التّهانويؒ: إنّمااختَرتُ في المَتَن سِيَاقَ "البَزّار" لِما فيه مِن ذكرِ عَدَدِ الأربعين مع مُمَيِّزِه، وإسنادُه حُجَّةٌ صَحِيحٌ أيضاً كما قالَه "الهيثميؒ" (إعلاء السّنن: ۷۸/۵)**

**(۲) المعجمُ الكبير للطّبراني: بابُ الحاء، الرقم: ۲۷۳۴.**

رأى النّبيَّ صلّى الله عليه وسلّم يُصَلّي ممّا يَلِي بابَ بني سهمٍ، والنّاسُ يمرُّون بين يديه، و ليس بينهما سترة، و هو محمولٌ على الطّائفين فيما يظهرُ ؛ لأنَّ الطّوافَ صلاةٌ، فصار كمن بين يديه صُفوفٌ من المصلّين. (۱)

تیسری قسم اُن احادیث کی ہے، جن کے معنی ومفہوم میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے، اِس سلسلے میں سب سے معروف ومشہور حدیث حضرت عبداللہ بن صامتؓ کی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں

عن عبد الله بن الصّامتؓ قال سمعتُ أبا ذرٍّ يقولُ، قال رسولُ الله صلّى الله عليه وسلّم: إذا صلّى الرّجلُ وليس بين يديه كآخِرَةِ الرَّحْلِ أو كوَاسِطَةِ الرَّحْلِ، قَطَعَ صَلاتَه الكلبُ الأسودُ والمرأةُ والحمارُ، فقلتُ لأبي ذرٍّؓ: مابالُ الأسودِ من الأحمر ومن الأبيض؟ فقال: يابنَ أخي سألتَنِي كما سألتُ رسولَ الله صلّى الله عليه وسلّم فقال: الكلبُ الأسودُ: "شيطان"(۲)

مذکورہ حدیث اور اِس کے مثل دیگر احادیث کے ظاہری الفاظ کا خلاصہ یہ ہے کہ جب آدمی بغیر سترے کے نماز پڑھ رہا ہو اور اِس دوران اُس کے سامنے سے کالا کتا یا گدھا یا عورت گذر جائے، تو اس کی نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

---

(۱) ردُّ المحتار مع الدّرّ المختار: ۲/ ۴۰۰.

وقال العثماني التّهانويؒ: ومثلُه في "البحر العميق" وحكاه عزُّ الدّين بن جماعة عن "مشكلات الآثار" للطّحاوي، ونَقَلَه المُلّاؒ في منسكه الكبير، و نقله سنان آفندي أيضًا في منسكه.

وقال: ويؤيِّدُ تخصيصَه بالطّائفين ما في هذا الحديث عند الطّحاوي بسَندٍ حسنٍ: "ليس بينه و بين الطُّوَّاف سُترةٌ".

(إعلاء السنن: ۵/ ۸۴، كتاب الصلاة، حكمُ المرور بين يدي المصلي في المسجد الحرام و غيره، ط: أشرفية، ديوبند)

(۲) التّرمذي: كتاب الصّلاة، بابُ ما جاء أنّه لا يقطعُ الصّلاة إلاّ الكلبُ والحمارُ والمرأة، الرّقم: ۳۳۸.

اِس حدیث کے ظاہری الفاظ کی طرف نظر کرتے ہوئے بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں مذکور تینوں چیزوں کے نمازی کے سامنے سے گذرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور نماز کو لوٹانا ضروری ہے؛ لیکن جمہور کے نزدیک نماز فاسد نہیں ہوتی ہے، وہ حضرات فرماتے ہیں کہ حدیث میں ''قطعِ صلاۃ'' سے مراد نماز کے خشوع وخضوع کا ختم ہونا ہے، نہ کہ اصل نماز کا فاسد ہونا اور اِس جیسی احادیث کا اصل منشاء لوگوں کو سترے کے ساتھ نماز پڑھنے کی ترغیب دینا ہے۔ بعض محدثین نے اِس حدیث کو منسوخ بھی قرار دیا ہے، جب کہ کچھ محققین نے اِس حدیث کو ظاہر ہی پر محمول کرتے ہوئے دوسرا مطلب بیان کیا ہے، بہرحال جمہور ائمہ کے نزدیک حدیث میں مذکور تینوں چیزوں میں سے کسی سے بھی نماز فاسد نہیں ہوگی۔ (۱)

علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں کہ میں قطع احادیث میں تاویل نہیں کرتا، بلکہ انہیں ظاہر پر ہی محمول کرتا ہوں اور مطلب یہ بتلاتا ہوں کہ عورت کتّا اور گدھا یہ تینوں چیزیں نماز کو قطع کر دیتی ہیں کہ نماز کا رشتۂ اتصال منقطع ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال یہ سمجھو کہ تم کسی سے بات کر رہے ہو کوئی تیسرا شخص آ کر تمہارے درمیان بیٹھ جائے تو تمہیں محسوس ہوگا کہ تمہاری بات کٹ گئی اور سلسلۂ گفتگو منقطع ہو گیا، اسی طرح نماز میں عورت کتّے گدھے کا سامنے سے گذر جانا قاطع بن جاتا ہے، پس یہ بھی بلا کسی تاویل کے قطع کی

(۱) قال البنّوريّ : ذهب الأئمّة الثّلاثة إلى أنّه لا يقطعُ الصّلاة شيء منها ............ كما ذكره ابنُ قدامة والنّووي والبدرُ العيني وغيرهم ، وذكر النّووي أنّه مذهبُ جمهور السّلف والخلف ، وذكر العيني أنّه مذهبُ عامة العلماء ، ومذهبُ أحمدؒ كما ذكره التّرمذي(قال : قال أحمد : لا أشكُّ فيه أنَّ الكلبَ الأسودَ يقطعُ الصّلاةَ ، وفي نفسي من الحمار والمرأة شيءٌ ، قال إسحاق : لا يقطعها شيءٌ إلّا الكلبُ الأسود) وهٰذا هو المشهورُ عن أحمدؒ ، عنه أنّه يقطعها هذه الثّلاثة ............ ثم تأوَّلوا في أحاديث القطع بأنَّ المرادَ منه قطعُ الخشوع ، وهو أحدُ الأجوبة ، والثّاني : أنَّ أحاديث القطع منسوخة كما قاله الطّحاويّ .

(معارف السّنن: ۳/ ۳۵۹، كتابُ الصّلاة ، ط: أشرفية ، ديوبند)

ایک صورت ہے۔(۱)

محدث مولانا احمد علی سہارن پوری فرماتے ہیں:

کتے وغیرہ کے نماز قطع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا حضور اور کمال منقطع ہو کر اس میں کمی آجاتی ہے۔(۲)

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری تحفۃ القاری میں تحریر فرماتے ہیں:

اس حدیث میں قطع صلاۃ سے فساد صلاۃ مراد نہیں، بلکہ قطع وصلہ (تعلق) مراد ہے اور عورت سے مرغوبات گدھے سے مستقذرات (گھناؤنی چیزیں) اور کالے کتے سے مخوفات (ڈراونی چیزیں) مراد ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب نمازی کی نظر کسی مرغوب چیز پر پڑتی ہے تو اس کی توجہ بٹتی ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک مرتبہ بیل بوٹے والی چادر پہن کر نماز پڑھنے کے بعد وہ چادر لوٹادی تھی اور دوسری چادر منگوائی تھی آنحضور ﷺ نے وہ چادر اس لیے لوٹادی تھی کہ اُس نے آپ کی توجہ نماز

(۱) و قال العلّامة أنور شاه الكشميريؒ: '' لا أتأوّلُ في أحاديث القطع، وأحمِلُها على ظاهرِها، وأقولُ: إنَّ المرأةَ والكلبَ والحِمارَ كلَّها تقطَعُ الصَّلاةَ أي: تلك الوُصلةَ، وهذا كما إذا جَرىٰ بينَك وبين أحدٍ مُحادَثةٌ، فلو قَعَدَ رجلٌ في الوسط، تَرَاه أنه قَطَعَ كلامَك و مُحادَثَتَك، فهو أيضًا نوعٌ من القطع بدون تأويلٍ، ولابُعدَ فيه؛ فإنَّ الشّريعةَ قد تُخبِرُ عن الغائبات بما تراه ولا نراه، فأخبَرَت بإقامة الوُصلَة، وكذلك أخبَرَت بقطعِها عند المرور، فما لَنَا أن نُنكِرَه أو نُأوِّلَ فيه، نَعَمْ هذا قطعٌ على عُرفه وطريقه، وإن لم يُسَمِّه الفقهاءُ قطعاً على اصطلاحهم؛ فإنَّ أحكامَهم تتعلَّقُ بـ" عالَم الشّهادة"، وتلك الوُصلةُ من عالَم الغيب.

(فيض الباري: ۱۰۶/۲، كتابُ الصّلاة، أبوابُ سترة المصلّي، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

(۲) وقال المحدّث أحمد علي السّهارنفوريؒ: قوله:" قطع صلاته الكلب إلخ '' أي حضورها وكمالها، وقد يؤدّي إلى قطع الصّلاة، وفيه مبالغةٌ في الحثّ على نصب السّترة، ووجهُ تخصيصها مفوَّضٌ إلى رأي الشّارع.

(جامع التّرمذي: ۷۹/۱، كتابُ الصّلاة، بابُ ما جاءَ أنَّه لا يقطَعُ الصَّلاةَ إلّا الكلبُ والحمارُ والمرأةُ، ط: أجمل مريم فاؤنديشن، مومبائي)

سے ہٹائی تھی۔ معلوم ہوا کہ مرغوبات قطع وصلہ کا سبب بنتے ہیں، اور عورت مرغوبات کا اعلیٰ فرد ہے اس لیے اس کا ذکر کیا گیا ہے، پس یہ عورتوں کا اعزاز ہے توہین نہیں ہے۔

اسی طرح مستقذرات یعنی گھناؤنی چیزیں بھی قطع وصلہ کا سبب بنتی ہیں اور اس کا ایک فرد گدھا ہے اور ایک حدیث میں خنزیر کا ذکر ہے وہ بھی گھناؤنی چیز ہے (ابوداؤد: ۱/۱۰۲) نیز مخوفات یعنی ڈراؤنی چیزیں بھی توجہ ہٹاتی ہیں، کالا کتا اس کی مثال ہے اور ایک حدیث میں یہودی اور مجوسی کا ذکر ہے۔ (ابوداؤد: ۱/۱۰۲)

غرض ڈراؤنی چیزیں سانپ بچھو کالا کتا گھناؤنی چیزیں گدھا خنزیر اور مرغوبات جب نمازی کے سامنے آتی ہیں تو یقیناً توجہ ہٹتی ہے، حدیث شریف میں قطع صلاۃ سے یہی قطع وصلہ مراد ہے، اس توجیہ سے احادیث میں تعارض ختم ہو جاتا ہے۔ (۱)

﴿۲﴾ ''مرور بین یدی المصلّی'' کے حکم میں مسجدِ کبیر اور مسجد صغیر کا فرق ہے اور دونوں کی شرعی حد کے حوالے سے کتبِ فقہ میں یہ بات تو صراحتاً مذکور ہے کہ مسجدِ کبیر کی شرعی حد راجح اور مفتی بہ قول کے مطابق ۴۰ ذراع یعنی ۶۰ فٹ ہے اور جو مسجد اِس سے چھوٹی ہو، وہ صغیر کہلائے گی؛ البتہ ۴۰ ذراع میں طول کا اعتبار ہے یا عرض کا، یا طول وعرض دونوں میں ۴۰ ذراع ہونا ضروری ہے، نیز مسجد کے کس سمت کو طول قرار دیا جائے گا اور کس کو عرض یعنی: کیا محراب سے جانبِ صحن والے حصے کو طول اور شمال وجنوب والے حصے کو عرض قرار دیں گے یا اِس کے برعکس؛ اِن ساری تفصیلات کے حوالے سے کتبِ فقہ وفتاوی میں جو عبارتیں ملی ہیں انہیں سامنے رکھتے ہوئے یہاں چند صورتیں نکلتی ہیں۔

{۱} ۴۰ ذراع سے طول وعرض دونوں مراد لیا جائے، جیسا کہ حضرت فقیہ الامت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ اور حضرت مفتی نظام الدین اعظمیؒ کے فتاویٰ سے معلوم ہوتا ہے۔ (۲)

ایسی صورت میں مسجد کے طول وعرض کی جہت کو متعین کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، کسی

(۱) تحفة القاري: ۲/۳۵۳۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: فتاویٰ محمودیہ: (۱۴/ ۳۸۵، باب أحکام المساجد، مطبوعه: شیخ الإسلام دیو بند) اور منتخبات نظام الفتاوی (۱/ ۲۶۹، مطبوعه: إیفا پبلیکیشنز، دهلی)

جانب کو بھی طول یا عرض قرار دیں، بہر حال مسجدِ کبیر کے لیے دونوں سمتوں میں ۴۰ ذراع ہونا ضروری ہے۔

{۲} طول وعرض کے مجموعے میں ۴۰ ذراع مراد ہو یعنی: ۲۰ ذراع لمبائی اور ۲۰ ذراع چوڑائی، جیسا کہ بعض فتاوی کی کتابوں میں مستفتی کی طرف سے یہ صورت بھی ذکر کی گئی ہے۔(۱)

اِس صورت میں بھی سمت کی تعیین کی ضرورت نہیں ہے؛ لیکن یہ قول ہی کسی سے منقول نہیں ہے۔

{۳} ۴۰ ذراع صرف طول میں مراد لیا جائے؛ لیکن اِس صورت میں مسجد کے کس حصے کو طول قرار دیا جائے گا اور کس کو عرض؛ اِس سلسلے میں دونوں طرح کے اقوال ملتے ہیں۔

علامہ ابو اللیث سمرقندیؒ نے ''النّوازلُ الفقهيّة'' میں مسجدِ کبیر کی جو تعریف کی ہے، اُس میں جانبِ قبلہ سے صحن والے حصے کو مسجد کا عرض قرار دیا ہے اور شمال وجنوب کو طول۔

**فقال : المسجدُ الكبيرُ حدُّه أن يكونَ طولُه خمسًا وعشرين خطوةً ، وعرضُه من المِحراب إلى حدِّ الصّحن خمس عشرة خُطوةً.(۲)**

جب کہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے مسجدِ کبیر اور مسجدِ صغیر پر جو تفصیلی گفتگو کی ہے؛ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک جانبِ قبلہ سے صحن والا حصہ طول کہلائے گا۔

اگر سترے کی مشروعیت اور مرور بین یدی المصلی کی ممانعت میں فقہاء کی بیان کردہ علل ومصالح، نیز مسجدِ کبیر میں مصلی کے سامنے سے گذرنے والے کو ملنے والی رعایت کی طرف نظر کی جائے، تو مذکورہ چار اقوال میں سے چوتھا قول یعنی: حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا قول راجح معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ ایک سؤال کے جواب میں فرماتے ہیں۔

**سوال:** ''شامی'' وغیرہ کتابوں میں اربعین یا ستین ذراع ببارہ مرور امام المصلی مذکور ہے، اب سوال یہ ہے کہ یہ پیائش ببارہ مرور امام المصلی طول کی ہے یا عرض کی یا ہر ایک کی یا چاروں طرف کی مجموعی پیائش مراد ہے، مدلل جواب عطا فرمایئے۔

---

(۱) إمداد الأحكام: ۱/۴۴۴، کتاب الصّلاۃ، سوال: ۱۳، مطبوعہ: دار العلوم، کراچی۔

(۲) التّعريفاتُ الفقهيّةُ آخرُ قواعد الفقه، ص: ۴۸۵، دار الکتاب ، دیوبند .

**الجواب:** ”مراد طول میں اربعین یا ستین ذراع ہونا ہے؛ کیونکہ مدار اِس پر ہے کہ مسجد اتنی بڑی ہو کہ اگر مصلی کے سامنے دور سے گذرے، تو بُعد کافی ہو جائے، جس سے تشویش مصلی کو لاحق نہ ہو اور اِس امر میں مقدارِ طول کو دخل ہے، نہ کہ عرض کو، نیز ”شامی“ میں کہا ہے کہ: **فإنّه (المسجد الصّغير) كبقعةٍ واحدةٍ منها ، يجعل جميع ما بين يدي المصلّي إلى حائط القبلة مكانًا واحدًا، بخلافِ المسجدِ الكبيرِ والصّحراء؛ فإنّه لو جَعَلَ كذلك، لَزِمَ الحرجُ على المارة ، فاقتَصَرَ على موضع السُّجود. (۱/۲۶۳)**

ظاہر ہے کہ ”**حرج على المار**“ میں مقدارِ طول ہی کو دخل ہے، نہ کہ عرض کو، نیز ”**جعل جميع ما بين يدي المصلّي إلى حائط القبلة**“ بھی اِسی کو مفید ہے، پس یہ مقدارِ طول جانبِ قبلہ کی ہے اور عرض اُس کے مناسب ہوگا“ ۔(۱)

گویا اب حاصل یہ ہوگا کہ مسجدِ کبیر شرعًا اُس مسجد کو کہیں گے، جس کی لمبائی محراب سے صحن کی طرف کم از کم ۴۰ ذراع یعنی: ۶۰ فٹ یا ۲۰ گز یا ۲۰ ۷، اِنچ ہو اور چوڑائی شمالاً وجنوباً لمبائی ہی کے تناسب سے ہو، چوڑائی میں ۴۰ ذراع ہونا ضروری نہیں ہے۔

**قال الشّامي: اختلفوا فيه، فقدَّرَه بعضُهم بـ ”ستين ذراعاً“ وبعضُهم قال: إن كانت أربعين ذراعاً، فهي كبيرةٌ وإلا فصغيرةٌ ، هذا هو المختارُ. (۲)**

﴿۳﴾ چھوٹی مسجد یا چھوٹے مکان میں نمازی کے آگے سے مطلقاً گذرنا مکروہ ہے اور بڑی مسجد یا بڑے مکان یا بڑے میدان میں راجح اور مفتی بہ قول کے مطابق نمازی کے اتنے آگے سے گذرنا جائز ہے کہ خشوع وخضوع سے نماز پڑھنے کی صورت میں نمازی کی نظر وہاں تک نہ پہنچتی ہو۔ بعض فقہاء نے تجربہ کرنے کے بعد، تین ذراع یعنی: ڈیڑھ گز کے ذریعے اِس کی تحدید کی ہے کہ اگر خشوع وخضوع سے نماز پڑھی جائے ،تو ڈیڑھ گز سے آگے سے گذرنے والا نمازی کو نظر نہیں آئے گا، اِس کو مزید واضح انداز میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نمازی کے دو صف کے آگے سے گذرنا درست ہے؛ اِس لیے

---

**(۱) إمداد الأحكام: ۲/۵۸، كتاب الصّلاة ، سوال: ۱۳۔**

**(۲) ردّ المحتار مع الدّرّ المختار: ۲/۳۳۲، كتاب الصّلاة ، باب الإمامة .**

کہ دوصف کی مقدار تقریباً ڈیڑھ گز ہی بیٹھتی ہے اور بہت سے فقہا سے اِس کی صراحت بھی منقول ہے۔

لہٰذا بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ نمازی کے قدم سے سجدہ کرنے کی جگہ کے مابین گذرنا ممنوع ہے اور موضعِ سجود کے آگے سے گذرنا درست ہے؛ یہ بھی اگرچہ بعض فقہاءِ احناف کا قول ہے اور اِس کے علاوہ بھی دیگر اقوال منقول ہیں ؛ لیکن راجح اور مفتی بہ قول وہی ہے، جو ہم نے ذکر کیا ہے اور اُس میں احتیاط بھی ہے۔

**قال السّرخسيّ: وحدُّ المرور بين يديه غيرُ منصوصٍ في الكتاب، وقيل : إلى موضع السّجود وقيل : بقدر الصّفين ، وأصحُّ ما قيلَ فيه أنَّ المصلّي لو صلّى بخُشوع ، فإلى الموضع الّذي يُكرَه المرورُ بين يديه ، وفيما وراءَ ذلك لايُكرَه. (۱)**

(۱)......(الف) المبسوط للسّرخسي: ۱/۱۹۲، كتاب الصّلاة ، باب الحدث في الصلاة ، ط: دار المعرفة ، بيروت .

(ب):قال الحصكفي:"ومرورُمارٍ في الصّحراء أوفي مسجدٍ كبيرٍ بموضع سجوده في الأصحّ" قال الشّاميّ : هو ما اختارَه شمسُ الأئمّة ، و قاضي خانٌ وصاحبُ الهداية ، واستحسَنَه في "المحيط"، وصحَّحَه الزّيلعيّ، ومقابلُه ما صَحَّحَه التّمرتاشي وصاحبُ البدائع ، واختَارَه فخرُ الإسلام ، و رجَّحَه في "النّهاية"و"ا لفتح" أنَّه قدرُ ما يَقعُ بصرُه على المار لوصَلى بخشوعٍ أي : راميًا ببصره إلى موضع سجوده.

(ردّ المحتار مع الدّرّ المختار: ۲/۳۹۸، كتاب الصّلاة، باب ما يفسد الصّلاة وما يكره فيها)

وقال العلّامة فريد الدّين الدهلويّ : الرّابعُ في مقدار ما يجبُ أن يكون بين يدي المصلّي والمارّ ، حتّى لا يُكرَه المرور، و هذا فصلٌ لا ذِكرَ له في الأصل ، واختلف المشائخُ فيه ......... قال الشّيخ أبو جعفرٌ : إذا مَرَّ في موضعٍ يقعُ بصرُ المصلّي عليه ، و بصرُه إلى موضع سجوده ، فذلك مكروهٌ ، وما زَادَ على ذلك ، فليس بمكروه ، وفي "الظّهيرية": والمختارُ ما قاله أبو جعفرٌ ، و في "السّغناقي": الأصحُّ إن كان بحالٍ لو صلى صلاةَ خاشعٍ ، لا يقعُ بصرُه على المار، فلا يكرهُ ، وكذا اختيار فخر الإسلام .

(تاتارخانية : ۲/۲۸۴-۲۸۵، كتاب الصّلاة ، مسائلُ سترة ، ط: زكريا، ديوبند) ==

﴿۴﴾ نمازی اور گذرنے والے کے مابین محاذات کی چند صورتیں ہیں :

{۱} گذرنے والے کے سارے اعضاء، نمازی کے سارے اعضاء کے محاذات میں آجائیں۔

{۲} گذرنے والے کے جسم کا اکثر حصہ، نمازی کے جسم کے اکثر حصے کی محاذات میں آئے۔

{۳} گذرنے والے کا آدھا جسم، نمازی کے آدھے جسم کی محاذات میں آئے۔

{۴} گذرنے والے کا آدھا جسم سے کم، نمازی کے آدھے جسم سے کم کی محاذات میں آئے۔

اِن صورتوں میں سے صرف آخری صورت میں نمازی کے سامنے سے بغیر سترے کے گذرنے

---

== وقال العثماني التّهانويّ نقلاً عن العيني في ''العمدة'' في مقدار موضعٍ يُكرَه المرورُ فيه: ........... و قَدَّرَ الشافعيّ وأحمدٌ بـ '' ثلاثة أذرع '' ولم يَحِد مالكٌ في ذلك حدًّا إلّا أنَّ ذلك بقدرِ ما يركَعُ فيه و يسجُد ، و يتمكّنُ من دفع مَن مَرَّ بين يديه ........... قال : يَشهَدُ لتقييده بـ '' ثلاثةِ أذرع '' حديثُ نافعٍ المذكور قريبًا في الباب السّابق ( و هو : عن نافعٍ أن عبد اللّٰہ كان إذا دخل الكعبةَ ، مشى قِبَلَ وجهه حين يدخُلُ ، و جَعَلَ البابَ قِبَلَ ظهرِه، فمَشى حتى يكون بينه وبين الجدار الّذي قِبَلَ وجهه قريبًا من ثلاثة أذرع . (البخاري: كتاب الصّلاة ،أبوابُ سترة المصلّي، باب الصّلاة بين السّواري في غير جماعةٍ ، الرّقم:٥٠٦ )

واستحسَنَه شيخُنا كما حَكاه عنه بعضُ النَّاس في مسودة كتابه ، قال:"وهو الأرجحُ نظرًا إلى العلّة أيضًا ، وهوعدمُ تضرُّر المصلّي والمارّ؛ فإنَّ المصلّي ينقطعُ خشوعُه إذا كان أقلَّ منه ، والمارُّ يتضرَّرُ منه إذا كان أكثرَ منه" قالَ : وهو يقرُبُ ممّا اختارَه فخرُ الإسلامؒ، وصحَّحَه في "النّهاية''، وقوّاه المحقّق في "الفتح'' أنَّه إن كان بحالٍ لو صلّى صلاةَ الخاشعين نحو أن يكون بصرُه في قيامه في موضع سجوده، وفي موضع قدمَيه في ركوعه، وإلى أرنَبَة أنفِه في سجوده، و في حجره في قعوده، لا يقع بصرُه على المارّ؛ لا يُكرَه ........... قال: وقد جرَّبتُ ذلك، فظَهَرَ لي أنَّه إذا كان بصرُه في قيامه في موضعِ السُّجود، لا يجاوزُ ثلاثةَ أذرعٍ، فالتّقديرُ بذلك موافقٌ للأثر، والمُختار أجَلَّة الفقهاء من أصحابنا.

(إعلاء السّنن : ٥/٨٠-٨١ ، كتابُ الصّلاة ، حكمُ المرور بين يدي المصلّي في المسجد الحرام وغيره)

کی اِجازت ہے، باقی صورتوں میں گذرنا مکروہ ہے، گویا حاصل یہ ہوا کہ ''مرور بین یدی المصلی'' کے مسئلے میں نصف اعضاء سے کم کی محاذات کا فقہاء نے اعتبار نہیں کیا ہے؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر آدمی اونچی جگہ نماز پڑھ رہا ہے، یا مسجد کے صحن میں نماز پڑھ رہا ہے اور مسجد کا برآمدہ صحن سے اونچا ہے، تو دیکھ لیا جائے کہ نمازی کے سامنے گذرنے کی صورت میں کس درجہ محاذات ہو رہی ہے، اگر نمازی کے آدھے جسم سے کم محاذات ہو، تو گذرنے کی اِجازت ہے، ورنہ نہیں اور صورتِ مسئولہ میں مسجد کے برآمدے کی دو فٹ کی اونچائی اتنی ہے کہ اُس سے گذرنے کی صورت میں نمازی کے آدھے جسم کی محاذات لازم آتی ہے؛ اِس لیے ایسے برآمدے سے صحن میں نماز پڑھنے والے کے سامنے سے گذرنا مکروہ ہے، نیز مذکورہ تفصیل سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اِستفتاء میں مذکور بعض لوگوں کا قول: ''صرف اُس وقت گذرنا مکروہ ہے، جب کہ گذرنے والے کے سارے اعضاء نمازی کے سارے اعضاء کے مقابل ہوں'' غلط ہے، اِس کے علاوہ بھی دو صورتوں میں نمازی کے سامنے گذرنا مکروہ ہے، جیسا کہ اِس کی تفصیل ابھی گذری۔

**قال الحصكفيّ : " أو مرورُه أسفل من الدّكان أمامَ المصلّي لو كان يُصَلّي عليها أي : الدُّكان بشرطِ مُحاذاة بعضِ أعضاءِ المارّ بعض أعضائه ، وكذا سطحٌ وسريرٌ وكلّ مرتفعٍ دون قامة المارّ". (۱)**

(۱) وقال الشّاميّ نقلاً عن شرح المنية : ''لا يخفى أنّه ليس المرادُ محاذاة أعضاء المارّ جميع أعضاء المصلّي ؛ فإنّه لايتأتى إلاّ إذا اتّحدَ مكانُ المرور و مكانُ الصّلاة في العلو والتّسفُّل ؛ بل بعض الأعضاء بعضًا ، وهو يصدُقُ على محاذاة رأس المارّ قدمي المصلّي".

قال : لكن في ''القهستاني'': "ومحاذاة الأعضاء للأعضاء يستوي فيه جميع أعضاء المارّ هوالصّحيحُ كما في" التّتمّة'' و أعضاء المصلّي كلّها كما قالَه بعضُهم أو أكثرها كما قاله الآخرون كما في الكرماني''، وفيه إشعارٌ بأنّه لو حاذىٰ أقلّها أو نصفها لم يُكرَه ، وفي ''الزّاد": '' أنّه يُكرَه إذا حاذىٰ نصفُه الأسفلُ النّصفَ الأعلى من المصلّي كما إذا كانَ المارُ على فرس ".

==

﴿۵﴾ بعض صورتوں میں دونوں گناہ گار ہوں گے اور بعض میں صرف نمازی گناہ گار ہوگا، جب کہ کچھ صورتوں میں گناہ صرف گذرنے والے پر ہوگا، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

**قد أفادَ بعضُ الفقهاء أنَّ هنا صُوَرًا:**

**الأولٰى: أن يكونَ للمار مندوحةٌ عن المرور بين يدي المصلي، ولم يتعرَّض المصلي لذلك، فيختصُّ المارُّ بالإثم إن مَرَّ.**

**الثّانيةُ: مقابلتُها و هي أن يكونَ المصلي تعرَّضَ للمُرور، والمارُ ليس له مندوحةٌ عن المرور، فيختصُّ المصلّي بالإثم دون المار.**

**الثّالثةُ: أن يَتعَرَّضَ المصلّي للمرور، و يكونُ للمار مندوحةٌ، فيأثمَان، أمّا المصلّي فلتعرُّضِه، و أمّا المارُ فلمروره مع إمكانِ أن لا يفعَلَ.**

**الرّابعةُ: أن لا يتعرَّض المصلي، ولا يكون للمار مندوحةٌ، فلا يأثمُ واحدٌ منها كذا نَقَلَه الشيخ تقيُّ الدّين بن دقيق العيدؒ.**

مذکورہ عبارات سے نمازی کے سامنے سے گذرنے کی صورت میں گناہ کے اِرتکاب کی چار صورتیں معلوم ہوئیں:

{ا} آدمی ایسی جگہ نماز پڑھے، جہاں گذرنے والے کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو، یعنی اُس کے لیے نمازی کے سامنے کے بجائے، دوسری طرف سے گذرنا ممکن ہو، اِس کے باوجود وہ نمازی کے سامنے سے گذرے، تو اِس صورت میں گناہ صرف گذرنے والے پر ہوگا، نمازی گناہ گار نہیں ہوگا۔

---

== وقال الرّافعيؒ: والقصدُ ممَّا نقَلَه عن الكرمانيؒ أنَّه يحتملُ أن يُرَادَ بمُحَاذَاة الأعضاءِ للأعضاء، مُحاذاةُ جميعِ أعضاء المارّ أو أكثرها لجميعِ أعضاء المصلّي على قولٍ أو أكثرها على قولٍ، فقد حكى القولين الكرمانيؒ، وخَرَجَ احتمال النّصف والأقلّ، فيُفهَمُ أنَّه لا يُكرَه، وفي "الزّاد" أدخَلَ النّصفَ في الكراهة أيضًا كذا في "حاشية القهستاني".

**(الدُّرُّ المختار مع ردّ المُحتار مع تقريرات الرّافعي: ۲/۳۹۹، كتابُ الصّلاة، باب ما يفسد الصَّلاة وما يكره فيها)**

{۲} کوئی شخص ایسی جگہ نماز کی نیت باندھ لے، جو گذرنے والے کا راستہ ہو اور اُس کے لیے گذرنے کا کوئی متبادل راستہ نہ ہو مثلاً: اِقامتِ جماعت کے وقت کوئی شخص مسجد کے عین دروازے پر نیت باندھ لے، تو ایسی صورت میں صرف نمازی گناہ گار ہوگا، گذرنے والے پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

{۳} نمازی نے عام گذرگاہ پر نیت باندھ لی اور گذرنے والے کے لیے اُس کے سامنے کے بجائے، دوسرا راستہ اختیار کرنا ممکن تھا؛ لیکن اِس کے باوجود وہ نمازی کے سامنے سے گذرے، تو ایسی صورت میں دونوں گناہ گار ہوں گے۔

{۴} نمازی نے ایسی جگہ نیت باندھی، جو عام گذرگاہ نہیں ہے؛ لیکن اگر گذرنے والے کو کسی وجہ سے اُس کے سامنے سے گذرنا ناگزیر ہوگیا، تو ایسی صورت میں کسی پر گناہ نہیں ہوگا۔

﴿۶﴾ اِس کا جواب سوال نمبر ۵ کے جواب میں تفصیل سے دیا جا چکا ہے۔

﴿۷﴾ اگر کوئی شخص نمازی کے بالکل محاذات میں بیٹھا ہوا ہو، تو اِس صورت میں سامنے سے ہٹنا مرور میں داخل نہیں ہے؛ البتہ اگر نمازی دائیں جانب کچھ ہٹا ہوا ہے، تو بیٹھنے والے کو چاہیے کہ اُس کے بائیں جانب سے ہٹے اور اگر نمازی بائیں جانب ہٹا ہوا ہے، تو اُس کے دائیں جانب سے ہٹے اور اگر بالکل محاذات میں ہو تو ہر طرف سے ہٹ سکتے ہیں؛ لیکن مذکورہ صورت میں بیٹھے رہنا اور ختمِ نماز کا انتظار کرنا اولیٰ ہے۔

**قال الشّاميؒ : و لو مرَّ اثنان ، يقومُ أحدُهما أمامَه ، و يمرُّ الآخر ، و يفعلُ الآخر هكذا و يَمُرَّان كذا في "القنية". (۱)**

﴿۸﴾ سترہ لگانے کا اصل مقصد نمازی کو تشویش یعنی: اُس کے خیالات کو منتشر ہونے سے بچانا ہے؛ تاکہ وہ خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھ سکے، چنانچہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ محقق

(۱) ردّ المحتار مع الدّرّ المختار: ۲/۴۰۱، كتابُ الصّلاة ، بابُ ما يفسد الصَّلاة و ما يكره فيها ، وكذا في إمداد الأحكام: ۲/۴۲۳، كتاب الصّلاة ، مسائل متفرّقة ، و منتخبات نظام الفتاویٰ :۱/ ۲۶۸، ط: إيفا پبليشنز ، دهلي .

ابن الہمامؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں :

"إنَّ السُّترةَ لرَبطِ الخيال وحصرِه؛ فإنَّ الإنسانَ مجبولٌ على أنَّ خيالَه ينبسطُ ويطُوفُ بكل جانبٍ إذا كان في مكانٍ وسيعٍ ، وحيثُ يكون المكانُ ضيقًا، ينقبضُ هناك ، وينقبضُ حتّى لايبقى له جولانٌ وتطوافٌ فيما وراءه، فإذا أراد الشّارعُ أن لا يجول خياله بكل جانبٍ ، وأن يمثل بين يديه كما ينبغي له، أمره بالسّترة لذلك.(۱)

سترہ لگانے کا مذکورہ مقصد اُسی وقت کامل طور پر حاصل ہوسکتا ہے، جب کہ اُس کو باقاعدہ زمین میں گاڑا جائے؛ اِسی لیے حضراتِ فقہائے کرام نے سترے کے بارے میں اصلاً یہی حکم ذکر کیا ہے کہ اُس کو زمین میں گاڑا جائے؛ البتہ اگر زمین سخت ہے، جس میں گاڑنا ممکن نہیں ہے، تو بعض فقہاء نے اُس کو لمبائی میں زمین کے اوپر رکھنے کی بھی اِجازت دی ہے؛ اِس لیے کہ اِس صورت میں بھی گاڑنے کی مشابہت ہوجاتی ہے۔

قال المرغينانيؒ : ويغرزُ دون الإلقاء والخطّ ؛ لأنَّ المقصودَ لايحصلُ به ، قال ابن الهمامؒ : قوله: الغرز دون الإلقاء" هذا إذا كانت الأرض بحيثُ يغرز فيه ، فإن كانت صلبةً ، اختلفوا ، فقيل : توضعُ وقيل : لا توضعُ".

وقال البابرتيؒ : التّاسعُ : أنَّ المعتبرَ هو الغرزُ دون الإلقاء والخطّ ، قيل : هذا إذا كانت الأرضُ رخوةً ، أمّا إذا كانت صلبةً لا يمكنه الغرزُ ؛ فإنّه يضعُها طولاً لتكون على هيئة الغرز".(۲)

قال الشّاميؒ : ثمّ المفهومُ من كلامهم أنّه عند إمكان الغرز لا يكفي الوضعُ ، وعند إمكان الوضع لا يكفي الخطّ".(۳)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ سترے میں اصل حکم یہ ہے کہ اُس میں استقرار اور ٹھہراؤ

(۱) فيض الباري: ۲/۱۰۶،كتاب الصّلاة، أبوابُ سترة المصلّي، ط:دار الكتب العلمية، بيروت.

(۲) الهداية مع فتح القدير والعناية :۱/۴۷۱، كتاب الصّلاة ، باب ما يفسدُ وما يكره فيها .

(۳) ردّ المحتار مع الدّرّ المختار :۲/۴۰۳۔

پایا جائے؛ تا کہ سترے کی مشروعیت کا مقصد کامل طور پر حاصل ہو سکے۔ آپ نے سوال میں سترہ لگانے کی جو مختلف صورتیں ذکر کی ہیں، وہ سب عارضی ہیں، جن میں سے بعض کی اگر چہ فقہائے کرام نے بہ وقتِ ضرورت گنجائش دی ہے اور بعض کے بارے میں لاعلمی کا اِظہار کیا ہے، جب کہ بعض صورتوں کا حکم کتبِ فقہ میں تلاشِ بسیار کے بعد بھی صراحتاً نہیں مل سکا؛ بہرحال مذکورہ صورتوں کو بلا ضرورت اِختیار کرنا مناسب نہیں ہے، اب بالتعیین ہر صورت کا حکم لکھا جاتا ہے:

(الف) بعض آدمی عارضی طور پر سترہ کے بقدر کوئی چیز مثلاً: تپائی وغیرہ نمازی کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور پھر سامنے سے گزر جاتے ہیں، پھر وہ چیز بھی اُس کے سامنے سے ہٹا لیتے ہیں۔

یہ صورت اختیار کرنا درست ہے، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: "**أرادَ المرورَ بین یدي المصلّي فإن کان معه شيءٌ یضعُه بین یدیه ، ثم یمُرُّ ویأخُذُه**". (۱)

(ب) بعض لوگ کسی دوسرے آدمی کو نمازی کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں اور گزر جاتے ہیں اور پھر وہ سامنے کھڑا ہونے والا شخص بھی ہٹ جاتا ہے۔

اِس صورت کی بھی حضراتِ فقہاء نے اِجازت دی ہے، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: **ولو مرَّ اثنان یقومُ أحدُهما أمامَه ، ویمرُّ الآخر، و یفعلُ الآخر هکذا یَمُرَّان کذا في "القنیة"**. (۲)

(ج) بعض حضرات "عصا" لے کر چلتے ہیں، وہ اپنا عصا نمازی کے سامنے رکھ کر آگے سے گزر جاتے ہیں اور پھر اپنا عصا بھی ساتھ میں لے جاتے ہیں۔

اِس صورت کے بارے میں علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ اُن کو کسی کتاب میں اِس کا حکم نہیں ملا۔ **قال: "وإذا کان معه عصًا لا تقفُ علی الأرض بنفسها ، فأمسکها بیده ، ومرَّ من خلفها ، هل یکفي ذلك لم أرَه"** (۳)

البتہ مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ فرماتے ہیں: "بہ ظاہر اِس کے جواز میں کوئی مانع نہیں ہے؛

(۱) ردّ المحتار: ۲/۴۰۱۔

(۲) ردّ المحتار مع الدّرّ المختار: ۲/۴۰۱، کتابُ الصّلاة، بابُ ما یفسد الصَّلاة وما یکره فیها.

(۳) ردّ المحتار: ۱/۴۰۱۔

لہٰذا بہ وقتِ ضرورت اِس کی گنجائش ہے۔(۱)

(د) بعض لوگ اپنا رومال نمازی کے سامنے کر دیتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔

اِس کا بھی وہی حکم ہے، جو جزء نمبر۳ کا ہے۔

(ہ) بعض علاقوں میں سترہ کا یہ طریقہ رائج ہے کہ چند نمازیوں سے آگے ایک خاص طریقہ سے بنی ہوئی تپائی، یا کوئی دوسری چیز رکھ دی جاتی ہے، جس کے بیچ کا حصہ زمین سے مس نہیں ہوتا ہے، صرف دونوں طرف کے کنارے زمین سے لگے ہوئے ہوتے ہیں؛ کیا اِس طرح کی چیزیں سترہ بن سکتی ہیں؟ کیا سترے کے لیے زمین سے مس رہنا ضروری ہے؟

اِس صورت میں اگر چہ ہر نمازی کے سامنے سترہ زمین سے مس نہیں ہوتا ہے؛ لیکن چونکہ اِس کو باقاعدہ سترے کے مقصد سے بنایا جاتا ہے اور دونوں طرف کے کونے زمین پر ٹکے ہوئے ہوتے ہیں؛ اِس لیے گویا اِس صورت میں بھی حکماً ہر نمازی کے سامنے سترے کا زمین سے اتصال پایا جاتا ہے؛ لہٰذا اِس طرح کی چیزیں شرعاً سترہ بن سکتی ہیں۔

﴿۹﴾ پہلے سلام کے بعد نمازی کے سامنے سے گذرنا شرعاً درست ہے؛ اِس لیے کہ نماز پہلے سلام سے ختم ہوجاتی ہے؛ بلکہ ''علیکم'' کہنے سے پہلے لفظِ ''السّلام'' سے ہی نماز ختم ہوجاتی ہے؛ لہٰذا بعض لوگوں کا کہنا کہ ''دونوں سلام واجب ہیں؛ اِس لیے پہلے سلام کے بعد گذرنا مکروہ ہے'' غلط ہے؛ اِس لیے کہ دونوں سلام اگر چہ واجب ہیں؛ لیکن نماز پہلے سلام ہی پر ختم ہوجاتی ہے، اِسی وجہ سے اگر کوئی شخص پہلے سلام کے بعد اقتداء کرے، تو اُس کی اقتدا صحیح نہیں ہوگی۔

**قال الحصكفيّ: ''و لفظُ السَّلام مرّتين، فالثّاني واجبٌ على الأصحّ، ''برهان'' دون ''عليكم'' وتنقضي قدوةٌ بالأوّل قبل'' عليكم'' على المشهور عندنا''.**

**قال الشّاميّ: الإمامُ إذا فرَغ من صلاته، فلمّا قال ''السّلام''، جاء رجلٌ، واقتدىٰ به قبل أن يقولَ ''عليكم'' لا يصيرُ داخلاً في صلاته؛ لأنّ هذا سلامٌ''.** (۲)

(۱) احسن الفتاویٰ: ۴/۴۱۰۔

(۲) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۲/۱۶۲، كتاب الصّلاة، بابُ صفة الصّلاة، ط: زكريا، ديوبند.

﴿۱۰﴾ اِس صورت کا حکم کتبِ فقہ وفتاوی میں تلاشِ بسیار کے بعد نہیں مل سکا، البتہ احادیث اور فقہاء کی تصریحات میں پہلی صف کو مکمل کرنے کی بہت تاکید آئی ہے اور پہلی صف میں نماز پڑھنے کے فضائل بھی کثرت سے وارد ہوئے ہیں؛ اِس لیے اصل حکم یہ ہے کہ پہلی صف کو مکمل کرنے کے بعد ہی دوسری صف لگائی جائے؛ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اگلی صفوں میں نماز پڑھنے کی فضیلت حاصل ہو سکے۔

﴿۱۱﴾ مسجدِ حرام میں بھی نمازیوں کے سامنے گذرنے کا وہی حکم ہے، جو دیگر بڑی مسجدوں میں ہے؛ البتہ طواف کرنے والوں کے لیے طواف کرتے ہوئے نمازی کے آگے سے گذرنا جائز ہے اور مطاف میں اگر گذرنا زیادہ ہی ناگزیر ہو جائے، تو کم از کم موضعِ سجود کے آگے سے گذرنا چاہیے۔

**قال الشّاميؒ : ذكر في "حاشية المدني" لا يمنعُ المارُ داخلَ الكعبة ، وخلفَ المقام وحاشية المطاف ، لما روى أحمد وأبوداؤد عن المطّلب بن أبي وداعةؓ أنَّه رأى النّبيَّ صلّى الله عليه وسلّم يُصَلِّي ممّا يَلِي بابَ بني سهمٍ ، والنّاسُ يمرُّون بين يديه ، و ليس بينهما سترةٌ ، و هو محمولٌ على الطّائفين فيما يظهرُ ؛ لأنَّ الطّوافَ صلاةٌ ، فصار كمن بين يديه صُفوفٌ من المصلّين.** (۱)

﴿۱۲﴾ نمازی کے لیے عزیمت یہ ہے کہ اپنے سامنے سے گذرنے والے سے کوئی تعرض نہ کرے اور اُس کو گذرنے دے؛ لیکن اگر اِشارے سے یا سبحان اللہ کہہ کر، یا زور سے قراءت کر کے گذرنے والے کو روکنے کی کوشش کی، تو اِس کی بھی گنجائش ہے؛ البتہ گذرنے والے سے مار پیٹ کرنا یا زور زبردستی کرنا بہر حال جائز نہیں ہے۔

---

**(۱) ...... (الف) (ردُّ المحتار مع الدّرّ المختار :۲/۴۰۰)**

**(ب) وقال العثماني التّهانويؒ: ومثلُه في" البحر العميق" وحكاه عزُّالدّين بن جماعة عن "مشكلات الآثار" للطَّحاوي ، ونَقَلَه المُلاّؒ في منسكه الكبير ، ونقله سنان آفندي أيضًا في منسكه. وقال : ويؤيِّدُ تخصيصَه بالطّائفين ما في هذا الحديث عند الطَّحاوي بسَندٍ حسنٍ :" ليس بينه و بين الطَّواف سُترةٌ ".**

**(إعلاء السّنن: ۸۴/۵، كتاب الصّلاة ، حكمُ المرور بين يدي المصلّي في المسجد الحرام وغيره ، ط: أشرفية ، ديوبند)**

قال الحصكفيؒ : ويدفَعُه هو رخصةٌ ، فتركه أفضلُ بتسبيحٍ أو جهرٍ بقراءةٍ أو إشارةٍ ، ولا يُزَادُ عليها عندنا .

قال الشّامي‌ؒ : بل قولهم :"ولا يزادُ على إشارة" صريحٌ في أنَّ الرّخصةَ هي الإشارةُ ، وأنَّ المقاتلةَ غير مأذونٍ بها أصلاً عندنا .(۱)

﴿۱۳﴾ فسادِ وضوء کے عذر سے نمازیوں کے سامنے سے گذرنا جائز ہے اور جس صورت میں نمازیوں کو حرج کم ہو، موقع پر وہی صورت اختیار کرنی چاہیے۔

﴿۱۴﴾ صف کے خلا کو پر کرنے کے لیے نمازیوں کے سامنے سے گذر سکتے ہیں؛ بل کہ اگر سامنے سے جگہ نہ ہو، تو صفوں کو چیر کر بھی جا سکتے ہیں۔

قال الحصكفيؒ : ولو كان فرجةً ، فللدَّاخلِ أن يَمُرَّ على رقبة من لم يسدها ؛ لأنّه أسقَطَ حرمةَ نفسه ، فتنبَّه. (۲)

---

(۱) ...... (الف) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۲/۴۰۳، و مجمع الأنهر: ۱/۱۲۲، ط: دار إحياء التّراث العربي .

(ب) وقال ابن نجيمؒ : السّادس عشر أنَّ تركَ الدَّرء أفضلُ لما في " البدائع " : ومن المشائخ مَن قالَ : إنّ الدَّرءَ رخصةٌ ، والأفضلُ أن لايدرأ ؛ لأنهّ ليس من أعمال الصّلاة ، وكذا رواه الماتريدي عن أبي حنيفةؒ، والأمرُ بالدّرء في الحديث لبيان الرّخصة كالأمر بقتل الأسودين . (البحرالرّائق:۲/ ۱۹، كتاب الصّلاة ، بابُ ما يفسد الصَّلاة وما يكره فيها )

(۲)......(الف) قال الشّامي نقلاً عن القنية: قام في آخرالصّفّ في المسجد بينه وبين الصّفوف مواضع خاليةٌ ، فللدَّاخل أن يَمُرَّ بين يديه ليَصِلَ الصّفوفَ ؛ لأنَّه أسقَطَ حرمةَ نفسه ، فلا يأثمُ المارُّ بين يديه ، دلَّ عليه ما ذكر في "الفردوس" برواية ابن عباسؓ عن النّبيّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم أنَّه قال : من نَظَرَ إلى فرجةٍ في صفٍّ ، فليَسُدَّها بنفسه ، فإن لم يَفعَل ، فمرَّ مارٌّ، فليتخطَّ على رقبته؛ فإنّه لاحرمةَ له أي:فليتخطّ المارُّعلى رقبة من لم يسد الفرجة .

(ب) قال الشّامي‌ؒ : وليس المرادُ بـ" التّخطي " الوطءُ على رقبته ؛ لأنّه قد يؤدي إلى قتله ولا يجوزُ؛ بل المرادُ أن يخطو مِن فوق رقبته، وإذا كان له ذلك، فله أن يَمُرَّ مِن بين يديه بالأولى فافهَمْ.(الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۲/۴۰۱، وكذا في أحسن الفتاوى:۳/ ۲۹۷)

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۳/ ۵/ ۱۴۳۵ھ-۲۵/ ۳/ ۲۰۱۴ء

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرنا کیسا ہے؟

**سوال:** ﴿۱۴۱﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

(۱) نمازِ جنازہ کے فوراً بعد اجتماعی شکل میں دعا کرنا کیسا ہے؟ ایک صاحب کا دعوی ہے، یہ حدیث شریف سے ثابت ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس سلسلے میں کوئی حدیث شریف موجود ہے یا نہیں؟ اور وہ کس درجے کی ہے، اکابر اہلِ سنت والجماعت کا موقف کیا ہے؟ از راہِ کرم مفصل و باحوالہ جواب عنایت فرمائیں۔

(۲) نمازِ جناز میں امام صاحب نے تین تکبیریں کہیں اور سلام پھیر دیا تو کیا نماز ہوگئی یا نہیں؟ مفصل و باحوالہ جواب مرحمت فرمائیں۔

**نوٹ:** ہمارے یہاں مختلف فرقے ہیں؛ اس لیے دونوں مسئلوں میں حدیث ضرور نقل فرمادیں۔

مستفتی: قاری محمد اقبال، امام مسجد مصطفیٰ سری نگر

۸۱۵/ د ۱۴۳۴ھ

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق:**

(۱) دفن کے بعد دعا کا ذکر تو احادیث میں آیا ہے؛ لیکن نمازِ جنازہ کے فوراً بعد دعا سے متعلق کسی حدیث میں ذکر نہیں آیا؛ بلکہ یہ ایک غیر مشروع عمل اور بدعت ہے؛ اسی لیے مشہور شارح حدیث ملاّ علی قاریؒ نے نمازِ جنازہ کے بعد دعا کو منع لکھا ہے اور اسے نمازِ جنازہ کے اندر (اپنی طرف سے)

اضافہ کے مشابہ قرار دیا۔ **ولا يدعو للميّت بعد صلاة الجنازة ؛ لأنّه يشبه الزّيادة في صلاة الجنازة إلخ** (۱) فقہ حنفی کی مشہور کتاب خلاصۃ الفتاویٰ اور بزازیہ میں بھی نمازِ جنازہ کے بعد دعا کو منع لکھا ہے۔ **ولايقوم بالدّعاء بعد صلاة الجنازة؛ لأنّه دعا مرّة؛ لأنّ أكثرها دعاء.** (۲)

الغرض نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی شکل میں دعا کرنا بے اصل ہے، جو شخص اس کے ثابت بالحدیث ہونے کا دعویٰ کرے وہ حدیث مع حوالہ پیش کرے، پھر ان شاء اللہ غور کیا جائے گا۔

(۲) حضور ﷺ نمازِ جنازہ چار تکبیروں کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے، چار سے کم تکبیروں کے ساتھ پڑھانا کسی بھی حدیث سے ثابت نہیں؛ اس بنا پر فقہائے کرام نے نمازِ جنازہ کے اندر چاروں تکبیروں کو ''رکن'' قرار دیا؛ لہٰذا اگر کسی نے صرف تین تکبیریں کہیں، چوتھی تکبیر کہی ہی نہیں، تو ''رکن'' فوت ہونے کی وجہ سے نمازِ جنازہ صحیح نہ ہوئی۔ **عن أبي هريرة رضي الله عنه أنّ النّبيّ – صلّى الله عليه وسلّم – صلّى على النّجاشي فكبّر أربعًا ............ والعمل على هذا عند أكثر أهل العلم من أصحاب النّبيّ – صلّى الله عليه وسلّم – وغيرهم يرون التّكبير على الجنازة أربع تكبيرات** (۳) اور فتاویٰ ہندیہ میں ہے: **وصلاة الجنازة أربع تكبيرات ، ولو ترك واحدة منها لم تجز صلاته** (۴)۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/۷/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

(۱) مرقاة المفاتيح: ۱۲۱۳/۳، باب المشي بالجنازة والصّلاة عليها ، ط: دارالفكر بيروت .

(۲) البزّازية: ۸۰/۴، الخامس والعشرون في الجنائز وفيه الشّهيد .

(۳) أخرجه التّرمذي ، رقم: ۱۰۲۲، باب ما جاء في التّكبير على الجنائز .

(۴) الفتاوىٰ الهندية: ۱۶۴/۱۔

# حج اور زکات سے متعلق مسائل

## حالتِ احرام میں عذر کی وجہ سے لنگوٹ پہننے کا حکم

**سوال:** ﴿۴۴﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

ایک شخص کو تقاطر بول کی پریشانی ہے، جب وہ استنجاء وغیرہ کے لیے جاتا ہے، تو اس سے فراغت کے فورًا بعد وہ نماز یا دیگر عبادت نہیں کر سکتا؛ کیوں کہ پیشاب کا قطرہ وقفہ وقفہ سے آتا رہتا ہے، جس کی بنا پر اس کا وضو نہیں ہو سکتا، تقریبًا ہر استنجاء کے بعد اسے ایک گھنٹہ تک انتظار کرنا پڑتا ہے، اس کے لیے وہ انڈر رویر میں ٹیشو پیپر استعمال کرتا ہے؛ تاکہ اس کا کپڑا ناپاک نہ ہو، جب وہ ایک گھنٹہ میں مطمئن ہو جاتا ہے کہ اب تقاطر بند ہو گیا، تو پھر وہ طہارت حاصل کر کے وضو کرتا ہے، پھر نماز پڑھتا ہے۔

اب قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ اس بار حج بیت اللہ کے لیے جا رہا ہے، اور حالتِ احرام میں وہ انڈر رویر نہیں پہن سکتا، اور اس کی بنا پر وہ طہارت کے لیے ٹیشو بھی استعمال نہیں کر سکتا، وہ بہت پریشان ہے کہ کیا کیا جائے؟ قطرہ ٹپکے گا، احرام ناپاک ہوگا، بدن پر گرا تو وہ بھی ناپاک ہوگا، اور احرام بھی کتنا تبدیل کیا جائے؟ کتنی بار بدن دھویا جائے، انڈر رویر استعمال کر کے دَم کی ادائیگی بھی اس کے مسئلہ کا حل نہیں ہے، اور نہ ہی وہ شرعی معذور کی فہرست میں ہے۔

لہٰذا جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا وہ ٹیشو استعمال کرنے کے لیے انڈر رویر کی جگہ ''لنگوٹ'' یا ''ڈائپر'' پہن سکتا ہے؟ گو یہ سلے ہوئے لباس کی فہرست میں نہیں ہے، تاہم عام حالت میں استعمال کیے جانے والے لباس میں اس کا شمار ہوتا ہے، جس کی ممانعت حالت احرام میں ہے،

برائے کرم جلد از جلد مدلل ومفصل جواب عنایت فرمائیں؟

اس استفتاء کا ایک جواب مرسل ہے۔(۱) آپ سے مؤدّبانہ درخواست ہے کہ برائے کرم تین دنوں کے اندر مجھے اس جواب کی تصویب یا اس کا صحیح جواب جلد از جلد عنایت فرمائیں، کرم ہوگا۔

مجھے معلوم ہے کہ میری یہ عجلت کی درخواست آپ کے دارالافتاء کے ضابطہ کے خلاف ہے؛ لیکن چونکہ مستفتی حج کو نکلنے والا ہے، اور اس کی پریشانی کا حل تلاش کرنا ہم مفتیان کرام کی ذمہ داری ہے۔

مستفتی: مفتی محمد فیاض قاسمی

رام پور، سمستی پور، ۱۲۷/۸/ د ۱۴۳۵ھ

---

(۱) الجواب: بعون الوهّاب بشرط صحّة السّؤال

وعليكم السّلام ورحمة الله وبركاتهٗ

الحمد لله، والصّلاة والسّلام علىٰ رسول الله، أمّا بعد!

یہ بھی ایک بیماری ہے، جسے سلسلۃ البول کا نام دیا جاتا ہے، اور یہ انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے، آپ شرعی طور پر معذور ہیں۔ اس بیماری کے مریض شخص کے بارے میں اہلِ علم فرماتے ہیں کہ اسے وضو کر لینے کے بعد ایک دفعہ اپنے کپڑوں پر پانی کے چھینٹے مار لیے جائیں اور اپنی عبادت نماز وغیرہ شروع کر دینی چاہیے، اور دورانِ نماز گرنے والے قطروں کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیے، جیسے مستحاضہ عورت کرتی ہے نبیٔ کریم ﷺ نے مستحاضہ عورت کو حکم دیتے ہوئے فرمایا: توضّيء لوقت كلّ صلاة (بخاری: ۲۸/۲) تو ہر نماز کے لیے وضو کیا کر۔

لہٰذا آپ کو لنگوٹ یا ٹیشوز کے حوالے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، آپ وضو کر کے اپنے ارکان شروع کر دیجئے گا اور نماز کے لیے وضو کرتے رہیے گا۔ ان شاء اللہ آپ کی تمام عبادات اللہ قبول کرنے والا ہے۔ هٰذا ما عندي والله أعلم بالصّواب.

فتویٰ کمیٹی، محدث فتویٰ

فتویٰ نمبر: ۲۴۵۶۶

فتویٰ سینٹر: .........

Attp: II Urdu Fatwa com / in dex . php

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

صورتِ مسئولہ میں شخص مذکور شرعًا معذور نہیں ہے؛ اس لیے کہ شرعًا معذور وہ شخص کہلاتا ہے جس میں نقضِ وضو کا سبب اس تسلسل سے پایا جائے کہ اسے کسی ایک نماز کے پورے وقت میں طہارت کے ساتھ فرض نماز ادا کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ **ففي الدّرّ المختار مع ردّ المحتار : وصاحب عذر : من بہٖ سلس بول لا یمکنہ إمساکہ ، أواستطلاق بطن ........... إن استوعب عذرُہ تمام وقت صلاۃ مفروضۃ بأن لا یجد في جمیع وقتِھا زمنًا یتوضّأ و یصلّي فیہ خالیًا عن الحدث.** (۱)

اب جہاں تک مسئلہ ہے ''لنگوٹ'' پہننے کا تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ محرم کے لیے حالت احرام میں ایسا کپڑا استعمال کرنا منع ہے جو جسم کی ساخت کے مطابق کسی خاص ہیئت اور وضع پر سلا، یا بنایا گیا ہو۔ (مستفاد: معلم الحجاج، ص:۲۳۳) اور ''لنگوٹ'' نہ جسم کی کسی خاص ہیئت پر سلا جاتا ہے اور نہ ''ثوبِ مخیط'' کے طور پر لوگ اس کا استعمال کرتے ہیں، البتہ سلے ہوئے کپڑے سے مشابہت کی بنا پر بلا عذر اس کے استعمال کو مکروہ قرار دیا گیا ہے؛ لیکن عذر کی بنا پر یہ کراہت بھی ختم ہو جائے گی۔ **ففي الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: فإن زرّرہ أو خلّلہ أو عقدہ أساء ، ولا دم علیہ ، قال الشّاميّ : وکذا لو شدّہ بحبل و نحوہ لشبھہ حینئذ بالمخیط.** (۲)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مذکور فی السوال پریشانی کی بنا پر شخص مذکور ''لنگوٹ'' استعمال کرسکتا ہے

---

**(۱) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۱/۵۰۴، باب الحیض .**

**(۲) إذا لبس المحرم الذّکر المخیط وھو الملبوس المعمول علی قدر البدن أو علٰی قدر عضو منہ بحیث یحیط بہ سواء بخیاطۃ أو نسج أو لصق أو غیر ذلک لبسًا معتادًا ............ فعلیہ الجزاء. (غنیۃ النّاسک ، ص:۳۲۳، ط: یادگارِ شیخ، سہارن پور، وھٰکذا في معلّم الحجّاج ، ص:۲۳۳، قدیمي)**

اور حسبِ معمول ''ٹیشو پیپر'' کے ذریعہ استبراء حاصل کرنے کے بعد وضو کر کے نماز اور طواف کی ادائیگی کرلے۔

نوٹ: سوال کے ساتھ منسلکہ فتویٰ شخص مذکور کے حق میں صحیح نہیں ہے، فتویٰ میں جس روایت سے استدلال کیا گیا ہے، وہ اس عورت کے بارے میں ہے جسے نماز کے پورے وقت میں مسلسل خون آتا رہتا ہے، جب کہ شخص مذکور کی صورت حال یہ ہے کہ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد پیشاب کے قطرے بند ہوجاتے ہیں؛ لہٰذا اس شخص کو اس کے ساتھ ملحق کر کے معذور شرعی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہٰ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۱۱/۳۵ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## حاجی کے لیے منیٰ میں قصر واتمام کا حکم

محترم حضرات مفتیانِ کرام دارالعلوم دیوبند　　دامت برکاتہم

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

سردست ایک حساس مسئلہ سے متعلق دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں

**سوال:** ﴿۴۳﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

مسئلہ یہ ہے کہ جو حجاج مکہ مکرمہ ایسے وقت میں پہنچتے ہیں کہ حج سے پہلے مکہ مکرمہ میں پندرہ دن قیام نہیں ہو پاتا؛ بل کہ منیٰ کا قیام شامل کر کے پندرہ دن ہوتے ہیں، تو ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے؟ کیا وہ چار رکعت والی نمازوں میں قصر کریں گے یا اُن پر اتمام ضروری ہوگا؟ نیز ان پر ایام اضحیہ میں مالی قربانی لازم ہوگی یا نہیں؟

علماء کی آراء اس سلسلہ میں مختلف ہیں؛ اس لیے ام المدارس دارالعلوم دیوبند کا قصد کیا،

حضرات مفتیانِ کرام سے گذارش ہے کہ ادلۂ شرعیہ اور نصوص فقہیہ کی روشنی میں مدلل جواب دے کر ممنون فرمائیں، اس سے ان شاء اللہ اطمینان حاصل ہوگا۔

المستفتی: (مفتی) سعید الرحمٰن فاروقی
دار العلوم امدادیہ، ممبئی ۲۶/۷/ ۱۴۳۴ھ

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

خیر القرون سے لے کر آج سے کچھ سال پہلے تک تمام امت مسلمہ اس بات پر متفق تھی کہ ''منیٰ'' اور ''مکہ مکرمہ'' دونوں دو مستقل مقامات ہیں، کوئی کسی کے تابع نہیں ہے؛ اس لیے تقریباً فقہ کی ہر کتاب میں یہ مسئلہ ملتا ہے کہ جس شخص نے پندرہ روز مکہ مکرمہ میں قیام کا ارادہ کیا؛ لیکن درمیان میں منیٰ، مزدلفہ اور عرفات جانے کا ارادہ ہے، تو وہ شخص مسافر ہی رہے گا، مقیم نہ بنے گا؛ اس لیے کہ خروج الی منیٰ وعرفات کا ارادہ، نیت اقامت کے لیے مبطل ہے، چنانچہ درمختار میں ہے: **فلو دخل الحاجّ مكّة أيّام العشر لم تصح نيته ؛ لأنّه يخرج إلى منٰى و عرفة .**(۱)

اسی طرح البحر الرّائق میں ہے: **و ذكر في كتاب المناسك أنّ الحاجّ إذا دخل مكّة في أيّام العشر ونوى الإقامة نصف شهر لا يصحّ ؛ لأنّه لا بدّ له من الخروج إلى عرفات ، فلا يتحقّق الشّرط.**(۲)

نیز مبسوط سرخسی میں بھی یہ تصریح ہے کہ اگر (مثلاً) کوفہ کا رہنے والا کوئی شخص اس نیت سے مکہ مکرمہ آئے کہ وہاں اور منیٰ دونوں جگہ ملا کر پندرہ دن قیام کرے گا، تو وہ مسافر ہی رہے گا؛ اس لیے کہ اقامت کی نیت وہ معتبر ہوتی ہے جو ایک مقام پر ہو۔ **وإذا قدم الكوفي مكّة وهو ينوي أن يقيم فيها وبمنٰى خمسة عشر يومًا فهو مسافر ؛ لأنّ نيّة الإقامة ما يكون في موضع واحد إلخ.**(۳)

(۱) درّ مختار: ۲/۶۰۶، زکریا، دیوبند.
(۲) البحر الرّائق: ۲/۲۳۲۔
(۳) المبسوط للسّرخسي: ۱/۲۳۶، باب صلاة المسافر.

لیکن منیٰ کی طرف مکہ مکرمہ کی آبادی کے پھیلاؤ کی وجہ سے چند سالوں سے اہل علم کے درمیان یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ منیٰ کا سابقہ حکم اب بھی باقی ہے یا بدل گیا؟ علماء کا ایک بڑا طبقہ اس بات پر ہے کہ منیٰ کا سابق حکم اب بھی باقی ہے، مکہ مکرمہ کی آبادی کے پھیلاؤ کی وجہ سے ''منیٰ'' کو جزءِ مکہ نہیں قرار دیا جا سکتا، جب کہ علماء کی ایک دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ اب ''منیٰ'' مکہ مکرمہ کے ایک محلّہ کی حیثیت اختیار کر گیا اور دونوں مقامات موضعِ واحد کے حکم میں ہو گئے؛ لہٰذا جو حجاج کرام مکہ مکرمہ اور ''منیٰ'' دونوں جگہ ملا کر پندرہ دن قیام کا ارادہ رکھیں گے، ان پر چار رکعت والی نمازوں میں اتمام اور ایامِ اضحیہ میں مالی قربانی لازم ہوگی۔

لیکن نصوص اور دلائل کی روشنی میں پہلی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے کہ منیٰ اور مکہ مکرمہ دونوں اب بھی دو مستقل مقامات کی حیثیت سے باقی ہیں، منیٰ کو مکہ مکرمہ کا محلّہ قرار دینا صحیح نہیں اور جو حجاج کرام منیٰ اور مکہ مکرمہ دونوں جگہ ملا کر پندرہ دن قیام کی نیت سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوں گے، وہ بہ دستور مسافر رہیں گے، مقیم کے حکم میں نہ ہوں گے۔ یہی رائے دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کی بھی ہے، اس رائے کے وجوہِ ترجیح میں سے یہ ہے کہ ''منیٰ'' کو جزِ مکہ قرار دینے کے لیے جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں، اُن میں سے سب سے مضبوط دلیل یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کی آبادی بڑھتے بڑھتے ''منیٰ'' تک پہونچ چکی ہے؛ لہٰذا دونوں مقامات موضع واحد کے حکم میں ہو گئے۔

لیکن نصوص پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر اتصال (جس کے تحقّق کے سلسلے میں مشاہدین کی رپورٹوں کے درمیان کافی اختلافِ رائے موجود ہے) تسلیم بھی کر لیا جائے، پھر بھی ''منیٰ'' کو جزءِ مکہ مکرمہ نہیں قرار دیا جا سکتا؛ اس لیے کہ فقہاء نے جہاں بھی اتصال کی بحث کی ہے، وہاں دو آبادیوں کے درمیان اتصال مراد ہے نہ کہ غیر آباد مقام کا آباد کے ساتھ اتصال، ''کبیری'' کی درج ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

**من فارق بيوت موضع هو فيه من مصر أو قرية ناويا الذّهاب إلى موضعٍ بينه وبين ذلك الموضع المسافة المذكورة صار مسافرًا ، فلا يصير مسافرًا قبل أن يفارق عمران ما خرج منه من الجانب الّذي خرج منه حتّى لو كان ثمة محلّة**

منفصلة عن المصر وقد كانت متّصلة به لا يصير مسافرًا ما لم يجاوزها ، ولو جاوز العمران من جهة خروجه ، وكان بحذائه محلّة من الجانب الآخر يصير مسافرًا إذ المعتبر جانب خروجه .(۱)

''کبیری'' کی مندرجہ بالا عبارت کو علامہ شامی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ردّالمحتار میں نقل کرنے کے بعد اسکی مراد واضح کرتے ہوئے لکھا:

و أراد بالمحلّة في المسألتين ما كان عامرًا، أمّا لو كانت المحلّة خرابًا ليس فيها عمارة فلا يشترط مجاوزتها في المسألة الأولى ، ولو متّصلة بالمصر كما لا يخفى .(۲)

علامہ شامی کی وضاحت کی روشنی میں ''کبیری'' کی عبارت کا خلاصہ یہ ہوا کہ اگر کسی شہر کی آبادی دوسرے محلّہ وغیرہ کے ساتھ متصل ہو جائے ،تو اگر وہ محلّہ بھی آباد ہو،تو مسافر اپنے موضع اقامت سے متجاوز ہوکر جب تک اس محلے سے نکل نہ جائے ،اس وقت تک مسافر شمار نہ ہوگا اور اگر وہاں آبادی نہیں ہے،تو پھر اس محلے سے نکلنا بہ حکم مسافر ہونے کے لیے شرط نہیں؛ بل کہ اپنے موضع اقامت سے نکلتے ہی مسافر شمار ہوگا۔

الغرض معلوم ہوا کہ اس اتصال کا اعتبار ہے جو دو آبادیوں کے درمیان ہو نہ یہ کہ آبادی اور میدان وویرانے کے درمیان، نیز فقہاء کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آبادی سے مراد ایسی جگہ ہے، جہاں لوگ مستقل رہائش کے ارادے سے رہتے ہوں، وہاں ضروریاتِ زندگی دستیاب ہوں، صرف وقتی استعمال کی عمارات یا لوگوں کے عارضی قیام کیوجہ سے کسی جگہ کو''آبادی'' نہ کہا جائے گا، چناں چہ فقہاء نے شہر سے متصل باغات کو باوجودیکہ شہر سے متصل بھی ہوں، ان میں کام کرنے والوں کے مکانات اور جھونپڑیاں وغیرہ بھی ہوں نیز پہرے دار اور کاشت کار، سال کے کچھ حصہ یا پورے سال رہتے بھی ہوں، پھر بھی شہری آبادی کا جز قرار نہیں دیا۔ ردّ المحتار میں ہے:.........

---

(۱) كبيري،ص:۵۳۶، ط: أشرفي ، ديوبند .
(۲) ردّ المحتار:۲/۶۰۰، زكريا ، ديوبند .

**بخلاف البساتين ، و لو متّصلة بالبناء ؛ لأنّها ليست من البلدة ، ولو سكنها أهل البلدة في جميع السّنة أو بعضها ، ولا يعتبر سكنىٰ الحفظة والأكرة اتّفاقًا.** (۱)

مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں مکہ مکرمہ اور منیٰ کی صورتِ حال کو دیکھیں تو اس میں کوئی خفا نہیں رہ جاتا کہ یہاں دونوں مقامات میں سے ایک (مکہ مکرمہ) تو آباد ہے، دوسرا آبادی سے خالی؛ اس لیے کہ معائنہ کرنے والوں اور مشاہداتی کمیٹی کے رپورٹوں کے مطابق ''منیٰ'' میں جو عمارتیں ہیں مثلاً شاہی محلات، رابطۂ عالم اسلامی کا دفتر اور ہسپتال وغیرہ ان میں سے کوئی بھی عمارت بہ طور مستقل رہائش گاہ استعمال نہیں ہوتی؛ اکثر بلکہ سب صرف ایام حج میں حجاج اور مہمانوں کے قیام کے لیے استعمال ہوتی ہیں، ایام حج کے بعد پورا علاقہ بالکل ویران سنسان معلوم ہوتا ہے، سوائے پہرہ داروں اور مزدوروں وغیرہ کے وہاں کوئی نہیں ملتا اور نہ ہی ضروریاتِ زندگی میں سے کوئی چیز وہاں دستیاب ہوتی ہے۔(۲) اور ظاہر سی بات ہے کہ ایسی صورت میں منیٰ کو آباد علاقہ شمار نہیں کیا جا سکتا اور جب

(۱) ردّ المحتار :۲/۵۹۹، زکریا، دیوبند .

(۲) خلاصہ مشاہداتی رپورٹ مشاعر مقدسہ:

(منیٰ، عرفہ اور مزدلفہ کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے مؤلف کتاب، دارالعلوم دیوبند کے مؤقر مفتی واستاذ حضرت مولانا مفتی زین الاسلام صاحب قاسمی نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ ایک سفر میں ان مقامات کا ایک سے زائد مرتبہ تفصیلی مشاہدہ کیا، مشاہدوں کے بعد حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے جو تفصیلی رپورٹ تیار کی اُس کے اہم اجزاء ملاحظہ فرمائیں) مرتب:

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

راقم الحروف اور مفتی سعید الرحمٰن صاحب مفتی مدرسہ امدادیہ ممبئی نے اور بھی دو رفقاء کے ساتھ ۵/ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ مطابق ۶/فروری ۲۰۱۴ء عمرہ کی نیت سے مکہ مکرمہ کا سفر کیا اس سفر کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ منیٰ مزدلفہ عرفات کا بہ ذاتِ خود مشاہدہ کیا جائے اور معلومات حاصل کر کے یقینی اور واضح رپورٹ مرتب کی جائے۔ ==

== چناں چہ ۷/ فروری کو مکہ مکرمہ پہونچ کر عمرہ سے فارغ ہوئے ۸/ کی صبح مقامی حضرات سے رابطہ کر کے بعد نماز ظہر معائنہ کے لیے گئے۔ اس سفر میں ہم نے مشاعر مقدسہ (منیٰ، مزدلفہ، عرفات، معیصم) کا دو مرتبہ تفصیلی مشاہدہ مختلف رفقا کے ساتھ کیا، پہلے دن (۸/ فروری) کے مشاہدے میں ہمارے ساتھ مفتی سعید الرحمٰن صاحب موصوف مفتی عبدالرحمٰن صاحب ولد ارنگری (غازی پور) مقیم جدہ تھے یہ مشاہدہ مولانا محمد یونس صاحب قاسمی اعظمی موظف انڈین حج مشن مکہ کی رہبری اور جناب محمد علی صاحب حیدرآبادی کی سیاقت میں ہوا، اس مشاہدے میں منیٰ، مزدلفہ، عرفات اور معیصم کے حدود اور اس میں واقع عمارات اور بلڈنگوں کو خاص طور پر دیکھا، دوسرے دن (۱۰/ فروری) کے مشاہدہ میں راقم الحروف کے ہمراہ مفتی سعید الرحمٰن صاحب موصوف مفتی مجد القدوس خبیب رومی (مفتی مدرسہ عربیہ مظاہر العلوم سہارنپور) ابوالبرکات صاحب اور رضوان صاحب تھے ہم نے یہ مشاہدہ پروفیسر حسن امام صاحب (پروفیسر ام القریٰ یونیورسٹی مکہ) کی معیت اور رہبری میں کیا، حسن امام صاحب موصوف عزیزیہ جنوبیہ میں ۳۵/ سال سے مقیم ہیں، ہم ان کے ساتھ منیٰ، مزدلفہ اور عرفات کے علاقہ میں مختلف سڑکوں سے گئے، دونوں دنوں میں ہم نے مقامات میں جا کر مختلف پہلوؤں سے ان کا مشاہدہ کیا، اور قریب پہنچ کر بعض جگہوں کا فاصلہ بھی نوٹ کیا بالخصوص وہ جگہیں جن کے بارے میں دیگر رپورٹوں میں کوئی خاص نشاندہی کی گئی ہے، ہم ایسی قابل غور باتوں کی ایک یادداشت بھی تیار کر کے لے گئے تھے اور مشاہدہ کی خاص باتوں کو بروقت موقعہ پر نوٹ بھی کرتے رہے۔

دونوں دنوں کے مشاہدہ میں جو باتیں ہم نے نوٹ کی تھیں انہیں تیسرے دن (۹/ فروری) کو جناب عبد الحفیظ ملک مکی صاحب (جو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ کے خلیفہ صاحب بصیرت عالم مدرسہ صولتیہ کے سابق شیخ الحدیث، ۴۰، ۵۰/ سال سے مکہ مکرمہ میں مقیم) کو سنایا، موصوف نے مزید کچھ باتیں بتلائیں اور ہماری تحریر پر تصویب و تائید کے دستخط فرمائے، پھر جناب انجینئر عبدالمنان صاحب جو عرصہ دراز سے مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں اور حرم شریف کے توسیعی و تعمیراتی امور میں شریک ہیں، انہوں نے بھی ہماری رپورٹ کو سن کر زبانی تائید فرمائی اور کچھ باتیں مزید بتلائیں، اُن اضافات کو بھی ہم نے اپنی رپورٹ میں شامل کرلیا ہے۔

منیٰ، مزدلفہ، عرفات، مشاعر مقدسہ کے سلسلہ میں جو باتیں ہمارے مشاہدہ میں آئیں اور موثق طور پر معلوم ہوئیں اُنہیں درج ذیل کیا جاتا ہے: ==

.......................................................................................................

== ''منیٰ'' میں مسجد خیف، رابطہ عالم اسلامی کی عمارت اور شاہی محل ہیں؛ لیکن یہ سال بھر بند رہتے ہیں، صرف ایام حج میں استعمال ہوتے ہیں، رابطہ کی عمارت رابطہ کے مہمان حاجیوں کے لیے اور شاہی محل جو پہاڑی پر واقع ہے شاہی خاندان کے لیے بہ طور خیمے کے استعمال ہوتے ہیں، ایام حج کے علاوہ ان کا کوئی استعمال نہیں ہے، منیٰ میں ''مستشفی منیٰ الجسر'' سوائے ایام حج کے بقیہ دنوں میں بند رہتا ہے۔

منیٰ کا پورا علاقہ رہائشی آبادی سے خالی اور سنسان ہے، سوائے خیموں اور حج کے متعلق عمارات کے جو صرف حج میں استعمال ہوتی ہیں کوئی آبادی یا رہائش نہیں ہے؛ بلکہ موجودہ وقت میں اس علاقے میں رہائش اختیار کرنا ممنوع ہے۔

حج کے ایام کے علاوہ منیٰ کے خیموں کو بند کر دیا جاتا ہے، بس ایک دو سڑکیں ملازمین یا عابرین کے لیے چلتی رہتی ہیں۔

منیٰ میں کوئی مکتب یا دفتر سال بھر نہیں کھلا رہتا اس کا مشاہدہ ہم لوگوں نے خود کیا اور موقعہ پر معلوم بھی کیا؛ بلکہ مولانا یونس قاسمی نے بہ ذریعہ فون ''بلدیہ'' کے ذمہ دار سے معلوم کر کے بتلایا کہ منیٰ، مزدلفہ، عرفات میں کوئی بھی دفتر (مکتب) (نہ پولیس کا نہ کسی اور کا) ایسا نہیں ہے جو سال بھر کھلا رہے، سب بند رہتے ہیں، صرف پولیس اور بلدیہ دونوں کی گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں؛ تاکہ صفائی ستھرائی کی نگرانی رہ سکے۔

منیٰ کے باہر چاروں جانب باہر سے آنے والوں (حجاج و معتمرین) کی گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے جگہیں ہیں، یہ گاڑیاں شہر (مکہ) کے باہر کھڑی کی جاتی ہیں جو کہ شہر میں نہیں جا سکتیں، یہ پارکنگ شہر والوں کی گاڑیوں کے لیے نہیں ہے؛ بلکہ باہر سے آنے والوں کے لیے ہے۔

''معیصم'' کا علاقہ بالکل جنگل سنسان ۵-۶/ کلو میٹر تک پھیلا ہوا ہے، طریق ھدی الی طائف و ریاض اور طریق سیل الی طائف وہاں سے گذرا ہے، معیصم کے راستے پر ایک جانب سلاٹر ہاؤس کا وسیع و عریض میدان ہے اور دوسری جانب قبرستان اور مردہ خانہ ہے جو خاص حاجیوں کے لیے ہے، اور حج کے زمانہ میں استعمال ہوتا ہے، باقی دنوں میں بند رہتا ہے، اس معیصم کے علاقہ میں کوئی آبادی نہیں ہے، جنگل ہے، ''معیصم'' سے ''شرائع'' تک تقریباً دس کلو میٹر میں سوائے مذبح، مسلخ کے کوئی آبادی نہیں ہے، یہاں بھی ایک بڑا خزانۃ الماء (پانی کے ٹینک) ہے جس میں ایک ملین لیٹر پانی جمع ہوتا ہے؛ لیکن یہ صرف ایام حج میں استعمال ہوتا ہے، مزدلفہ میں چھوٹا خزانۃ الماء ہے۔ ==

..............................................................................................................

== ''مزدلفہ'' میں متعدد خزانۃ الماء (پانی کے ٹینک) ہیں، جس میں پانی اسٹور کیا جاتا ہے، یہ پانی خاص ایام حج میں استعمال ہوتا ہے (مکہ مکرمہ کی ضرورت کے لیے نہیں ہے) مزدلفہ میں ایک مسجد ''مشعر الحرام'' ہے، جو پورے سال بند رہتی ہے، مزدلفہ میں کوئی آبادی نہیں ہے، تھوڑے فاصلے پر آبادیاں ہیں؛ لیکن درمیان میں پہاڑ حائل ہیں، مزدلفہ کا میدان بالکل خالی سنسان ہے؛ البتہ فیملی والے سیر وتفریح کے لیے آتے ہیں، کوئی دکان یا آبادی نہیں ہے، نہ ہی مزدلفہ کے ساتھ مکہ کی آبادی کسی طرف سے ملی ہوئی ہے۔

مزدلفہ اور عرفات کے درمیان ساڑھے چھ ($6\frac{1}{2}$) کلومیٹر کا میدان بالکل خالی ہے، چوڑی سڑکیں ہیں، (ایام حج میں پیدل چلنے والوں کے لیے) راستے ہیں اور حمامات بنے ہیں، بس-فوجی ٹریننگ سینٹر، ہلال احمر، عبداللہ میڈیکل یہ چیزیں مخطط البنک روڈ پر ہیں اور یہ سب عزیزیہ میں ہیں۔

''عرفات'' میں صرف کھلا میدان ہے، مسجد نمرہ اور اسپتال مستشفی جبل الرحمۃ ہیں جو سال بھر بند رہتے ہیں (صرف ایام حج میں کھلتے ہیں) جبل رحمت کے پاس البتہ زائرین کی وجہ سے کچھ چہل پہل رہتی ہے، انہیں کی سواریاں اور گاڑیاں آتی ہیں، کھانے پینے کے کچھ سامان موبائل گاڑیوں سے مل جاتے ہیں؛ البتہ عرفات اور جامع ام القریٰ کے درمیان اسپیشل پولیس کے مراکز ہیں؛ مگر یہ جگہ اور خود ام القریٰ عرفات سے جدا ''عابدیہ'' میں واقع ہیں، عرفات کا پورا میدان سنسان ہے، جامعہ ام القریٰ اور عرفات کے درمیان تقریباً $2\frac{1}{2}$ کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔

منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں انتظامی امور سے متعلق دفاتر کی جگہیں متعین ہیں، بعض بلڈنگ کے طور پر اور بعض فائیور کے ڈھانچوں اور بعض خیموں کی شکل میں، یہ سال بھر بند رہتے ہیں، صرف ایام حج میں متحرک اور فعال ہوتے ہیں۔

منیٰ، مزدلفہ اور عرفات کے ریلوے اسٹیشن سوائے ایام حج کے سال بھر بند رہتے ہیں۔

مولانا عبدالحفیظ ملک مکی صاحب نے بتلایا کہ منیٰ، مزدلفہ، عرفات کو حکومت مشاعر مقدسہ کے نام سے موسوم کرتی ہے، ان کا نظم وانتظام بالکل جداگانہ طور پر ہوتا ہے، اس کی بڑی اور اعلیٰ باڈی '' **اللَّجْنَةُ الْعُلْيَا لشئون الحجّ والمشاعر المقدّسه** '' ہے، اس کے چیئرمین وزیر داخلہ ہوتے ہیں، دوسری ماتحت باڈی لجنۃ شؤن الحج والمشاعر المقدسہ ہے، اس کا چیئرمین امیر مکہ ہوتا ہے۔ ==

............................................................................................................................................................

== انتظامی طور پر مکہ کے انتظامات سے شئون الحج والمشاعر المقدسہ کے انتظامات کا کوئی تعلق نہیں ہے، تیس(۳۰) پینتیس (۳۵) سال پہلے جب منیٰ میں مکانات تھے اور وہ سال بھر کرایہ پر چلتے رہتے تھے، اس وقت وہاں ''عمدہ حی مکہ'' کے نام سے ایک ذمہ دار ہوتا تھا، جس کا دفتر منیٰ میں ہوتا تھا اور یہ منیٰ کے مکانات (جو اس وقت آباد اور رہائشی ہوا کرتے تھے) کا نگراں اور منتظم ہوتا تھا، میں نے (عبدالحفیظ مکی نے) بھی وہاں مکان کرایہ پر لیا تھا، اس زمانہ میں مکہ میں مہنگائی بہت تھی، تو بہت سے مزدور وہاں کرایہ پر مکان لے کر رہا کرتے تھے، اور شہر کے کچھ لوگوں نے اپنے گودام بنا رکھے تھے، اس زمانہ میں مسجد خیف میں پنج وقتہ نماز ہوا کرتی تھی اور خیف کا اسپتال بھی سال بھر استعمال ہوتا تھا، لیکن تیس(۳۰) پینتیس (۳۵) سال ہوئے کہ مفتیٔ مملکہ کے حکم سے منیٰ کے رہائشی مکانات ختم کر دیئے گئے، اب وہاں نہ ''عمدہ'' ہے اور نہ مسجد خیف میں سال بھر نماز ہوتی ہے، اور نہ خیف کا اسپتال ایام حج کے علاوہ استعمال ہوتا ہے۔

چناں چہ اب اس وقت مکہ کی انتظامیہ سے مشاعر مقدسہ کے انتظام کا کوئی تعلق نہیں ہے، مکہ کی انتظامیہ امارۃ العاصمۃ المقدسہ ہے اور مشاعر کی امارۃ المشاعر المقدسہ ہے۔

مولانا کی ان باتوں کی تصدیق وتائید جناب عبدالمنان صاحب انجینئر اور پروفیسر حسن امام صاحب نے بھی فرمائی۔

''خلاصۂ کلام'' مشاعر مقدسہ (منیٰ، مزدلفہ، عرفات) وسیع کھلے میدان اور غیر آباد جگہ کے اعتبار سے بہ حیثیت مشاعر مستقل جگہیں ہیں، مزدلفہ اور عرفات کے درمیان ۶ ½ کلومیٹر کا کھلا میدان ہے (جس پر سڑکیں اور حمامات ہیں) تینوں مشاعر کا علاقہ تقریباً ۲۰/ کلومیٹر سے زائد کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہے، اور اگر معیصم کو ملا لیا جائے تو لمبائی تقریباً تیس کلومیٹر ہو جاتی ہے، ان مقامات کی چوڑائی کہیں ۲/۳/ کلومیٹر اور کہیں ۴/ یا ۶/ کلومیٹر تک ہے، یہ پورا تیس (۳۰) پینتیس (۳۵) کلومیٹر کا لمبا علاقہ سنسان اور غیر آباد ہے۔

اپنے اس تفصیلی اور تجزیاتی مشاہدہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ ''مشاعر مقدسہ'' زمانۂ قدیم سے بہ حیثیت مشاعر عرفاً اور شرعاً معروف ومتعارف ہیں اور اپنی استقلالی اور امتیازی شان کے ساتھ تاقیامت موجود رہیں گے، ان کا استقلالی وسیع وعریض وجود متقاضی ہے کہ یہ کسی دوسرے کے تابع یا اس کا محلّہ نہ بنیں۔ ==

غیر آباد ثابت ہوگیا، تو مکہ مکرمہ کی آبادی کے منیٰ تک پہنچ جانے کی صورت میں بھی دونوں کو موضعِ واحد کے حکم میں نہیں قرار دیا جاسکتا۔

مزید یہ کہ ترمذی اور ابوداؤد وغیرہ کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ شریعت کا مقصد اور منشأ بھی ''منیٰ'' کو قیامت تک بہ حیثیت ''میدان'' باقی رکھنا ہے؛ تا کہ حجاج ٹھہر سکیں، نیز مناسک حج ادا کرسکیں۔ **عَنْ عَائِشَةَ – رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا – قَالَتْ: قُلْنَا : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! أَلاَ نَبْنِيْ لَكَ بَيْتًا يُظِلُّكَ بِمِنى ؟ قَالَ لاَ ، مِنى مُنَاخُ مَنْ سَبَقَ .**

یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا آپ کے لیے ''منیٰ'' میں کوئی گھر نہ بنوائیں جس کے سائے میں آپ رہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، منیٰ ان لوگوں کا پڑاؤ ہے جو یہاں پہلے آئیں۔ (۱)

اور ملا علی قاری رحمہ اللہ نے علامہ طیبی رحمہ اللہ سے ان الفاظ کے ساتھ اس حدیث کی تشریح نقل کی :**قال الطّيبي – رَحمه اللّٰهُ – أي: أتـأذن أن نبني لك بيتًا في منٰى لتسكن فيه؟**

== جب منیٰ، مزدلفہ، عرفات، معیصم ان سب کی مجموعی لمبائی تیس (۳۰) پینتیس (۳۵) کلو میٹر کے قریب ہے، اگر کسی جانب سے مکہ کی آبادی متصل ہو بھی جائے تو اس جزوی اتصال کی وجہ سے پورا وسیع و عریض علاقہ تابع یا محلّہ نہیں بن سکتا؛ کیوں کہ یہ ہمیشہ سے مستقل اور جدا حیثیت رکھتے ہیں، جیسے کہ غازی آباد اور دہلی دو مستقل اور جدا جگہیں ہیں دونوں کے احکام قصر و اتمام میں علیحدہ ہیں، اگر چہ ان دونوں جگہوں کی آبادیاں مل گئی ہیں۔

اسی طرح ''مشاعر مقدسہ'' کی استقلالیت اور مشعریت انہیں جدا اور ممتاز رکھتی ہیں، انہیں مکہ مکرمہ کا محلّہ، یا مکہ اور مشاعر کو، یا صرف منی و مزدلفہ کو مکہ کے ساتھ ملا کر، موضع واحد کا حکم دینا باعث تعجب ہے۔

اگر قصر و اتمام کے باب میں مشعریت سے قطع نظر کرلیا جائے تو بھی مکہ کا تابع یا اس کا محلّہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آبادی کے لحاظ سے مکہ کا جز ہو یا تکمیل ضروریات کے لحاظ سے فنا بن جائے؛ لیکن یہ دونوں باتیں بھی مشاعر مقدسہ اور مکہ مکرمہ کے مابین نہیں پائی جاتیں، نہ ہی مکہ کی رہائشی آبادی کا جز بن کر یہ جگہیں مکہ میں شامل ہیں نہ ہی مکہ کی ضروریات ان سے وابستہ ہیں۔

(۱) ترمذي: رقم:۸۸۱۔

**فمنع، وعلل بأن منٰی موضع لأداء النّسك من النّحر، ورمي الجمار، والحلق يشترك فيه النّاس، فلو بني فيها لأدّى إلى كثرة الأبنية تأسيا به،فتضيق على النّاس.** (۱)

الغرض حدیث اور اس کی تشریح سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ''منیٰ'' ہمیشہ میدان اور پڑاؤ کی جگہ کی حیثیت سے باقی رہے گا، اس کا آباد ہونا منشأ نبوی کے خلاف ہے۔

منیٰ اور مکہ کو موضع واحد قرار دینے والے ایک دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ''منیٰ'' مکہ مکرمہ کا ''فنا'' ہے اور شرعًا فنائے شہر کو شہر کا حکم دیا جاتا ہے؛ لیکن اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ ''فناء'' کی جو تعریف فقہاء نے کی ہے، وہ یہاں پر منطبق نہیں ہوتی، ''فنا'' کی تعریف درج ذیل ہے:

**وفناؤه ما اتّصل به معدًا لمصالحه.** (۲)

یعنی ''فنا'' کسی آبادی کا وہ قریبی متصل حصہ ہے جسے شہری مصلحتوں کے لیے تیار کیا گیا ہو، علامہ شامیؒ نے اس کو مزید وضاحت کے ساتھ نقل کیا: **فقد نصّ الأئمّة على أنّ الفناء ما أعدّ لدفن الموتى وحوائج المصر كركض الخيل والدّوابّ وجمع العساكر والخروج للرّمي إلخ.** (۳)

مذکورہ بالا تعریف اور سابق میں ذکر کردہ ''منیٰ'' کی صورتِ حال پر غور کرنے سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ ''فنا'' کی تعریف ''منیٰ'' پر قطعًا صادق نہیں آتی؛ اس لیے کہ منیٰ کے ساتھ اہل مکہ کی کوئی مصلحت - اہلِ مکہ ہونے کی حیثیت سے - وابستہ نہیں ہے اور نہ ہی مصالح اہلِ مکہ کے لیے ''منیٰ'' کو بنایا گیا ہے؛ بل کہ ''منیٰ'' تو ایک ''مشعر'' ہے، حجاجِ کرام وہاں مناسک حج ادا کرتے ہیں، قیام کرتے ہیں، قربانی کرتے ہیں وغیرہ؛ اس لیے ''منیٰ'' کو ''فنائے آفاق'' تو کہا جا سکتا ہے ''فنائے مکہ'' بہرحال نہیں کہا جا سکتا اور جب ''منیٰ'' فنائے مکہ ہے ہی نہیں تو دونوں مقامات کو موضعِ واحد کے حکم میں قرار دینا کیسے درست ہو سکتا ہے۔

---

(۱) مرقاة: ۵/۵۳۸ .

(۲) ملتقى الأبحر: ۱/۲۴۶، صلاة الجمعة، بيروت .

(۳) ردّ المحتار: ۳/۸ .

دوسری بات یہ ہے کہ قصر اور سفر کے اعتبار سے فنائے مصر منفصلہ کا حکم جدا ہے اور انعقادِ جمعہ کے اعتبار سے جدا، چنانچہ محیطِ برہانی اور طحطاوی وغیرہ میں اس کی تصریح کی گئی ہے کہ فنائے مصر میں جمعہ تو جائز ہے؛ لیکن شرعاً مسافر ہونے کے لیے ''فنائے مصر'' سے تجاوز ضروری نہیں ہے؛ بل کہ اصل آبادی سے نکلتے ہی وہ شخص مسافر شمار ہوگا اور قصر کرے گا، محیط برہانی میں ہے:

**وهٰذا بخلاف ما لو خرج المسافر عن عمران المصر حيث يقصر الصّلاة ؛ لأنّ فناء المصر إنّما يلحق بالمصر فيما كان من حوائج أهل المصر، وقصر الصّلاة ليس من حوائج أهل المصر، فلا يلحق الفناء بالمصر في حقّ هٰذا الحكم.**(۱)

یعنی اگر مسافر شہر کی آبادی سے نکل جائے تو وہ قصر شروع کر دے گا؛ اس لیے کہ فنائے مصر کو، مصر کے ساتھ ان اُمور میں لاحق کیا جاتا ہے جو اہلِ مصر کے حوائج میں سے ہوں، اور نماز میں قصر کرنا اہلِ شہر کی ضروریات میں سے نہیں ہے؛ لہٰذا اس حکم (قصر وا تمام) میں ''فنائے شہر'' کو شہر کے ساتھ لاحق نہیں کیا جائے گا۔

مذکورہ بالا فرق کو علامہ طحطاوی رحمہ اللہ نے بھی مراقی الفلاح کے حاشیے میں بیان کیا۔(۲)

مذکورہ بالا فرق کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ''منیٰ'' کو فنائے منفصلہ تسلیم بھی کر لیا جائے پھر بھی قصر و اتمام کے حکم میں کوئی اثر نہ پڑے گا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ جو حجاجِ کرام منیٰ اور مکہ مکرمہ دونوں جگہ ملا کر پندرہ دن قیام کی نیت سے مکہ آئیں گے، وہ شرعاً مسافر شمار ہوں گے، چار رکعت والی نمازوں میں قصر کریں گے، اور اُن پر ایسی صورت میں مالی قربانی لازم نہ ہوگی۔

یہی موقف نصوص سے زیادہ مؤید ہے اور حاجیوں کے لیے سہولت بھی اسی میں ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

---

**(۱) المحيط البرهاني: ۲/۶۶، الفصل الخامس والعشرون .**

**(۲) حاشية الطّحطاوي على مراقي الفلاح، ص:۴۲۳، باب صلاة المسافر، دار الكتاب، ديو بند .**

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۱/۱۱/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمد نعمان سیتا پوری

مفتیان دارالعلوم دیوبند

الجواب صواب والمجیب مصیب: سعید احمد پالن پوری، صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: ابو القاسم نعمانی غفرلہ، مہتمم دارالعلوم دیوبند

# حاجی کے لیے حج کے دوران منیٰ میں جمعہ

باسمہٖ تعالیٰ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

**سوال:** ﴿۴۴﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں؟

مندرجہ ذیل مسئلے سے متعلق دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کی رائے جاننا چاہتا ہوں، امید کہ مدلل جواب دے کر مشکور فرمائیں گے:

ایام حج میں قیام منیٰ کے دوران اگر جمعہ کا دن آجائے تو وہاں موجود لوگوں پر جمعہ پڑھنا فرض ہے یا نہیں؟ اگر کچھ لوگ اپنے خیمے میں کسی امام کے پیچھے "جمعہ" کی نماز پڑھ لیں تو فریضہ ذمے سے ساقط ہوگا یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ قدیم فقہی کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کہ ایام حج میں "منیٰ" شہر بن جاتا ہے؛ لہٰذا قیام منیٰ کے دوران جمعہ پڑھنا جائز؛ لیکن اب حالات کافی بدل چکے ہیں؛ اس لیے مسئلے کی تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی، امید کہ مدلل جواب سے نوازیں گے؟(۱)

مستفتی: از (مفتی) سعید الرحمٰن، ممبئی

۸۱۴/ ب ۱۴۳۶ھ

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللہ التّوفیق:**

قیامِ منیٰ کے دوران اگر جمعہ کا دن آجائے تو حاجیوں کے لیے جمعہ پڑھنا جائز نہیں ہے، ان پر

ظہر کی ادائیگی لازم ہے، اگر خیموں میں جمعہ پڑھیں گے تو فریضہ ذمے سے ساقط نہ ہوگا؛ اس لیے کہ صحتِ جمعہ کی دیگر بہت سی شرائط کے ساتھ ایک اہم شرط ''اذن سلطان'' (یعنی بادشاہ یا ان کی طرف سے اجازت یافتہ (نائب) شخص کی موجودگی) ہے، فقہ کی تقریباً تمام کتابوں میں شرائط جمعہ کے تحت یہ شرط بھی مذکور ہے، ''کبیری'' میں ہے: **الشّرط الثّاني كون الإمام فيها السّلطان أو من أذن له السّلطان لقوله عليه الصّلاة والسّلام: فمن تركها وله إمام عادل أو جائر فلا جمع الله شملهٔ ولا بَارَكَ له في أمره إلخ.** (ص: ۴۷۶، ط: دار الکتاب) نیز دیکھیں: **ردّ المحتار على الدّرّ المختار** (۳/۸، ط: زكريا، ديوبند) اور **البحر الرّائق** (۲/۱۵۴، ط: زكريا، ديوبند) وغیرہ۔

غیر اسلامی ممالک جیسے ہندوستان میں تو عامۃ المسلمین کی طرف سے نصبِ امام کو خلیفۃ المسلمین کی طرف سے نصب امام کا قائم مقام مانا گیا؛ چنانچہ لوگ کسی کو امام بنا کر جمعہ ادا کر لیں تو ان کی نماز ادا ہو جائے گی، شامی میں ہے: **فلو الولاة كفّارًا يجوز للمسلمين إقامة الجمعة، ويصير القاضي قاضيًا بتراضي المسلمين، ويجب عليهم أن يلتمسوا واليا مسلمًا** (**ردّ المحتار**: ۳/۱۴، ط: زكريا، ديوبند)؛ لیکن اسلامی ممالک جہاں مسلمان بادشاہ موجود ہوں اور اقامت جمعہ و اعیاد کی طرف خود حکومت توجہ دیتی ہو، وہاں اس شرط کا تحقق بہر حال ضروری ہے، محض عامۃ المسلمین کا کسی کو امام بنا کر جمعہ پڑھ لینا جواز جمعہ کے لیے کافی نہیں ہے؛ چناں چہ شامی میں ہے: **ونصب العامّة الخطيب غير معتبر مع وجود من ذكر؛ أمّا مع عدمهم فيجوز للضّرورة** (**الدّرّ المختار مع ردّ المحتار**: ۳/۱۴) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی اس کی صراحت کی ہے، دیکھیں: امداد الفتاویٰ: (۱/۶۹۹، سوال: ۶۲۵، مطبوعہ: زکریا، دیوبند)

سعودی عرب ایک اسلامی ملک ہے، وہاں مسلمان بادشاہ موجود ہیں، ملک میں جہاں کہیں جمعہ و عیدین کی جماعتیں ہوتی ہیں باقاعدہ حکومت کی اجازت سے ہوتی ہیں؛ بلکہ خطیب اور امام

حکومت کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں؛ اس لیے وہاں سلطان یا ان کے اجازت یافتہ شخص کے بغیر جمعہ قائم کرنا درست نہ ہوگا، اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ''منیٰ'' میں حکومت کی طرف سے جمعہ کا انتظام نہیں ہوتا، یہاں تک کہ ''مسجد خیف'' جو ایک بڑی مسجد ہے، اور حدود منیٰ کے اندر تعمیر شدہ ہے، اس میں بھی حکومت جمعہ کا انتظام نہیں کرتی؛ لہٰذا جو لوگ خیمے میں جمعہ پڑھ لیتے ہیں اُن کا عمل حضرات فقہاء کی تصریحات کے مطابق صحیح نہیں ہے، اس لیے ان کے ذمے سے فریضۂ ظہر ساقط نہ ہوگا، اُن پر نماز ظہر پڑھنا ضروری ہے۔

آپ نے سوال میں فقہاء کی جن عبارتوں کا حوالہ دیا بلا شبہ وہ عبارتیں کتب فقہ میں موجود ہیں، ان میں ایام حج میں قیام منیٰ کے دوران جواز جمعہ کی بات ضرور کہی گئی ہے؛ لیکن ان عبارات میں ہر جگہ یہ شرط بھی موجود ہے کہ وہاں خلیفۃ المسلمین یا ان کا قائم مقام موجود ہو، چناں چہ بدائع الصنائع میں ہے: **قال أبو حنيفة و أبو يوسف: تجوز إقامة الجمعة بها إذا كان المصلّي بهم الجمعة هو الخليفة أو أمير العراق أو أمير الحجاز أو أمير مكّة سواء كانوا مقيمين أو مسافرين أو رجلاً مأذونًا من جهتهم. (بدائع الصّنائع: ۱/۵۸۵، ط: بيروت)** اسی طرح **ملتقى الأبحر، كبيري**، اور **مبسوط** میں جہاں ''منیٰ'' میں حج کے دوران جواز جمعہ کی بات کہی گئی وہاں بھی اس شرط کا ذکر کیا گیا؛ اس لیے ان عبارات کی رو سے بھی عدم جواز ہی ثابت ہوتا ہے۔

نیز منیٰ میں جمعہ کے عدم جواز کی ایک اور وجہ یعنی ''استیطان دائم'' نہ ہونا بھی پائی جاتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اس زمانے میں چوں کہ ''منیٰ'' میں حکومت سعودیہ کی طرف سے جمعہ کا بند و بست نہیں ہوتا جو صحت جمعہ کے لیے شرط ہے، جیسا کہ کتب فقہ کے حوالے سے گزرا؛ اس لیے ایام حج میں قیام منیٰ کے دوران اگر جمعہ کا دن آ جائے تو حاجیوں پر جمعہ فرض نہیں ہے؛ لہٰذا ان کے لیے خیموں میں جمعہ قائم کرنا درست نہیں، ان پر ظہر ادا کرنا ضروری ہے۔ اس مسئلہ کی تائید وزیر **الشؤون الإسلامية والأوقاف والدّعوة والإرشاد** شیخ صالح بن عبدالعزیز بن محمد آل شیخ کے

جواب سے بھی ہوتی ہے۔ان کی تحریر منسلک ہے۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی غفرلہ، محمد اسد اللہ غفرلہ، محمد نعمان سیتا پوری عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

(۱) فضيلة المفتي الشّيخ : أبو القاسم النّعماني

رئيس الجامعة الإسلامية دارالعلوم/ ديوبند　　　وفقه اللّه

سلام عليكم و رحمة اللّه وبركاتهٗ ؛ أمّا بعد :

فأسأل اللّه تعالیٰ لكم التّوفيق والسّداد ، وإنّي لأشكر لكم تواصلكم العلمي وبحث هذه المسألة العلمية .

وقد وردني كتاب فضيلتكم رقم : ٢٣٣ المؤرخ في ١٤٣٥/٤/٢٣هـ بشأن ما أشرتم إليه من أنّ صلاة الجمعة لا تقام في (منى) أيّام الموسم ؛ رغم اتّساع العمران في البلد الحرام ، ومعقد المسألة على أن (منى) لم تتّصل بالعمران المتّسع في مكّة وأنّها وادٍ به مساكن الحجّاج ، وليس فيه سكان في غير وقت الحج ، وكما تعلمون فقد نصّ كثير من أهل العلم على اشتراط الاستيطان لإقامة صلاة الجمعة .

ولذا صدر في الموضوع فتوى من اللّجنة الدّائمة للبحوث العلمية والإفتاء بالمملكة العربية السّعودية – موجودة في موقع الرّئاسة العامّة للبحوث العلمية والإفتاء – حيث سئلت اللّجنة عن إمكانية إقامة صلاة الجمعة في المشاعر(منى ، مزدلفة ، عرفات) قبل اليوم الثّامن من ذي الحجّة، نظرًا إلى ارتباط العاملين فيها بأعمال تلزمهم بعدم ترك مقارّهم .

فأجابت اللّجنة بعد دراسة الاستفتاء : بأنّه لا تصحّ إقامة صلاة الجمعة في مساجد المشاعر ؛ لأنّ من شروط صحّتها الاستيطان الدّائم .

سائلًا اللّه عزّ وجلّ أن يرزقنا جميعًا العلم النّافع والعمل الصّالح ، وأن يوفّقكم لما فيه الخير ، وينفع بجهودكم .

والسّلام عليكم ورحمة اللّه وبركاتهٗ

أخوكم: وزير الشؤون الإسلامية والأوقاف والدّعوة والإرشاد

صالح بن عبد العزيز بن محمّد آل الشّيخ　　==

..............................................................................................................

== بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

حضرت مفتی شیخ ابوالقاسم نعمانی صاحب............دامت فیوضکم

مہتمم دارالعلوم دیوبند

السّلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاتہٗ

أما بعد!

میں اللہ رب العزت سے آپ کے لیے توفیق اور درستگیٔ احوال کی دعا کرتا ہوں، اور باہم علمی رابطہ اور اس علمی مسئلہ کی تحقیق پر آپ کا شکر گزار ہوں۔

آنجناب کا خط رقم: ۲۳۳، تاریخ ۲۳/۴/۱۴۳۵ھ کو موصول ہوا، جس میں آپ نے اشارہ فرمایا کہ ''مقدس شہر'' میں آبادی کے پھیلاؤ کے باوجود ایام حج کے دوران ''منیٰ'' میں جمعہ قائم نہیں ہوتا؟ بات یہ ہے کہ مسئلے کی بنیاد اس پر ہے کہ منیٰ، مکے کی وسیع آبادی سے متصل نہیں ہوا، وہ ایک وادی ہے جہاں حاجیوں کی قیام گاہیں ہیں، موسم حج کے بعد وہاں کوئی رہائش نہیں ہوتی، آنجناب اس بات سے واقف ہیں کہ بہت سے اہل علم حضرات نے یہ صراحت کی ہے کہ اقامت جمعہ کے لیے مستقل آبادی ہونا شرط ہے، اسی بنا پر اس موضوع پر سعودی عرب کے ''اللّجنة الدّائمة للبحوث العلمية والإفتاء'' کی طرف سے ایک فتویٰ صادر ہوا (یہ فتویٰ ''لجنة'' کی ویب سائٹ میں موجود ہے) جس میں ''لجنة'' سے یہ سوال کیا گیا کہ آٹھویں ذی الحجہ سے پہلے مشاعر یعنی منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں اقامتِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ وہاں بہت سے کارکنان ایسے لازمی کاموں میں لگے رہتے ہیں کہ ان کا اپنی جگہوں سے ہٹنا ممکن نہیں ہوتا تو ''لجنة'' نے استفتاء پر غور وخوض کرنے کے بعد یہ جواب دیا کہ ''مشاعر'' کی مسجدوں میں اقامتِ جمعہ صحیح نہیں ہے؛ اس لیے کہ اقامتِ جمعہ کی شرطوں میں سے ایک شرط ''دائمی آبادی'' کا پایا جانا بھی ہے (اور وہاں دائمی آبادی نہیں ہے)۔

اللہ رب العزت سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں علم نافع اور عمل صالح عطا فرمائے، اور آپ کو عمل خیر کی توفیق سے نوازے، اور آپ کی محنت وجد وجہد کو نفع بخش بنائے۔

والسّلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاتہٗ

صالح بن عبد العزيز بن محمّد آل الشّيخ

وزير الشؤون الإسلامية والأوقاف والدّعوة والإرشاد

۲۵/۵/۱۴۳۵ھ

## حاجی کا طوافِ زیارت کیے بغیر انتقال ہو جائے

**سوال:** ﴿۴۵﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

ہاجرہ اپنے شوہر عبداللہ کے ساتھ حج کے سفر پر گئی وہ عمرہ کرنے کے بعد منیٰ اور عرفات میں حاضری دے کر مزدلفہ پہونچی، وہاں جا کر وہ اتنی بیمار ہوئی کہ وہ کوما میں چلی گئی، اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی، اُن کو اسپتال میں داخل کیا گیا؛ مگر وہ ہوش میں نہیں آسکی، اُن کے شوہر نے اُن کی طرف سے کنکری ماری اور قربانی بھی کی؛ لیکن اُس کی بیوی ہاجرہ نہ تو طوافِ زیارت کر سکی اور نہ ہی طوافِ وداع کیا، اسی بے ہوشی کے عالم میں وہ ہندوستان اپنے گھر لائی گئی، یہاں کئی روز کے بعد افاقہ ہوا، کچھ ہوش ہوا، مگر بہت معمولی، دماغ اپنا کام صحیح نہیں کر رہا تھا یادداشت بھی معمولی واپس آئی اب اس کے بال قصر کیے گئے اس کے چند روز کے بعد ہاجرہ کا انتقال ہو گیا ہے۔

اب مرحومہ کے بارے میں ان کے گھر والوں کے لیے کیا حکم ہے؟

ہاجرہ مرحومہ کا حج ہوا یا نہیں؟ مفصل ومدلل جواب عنایت فرمائیں۔

والسلام

۴۵۹/ د ۱۴۳۶ھ

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التوفیق :**

طوافِ زیارت فوت ہونے کی صورت میں حکم شرعی یہ ہے کہ عمر بھر میں کبھی بھی اس کا ادا کرنا ضروری ہے، اگر تا عمر ادا نہیں کر سکا اور مرض الموت میں مبتلا ہو گیا، تو اس صورت میں ایک بدنہ یعنی اونٹ یا گائے حرم میں ذبح کرنے کی وصیت کرنا ضروری ہے (۱) اور یہی ''بدنہ'' طوافِ زیارت

(۱) ویمتدّ وقت صحّته إلی آخر العمر ......... ولو مات قبل فعله قالوا: یجب علیه الوصیة ببدنة؛ لأنّه جاء العذر من قبل مَن له الحقّ وإن کان آثمًا بالتّأخیر تأمّل.

(غنیة النّاسك، ص:۲۳۰، باب طواف الزّیارة)

اور طوافِ وداع کی طرف سے کافی ہوجائے گا(۱) اور حج تمام ہوجائے گا؛ البتہ تاخیر کی وجہ سے گناہ ہوگا؛ لیکن اگر بغیر وصیت کیے اس کا انتقال ہوجائے اور ورثا اپنی طرف سے بہ طور تبرع بدنہ حرم میں قربانی کرادیں، تو امید ہے کہ ذمہ فارغ ہوجائے۔ ففي الدّرّ مع الرّدّ: ويمتدّ وقته إلى آخر العمر، قال الشّامي: أي وقت صحّته إلى آخر العمر، فلومات قبل فعله ...... أنّهم قالوا: إنّ عليه الوصيّة ببدنة؛لأنّه جاء العذرمن قِبَلِ من له الحقّ وإن كان آثمًا بالتّأخير (۲)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر مرحومہ نے وفات سے پہلے بدنہ قربانی کرنے کی وصیت کی ہو، تو وصیت کے مطابق مرحومہ کے ثلث مال سے حرم میں بدنہ کی قربانی کرانا ضروری ہے، اور اگر مرحومہ نے کوئی وصیت نہیں کی ہے اور ورثا اپنی طرف سے حرم میں بدنہ کی قربانی کرادیں تو امید ہے کہ قبول ہوجائے گی —— وصیت نہ کرنے کی صورت میں ورثا پر واجب نہیں ہے؛ لیکن اگر کرائیں تو اپنی ذاتی رقم سے کرائیں یا ترکہ کی رقم سے اگر سب ورثا بالغ ہوں اور وہ اجازت دے دیں(۳)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۰/۵/۱۴۳۶ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## عقدِ استصناع میں مشتری کے ذمے واجب الاداء رقم پر زکاۃ کا حکم

**سوال:** ﴿۴۶﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

---

(۱) یعنی یہ بدنہ تو طوافِ زیارت کی طرف سے ہوگا اور طوافِ وداع، وقوفِ مزدلفہ اور دیگر واجبات کے ترک پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ ولا شيء عليه لغير طواف الزّيارة من الوقوف بمزدلفة و رمي الجمار والسّعي؛ لأنّ واجبات الحجّ تسقط بالعذر .

(۲) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۵۳۸/۳.

(۳) وهٰكذا في زبدة المناسك ، ص: ۲۰۳، ط: أشرفية ممبئي .

(الف): ہم نے چار سال کے معاہدہ پر ایک فلیٹ بک کیا ہے، پچاس فیصد رقم کی ادائیگی کردی گئی ہے، اور بقیہ رقم ان شاء اللہ اگلے چار سالوں میں قسطوں میں ادا کردی جائے گی، ہم نے اس کے لیے بینک سے لون نہیں لیا ہے، لیکن معاہدہ کے حساب سے کسی بھی حالت میں قبضہ ملنے تک ہم یہ فلیٹ کسی کو بیچ سکتے ہیں نہ ہی کسی اور کو ٹرانسفر کرسکتے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا بقیہ پچاس فیصد رقم ہمارے اوپر قرض سمجھا جائے گا؟ پچاس فیصد رقم ادا کرنے کے بعد ہمارے پاس کچھ پیسے ہیں (زیورات اور نقد) جس سے ہم صاحبِ نصاب بنتے ہیں، کیا ہمیں اس پر زکاۃ دینی ہوگی یا نہیں؟ کیوں کہ ہم نے سنا ہے کہ جب آپ کے اوپر قرض ہو تو زکاۃ نہیں دینی۔ واللہ اعلم

(ب): ہم نے اپنے دوست کو کچھ رقم اُدھار دی ہے اور واپس ہونے کی امید بھی ہے۔ اس صورت میں اس رقم کی زکاۃ کس کے ذمہ ہوگی؟ جو استعمال کررہا ہے اس کے یا جس نے بغیر سود کے قرض دی ہے اس کے؟ فقط واللہ تعالیٰ اعلم　　(۹/د۱۴۳۲ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التّوفیق:

(الف): اگر فلیٹ کی خریداری کا معاملہ مکمل ہوچکا اور آپ نے پچاس فیصد رقم ادا بھی کردی؛ البتہ مکمل مالکانہ حقوق معاہدہ کے تحت بقیہ رقم ادا کرنے کے بعد حاصل ہوں گے تو ایسی صورت میں آپ بقیہ پچاس فیصد رقم کے مقروض ہوئے،(۱) اور صاحبِ نصاب کے پاس موجود مالیت میں سے

(۱) یستفاد من النّصوص الفقهيّة التّالية:

(الف) وأمّا معناه (الاستصناع) فقد اختلف المشائخ فيه، قال بعضهم: هو مواعدة وليس ببيع، وقال بعضهم: هو بيع لكن للمشتري فيه خيار، وهو الصّحيح إلخ.

(بدائع الصّنائع: ۹۳/۴)

(ب) والصّحيح من المذهب جوازه بيعًا إلخ. (البحر الرّائق: ٢٨٤/٦)

(ج) وأمّا حكم الاستصناع فهو ثبوت الملك للمستصنع في العين المبيعة في الذّمّة وثبوت الملك للصّانع في الثّمن ملكًا غير لازم.　　(بدائع الصّنائع: ٩٥/٤)

پورا قرض منہا کرنے کے بعد بقیہ رقم (سونے چاندی) پر زکاۃ واجب ہوتی ہے، البتہ اگر قرض طویل المیعادی ہے ہر سال قسطوں میں اسے ادا کرنا ہے تو صرف ایک سال کی قسط کے بہ قدر منہا کیا جائے گا اور صورتِ مسئولہ میں چوں کہ قرض اسی نوعیت کا ہے؛ اس لیے ایک سال کی قسط کے برابر (۱) منہا کرنے کے بعد اگر (سونے چاندی وغیرہ) کی قیمت بہ قدرِ نصاب زائد بچتی ہے تو اس پر زکاۃ ہے، ورنہ نہیں۔

(ب): آپ کے ذمہ اس کی زکاۃ واجب ہوگی، حدیث میں ہے: قرض دینے پر اٹھارہ گنا ثواب ملتا ہے، اور صدقہ کرنے میں دس گنا ثواب ملتا ہے (۲) اور قرض میں وعدہ کے وقت تک مہلت دینے میں ہر روز اتنے روپئے صدقہ کرنے کا ثواب ملتا ہے، اور ادائیگی کے لیے اگر مزید مہلت دی جاتی ہے تو ہر روز اتنی رقم (قرض میں دی ہوئی رقم) سے دوگنی رقم صدقہ کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے (۳)

اس سے معلوم ہوا کہ قرض دینے پر اخروی اعتبار سے آپ کو بے شمار اجر وثواب حاصل ہوگا؛ لیکن دنیاوی اعتبار سے چوں کہ اس رقم کے مالک آپ ہی ہیں؛ اس لیے زکاۃ آپ پر ہی واجب ہوگی۔ (۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

(۱) ومنها (شروطِ وجوب الزّكاة) الفراغ عن الدّين، قال أصحابنا: كلّ دين له مطالب من جهة العباد يمنع وجوب الزّكاة ...... كالقرض وثمن المبيع وضمان المتلفات وأرش الجراحة. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۲)

(۲) رأيت ليلةً أسري بي على باب الجنّة مكتوبًا: "الصّدقة بعشر أمثالها والقرض بثمانية عشر". (ابن ماجة، رقم: ۲٤۳۱، باب: القرض، والتّرغيب والتّرهيب، رقم: ۱۳۳۰)

(۳) عن بريدة الأسلمي عن النّبيّ صلّى الله عليه وسلّم قال: من أنظر معسرًا كان له بكلّ يوم صدقة، ومن أنظره بعد حلّه كان له في كلّ يوم صدقة.

(ابن ماجة، رقم: ۲٤۱۸، باب إنظار المعسر)

(۴) فتجب زكاتها (الدّيون) إذا تمّ نصابًا وحال الحول لكن لا فورًا؛ بل عند قبض أربعين درهمًا من الدّين القويّ كقرض إلخ.

(الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۳/۲۳٦-۲۳۷، باب: زكاة المال)

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفی عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری، فخر الاسلام عفی عنہ،

مفتیان دارالعلوم دیوبند

# تجارتی فلیٹ کو عارضی طور پر اجارے پر دینے کی صورت میں ادائیگیٔ زکات کا حکم

محترم ومکرم حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

**سوال:** ﴿۴۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین درج ذیل مسئلہ میں:

اگر تجارت کی نیت سے خریدے ہوئے فلیٹ کو تجارت کی نیت برقرار رکھے ہوئے کرایہ پر دے تو قمری سال کے ختم پر مالیت فلیٹ اور کرایہ دونوں پر زکاۃ ہوگی، یا صرف کرایہ کی آمدنی ہی پر؟ اس کے شرائط کی رعایت کے ساتھ زکاۃ لازم ہوگی۔

ذیل میں ذکر کردہ تین کتب کی عبارت سے مستفاد ہوتا ہے کہ مالیت فلیٹ کی زکاۃ ساقط ہوجائے گی نیز اسی طرح ''کتاب المسائل'' میں بھی مذکور ہے؛ چنانچہ اگر حکم یہی ہے تو تصدیق فرمائیں۔ ورنہ حسب ذیل عبارت کی مراد کی وضاحت فرمائیں۔

**ولـو اشتـرى الرّجل دارًا أو عبدًا للتّجارة ثمّ اٰجره يخرج من أن يكون للتّجارة لأنّه لما اٰجره فقد قصد المنفعة . (خانية:۱/ ۲۵۱)**

**ولـو اشتـرى جـاريةً أو عبدًا للتّجارة فاٰجره يخرج من أن يكون للتّجارة و كذا في الدّار لو اٰجرها . (خلاصة الفتاوٰى:۱/ ۲۴۰)**

**(٤٠٠٨) وفـي الـكبـرى إذا اشترى دارًا أو عبدًا للتّجارة فاٰجره خرج من أن**

يكون للتّجارة ، لأنّه لما أجره فقد قصد الغلّة . فخرج عن حكم التّجارة .

(الفتاویٰ التّاتار خانية: ۳/ ۱٦۷)

المستفتي: یوسف ایلولوی

۱۲۷۸/ ۱۴۳۴ھ

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب و باللّٰه التّوفيق :

اگر تجارت کی نیت سے کوئی فلیٹ خریدا، پھر مالک نے اسے عارضی طور پر محدود وقت کے لیے کرایہ پر دے دیا، جب کہ فروخت کرنے کی نیت برقرار ہے، تو ایسی صورت میں وہ فلیٹ مالِ تجارت ہونے سے نہیں نکلے گا؛ بلکہ بدستور مالِ تجارت باقی رہے گا اور ہر سال اس کی موجودہ قیمت (مارکیٹ ویلو) کے اعتبار سے زکاۃ لازم ہوگی۔ شامی میں خانیہ کا درج ذیل جزئیہ اس باب میں تقریباً صریح ہے...... عبد التّجارة إذا أراد أن يستخدمه سنتين فاستخدمه فهو للتّجارة علىٰ حالهٖ إلاّ أن ينوي أن يخرجه من التّجارة ويجعله للخدمة .(۱) اس عبارت میں محدود مدت، یعنی دو سال فائدہ اٹھانے کو اعراض من التجارۃ نہیں قرار دیا گیا، رہی آپ کی پیش کردہ عربی عبارات تو ان میں یہ ذکر نہیں ہے کہ اجارے پر دیتے وقت، مالک کی، تجارت کی نیت باقی تھی؛ اس لیے ان عبارتوں کا محمل یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالک نے اجارے پر دے کر ہی نفع کمانے کی نیت کر لی، جس سے تجارت کی نیت ختم ہوگئی؛ کیوں کہ علی الاطلاق اجارے پر دے کر نفع کمانے کی نیت کرنا گویا دلالۃً نیتِ تجارت سے اعراض کرنا ہے، جیسا کہ خانیہ کے ذکر کردہ جزئیہ کے آخری جز: إلاّ أن ينوي أن يخرجه من التّجارة ويجعله للخدمة سے مستنبط ہوتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۸/۱۱/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام غفرلہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

(۱) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۳/ ۱۹۲، قبل باب السّائمة .

## بلڈرز زیرِ تعمیر مکانات کی زکات کس طرح ادا کرے؟

**سوال:** ﴿۴۸﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں؟

ہم بلڈنگ بنانے کے لیے زمین خریدتے ہیں، لیکن اس پر بلڈنگ بنانا شروع کرنے میں کئی سال کا عرصہ لگ جاتا ہے؛ کیوں کہ کچھ گورنمنٹ کی پابندیاں ہوتی ہیں یا اُن کے کچھ قوانین ہوتے ہیں اور ان کی NOC وغیرہ لینے میں کافی وقت لگ جاتا ہے، اس لیے کام کتنے دنوں میں شروع ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہوجاتا ہے، اس عرصہ میں اگر گورنمنٹ نے اس زمین پر کوئی ریزرویشن اپنی ضرورت کے حساب سے ڈال دیا جیسے گارڈن، لائبریری، ہسپتال، بس ڈپو یا اسکول وغیرہ کا تو اس زمین پر بلڈنگ کبھی بھی نہیں بن پائے گی، سو جس نیت سے اس نے زمین خریدی تھی وہ اس کو پورا نہیں کرسکتا، گویا بلڈنگ کا کام شروع ہونا ایک غیر یقینی عمل ہے۔

اور جب بلڈنگ بنانے کی اجازت ملتے ملتے دس بارہ سال لگ جاتے ہیں، پھر اس کا پلان پاس کرایا جاتا ہے۔ ممبئی کے ضابطے کے مطابق اگر دس ہزار مربع فٹ کا پلاٹ ہے تو اس میں سے کچھ حصہ گارڈن اور راستے میں کٹ جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس پر کبھی دوگنا سے چار گنا تک فلیٹ یا دکانیں بنانے کا پرمیشن ملتا ہے، یعنی دس ہزار مربع فٹ پلاٹ پر بیس ہزار سے چالیس ہزار مربع فٹ ایریا تک فلیٹ اور دکانیں بنتی ہیں، اور جو ایریا فلیٹ یا دکان والوں کو بیچا جاتا ہے وہ بلڈ اَپ ایریا ہوتی ہے، جو اصل کا تقریباً ڈیڑھ گنا ہوتی ہے، اس طرح سے دس ہزار مربع فٹ پر تقریباً ساٹھ ہزار مربع فٹ ایریا کے فلیٹ اور دکانیں بنتی ہیں، جب کوئی فلیٹ یا دکان خریدتا ہے تو اس کو اتنی بلڈ اَپ ایریا کا فلیٹ دے کر اتنی بلڈ اَپ ایریا کا پیسہ لیا جاتا ہے، اس فلیٹ یا دکان کے خریدار کو اس زمین کا کوئی مخصوص حصہ نہ بیچا جاتا ہے اور نہ اس کا کوئی تذکرہ ہوتا ہے۔ فلیٹ کا خریدار اس زمین کا مالک کبھی نہیں ہوتا، اگر کبھی وہ اپنے حصہ کی زمین بیچنا چاہے تو نہیں بیچ سکتا، جب تمام فلیٹ اور دکانیں

بک جاتی ہیں تب تمام فلیٹ اور دکان کے مالکوں کی ایک سوسائٹی بنائی جاتی ہے، اور یہ تمام خریدار اس سوسائٹی کے صرف ممبر ہوتے ہیں۔ تمام فلیٹ بکنے کے بعد سوسائٹی کے نام اس زمین کا بیع نامہ ہوتا ہے اور سوسائٹی اس زمین کی مالک ہوتی ہے۔ جب کوئی فلیٹ کا مالک اپنا فلیٹ بیچنا چاہے گا تو وہ صرف فلیٹ بیچ سکتا ہے، زمین نہیں بیچ سکتا، اور جب نیا خریدار آئے گا تو اس کی ممبر شب اور شیئر سرٹیفکٹ اُس نئے خریدار کے نام ٹرانسفر ہو جائے گی۔

زمین بہ ذاتِ خود کیوں کہ تجارت کے لیے نہیں لی گئی تھی، بلکہ بلڈنگ بنا کر بیچنے کے لیے لی گئی تھی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے لوگ دکان خرید کر اس میں مال تجارت رکھ کر فروخت کرتے ہیں۔ لیکن دکان کا مال تجارت، خریدنے کے دن سے ہی بیچا جا سکتا ہے اور دکان بھی جب چاہے بیچ سکتا ہے، اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ جب کہ زمین پر چوں کہ فلیٹ اور دکانیں بنا کر بیچنے کے لیے خریدی گئی اور اوپر بتائی ہوئی دشواریوں کی وجہ سے کئی سال تک بلڈنگ نہیں بنائی جا سکتی اور کئی سالوں تک فلیٹ اور دکانوں کی تجارت نہیں کی جا سکتی۔

سوال نمبر {۱}: اس صورت میں یہ زمین مالِ تجارت کے حکم میں کب آئے گی؟ جب زمین خریدی گئی اس وقت، یا جب بلڈنگ بننا شروع ہوئی اس وقت، یا جب فلیٹ اور دکانیں بن کر تیار ہو گئیں اس وقت؟

کیا یہ زمین جب تک فلیٹ اور دکانیں بن کر فروخت کے لیے تیار نہیں ہو جاتی اس کی حیثیت دکان کی حیثیت کی نہیں ہے۔ تفصیلی جواب تحریر فرمائیں؟

سوال نمبر {۲}: مالِ تجارت کیا ہے؟

ایک آدمی نے اینٹ بنانے کے لیے دس ہزار میں سوٹرک مٹی خریدی اور اس مٹی یا ریت کو منتقل کرنے کا خرچہ 50 ہزار آیا۔ اب اس کی کل لاگت 60 ہزار روپے ہوگئی، لیکن کسی وجہ سے وہ اینٹ بنانے کا کام نہ کر سکا اور اس کا پروگرام ختم ہو گیا، اب وہ مٹی یا ریت جو ساٹھ ہزار کی خریدی گئی تھی وہ مالِ تجارت رہی یا نہیں؟ اور اس پر زکات آئے گی؟ کیوں کہ وہ مٹی اب اس کے کچھ کام کی نہیں رہ گئی۔

والسلام

**المستفتي:** مہتاب لئیق شیخ

۱۴، بلقیس اپارٹمنٹ

مہا کالی روڈ، اندھیری ایسٹ۔ممبئی نمبر: 93

(۱۴۳۴/۴۱۳ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

{۱}: فقہاء نے یہ صراحت کی ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی چیز اپنے ذاتی استعمال کے لیے نہیں خریدی ہے؛ بل کہ تجارت کے لیے خریدی ہے تو وہ چیز مالِ نامی میں داخل ہو جاتی ہے اور حسبِ ضابطہ اس پر زکات لازم ہو جاتی ہے، تجارت عام ہے چاہے بعینہٖ خرید کردہ چیز آگے فروخت کرنے کی نیت ہو جیسے عام دکانوں میں ہوتا ہے یا بعینہٖ وہ چیز آگے فروخت کرنے کی نیت نہ ہو؛ بل کہ اس سے یا اس پر کوئی چیز تیار کر کے فروخت کرنے کی نیت ہو، جیسے مِلوں کے خام مال (مثلاً: ٹکسٹائل مل کے لیے روئی) **منها كونُ المالِ ناميًا؛ لإنّ معنَى الزّكاةِ وهو النّماءُ لا تحصلُ إلّامن المالِ النّامي ...... وإنّما نَعنِي بهٖ كونَ المالِ مُعَدًّا للاستنماءِ بالتّجارةِ أو بالإسامةِ. (بدائع الصّنائع : ۹۱/۲، ط: زکریا دیوبند)** اور صورتِ مذکورہ میں بلڈر جو زمین خریدتا ہے وہ ذاتی استعمال کے لیے نہیں خریدتا؛ بل کہ تجارت کی نیت سے خریدتا ہے، اور یہ کہنا کہ زمین فروخت نہیں کرتا، صرف دکانیں اور فلیٹ فروخت کرتا ہے، صحیح نہیں؛ اس لیے کہ دکان اور فلیٹ کے ضمن میں زمین بھی فروخت ہوتی ہے البتہ وہ مشاع اور مشترک ہوتی ہے؛ زمین کے بغیر فلیٹ کا وجود ہی ممکن نہیں؛ اسی لیے تمام فلیٹس اور دُکانیں فروخت ہونے کے بعد زمین مذکور فلیٹس اور دُکانیں خریدنے والوں کے نام منتقل ہو جاتی ہے، بلڈر کے مِلک میں نہیں رہتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ صورتِ مسئولہ میں جس وقت بلڈر نے زمین خریدی اور اس میں بلڈر کی ملکیت مکمل ہوگئی کہ اگر وہ آگے فروخت کرنا چاہے تو آگے فروخت کرسکتا ہے، اسی وقت سے وہ مالِ تجارت سمجھی جائے گی، ہر سال اس کی قیمت کا تخمینہ لگا کر ادائیگی زکات شرعاً ضروری ہے

تعمیر بلڈنگ میں تاخیر ہونا یا اس کا غیر یقینی ہونا استفتاء میں مذکور زمین کے مالِ تجارت ہونے میں مانع نہ بنے گا؛ اس لیے کہ تعمیر بلڈنگ اگر چہ غیر یقینی ہے؛ لیکن زمین تو فروخت کر سکتا ہے اور ابتداءً یہی نیت ہوتی ہوگی کہ اگر پرمیشن برائے تعمیر بلڈنگ نہ ملی تو زمین ہی فروخت ہو جائے گی۔

پس مذکورہ زمین ابتدائے خرید اور اس کی مکمل ملکیت حاصل ہونے کے بعد سے ہی مالِ تجارت شمار ہوگی۔

{۲}: زکات کے باب میں مالِ تجارت سے مراد وہ مال ہے جو عقدِ معاوضہ کے ذریعے کسی کے ملک میں آئے اور بہ وقتِ عقد مالک اُس کے ذریعے تجارت کی نیت کرے، اگر چہ بعینہٖ اُسے فروخت کرنے کے ذریعے یا اس سے کوئی چیز تیار کر کے بیچنے کے ذریعے بہ شرطے کہ اصل کا اثر تیار کردہ چیز میں ظاہر ہو۔ **في البدائع: إنّما نَعنِي به (النّماء) كونَ المالِ مُعَدًّا للاستنماءِ بالتّجارةِ إلخ (۲/ ۹۱) وفيه: إن كان شيئًا يبقى أثره في المعمول فيه كالصّبغ والزّعفران؛............ فإنّه يكون مال التّجارة(۲/ ۹۵، ط:زكريا ديوبند)**؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جب مٹی، اینٹ بنا کر فروخت کرنے کے لیے خریدی گئی اور مٹی کا اثر اینٹ میں ظاہر ہونا بالکل واضح ہے؛ اس لیے جب اس نیت سے مٹی خریدی اس وقت سے مالِ تجارت بن گئی، سال گذرنے پر موجودہ بازاری قیمت کے اعتبار سے ادائیگئ زکات ضروری ہے، ہاں جب کسی وجہ سے پلان فیل ہو گیا اور وہ مٹی کسی کام کی نہ رہی، بے قیمت ہوگئی، تو گویا کہ وہ مال ضائع ہو گیا، اب اس پر زکات واجب نہ ہوگی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کسی نے برائے تجارت پھل مثلاً سنگترا خریدا؛ لیکن کچھ دنوں کے بعد فروخت سے پہلے وہ سڑ گیا تو سڑنے سے پہلے تک تو وہ بلا شبہ مالِ تجارت رہا، البتہ سڑنے کے بعد نہ رہے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۳/۲/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

**(۱) وما اشتراه لها أي للتّجارة كان لها لمقارنة النّيّة لعقد التّجارة .**

**(الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۳/۱۹۳)**

# شیئرز کی زکات کس طرح ادا کی جائے؟

**سوال:** ﴿۴۹﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟
میں ہر سال یکم/اپریل کو زکاۃ ادا کرتا ہوں۔ میں ایکوٹی شیئر (مارکیٹ اور بائع کی قیمت میں فرق کے ساتھ) کی تجارت کرتا ہوں، سوال یہ ہے کہ کیا مجھے یکم اپریل کو تمام شیئرز پر زکاۃ ادا کرنی ہوگی؟ (جس دن میں زکاۃ کا حساب لگاتا ہوں)؟ یا یکم اپریل تک جو منافع حاصل ہوئے ہوں گے اس پر زکات دینی ہوگی؟ براہِ کرم اس بارے میں وضاحت فرمائیں۔ (۴۸۱/۱۴۳۲ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

شیئرز اگر اس مقصد سے خریدے جائیں کہ اسے فروخت کر کے نفع حاصل کیا جائے، گویا کیپٹل گین مقصود ہو، اس شیئرز کا سالانہ نفع مقصود نہ ہو، تو اس صورت میں تمام شیئرز کی زکات مارکیٹ کی قیمت کے حساب سے آپ پر واجب ہوگی۔ (۱) اور اگر خریدتے وقت اس کا مقصد کیپٹل گین (Capital Gain) نہ ہو؛ بلکہ اس کا سالانہ منافع حاصل کرنا مقصود ہو، تو اس صورت میں زکات شیئرز کی مارکیٹ قیمت کے اس حصے پر ہوگی جو قابلِ زکات اثاثوں کے مقابل ہو، یعنی خام مال تیار مال اور نقد روپیہ کے مقابلے میں، اور جو حصہ بلڈنگ اور مشینری کے مقابل ہو، اس پر زکات واجب نہیں ہے۔ (۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

اگر تحقیق نہ ہو سکے تو احتیاطاً کل رقم کی زکات ادا کر دے، اور یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ زکات کا حساب چاند کے مہینے سے کرنا چاہیے۔

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳/۳/۱۴۳۲ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ
مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

(۱) ...... أو في عرض تجارة قيمته نصاب من ذهب أو ورق مقوّمًا ربع عشر .
(الدّرّ مع الرّدّ: ۲۲۸/۳)

(۲) ولا في ثياب البدن وأثاث المنزل و دور السّكنىٰ ونحوها ............ وكذلك آلات المحترفين . (الدّرّ مع الرّدّ: ۱۸۲/۳-۱۸۳)

# اموالِ زکات کی تملیک کے طریقے اور
# اُن کے مصارف سے متعلق احکام

گرامی قدر حضرات مفتیان کرام　　　دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

**سوال:** ﴿۵۰﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

مدارس میں اموالِ زکاۃ کے استعمال میں جو غ ـ ر بود ہو رہا ہے وہ واضح ہے، بالخصوص رمضان المبارک کے موقع پر مدارس والے مالِ زکاۃ وصول کرتے ہیں، البتہ اس کے صرف کرنے کے سلسلہ میں بے احتیاطی برتتے ہیں، اکثر بغیر تملیک کے مالِ زکاۃ تنخواہ بابت استعمال کرتے ہیں، اس مسئلہ کی وضاحت کے واسطے مندرجہ ذیل استفتاء کیا جارہا ہے، برائے کرم مع دلائل وحوالہ ان کی تصریح کر دی جائیں۔نوازش ہوگی۔

مسئلہ نمبر:(۱) زکاۃ کا مال یا رقوم وصولی کے بعد بہ ذریعہ تملیک استعمال کرنے کا عام رواج ہے، تملیک کی چند مروّجہ شکلیں درج ذیل ہیں، اُن کے بارے میں شرع کا کیا حکم ہے؟

(الف) کسی مستحق زکاۃ کو بلا کر زکاۃ کے رقوم اس کو دے دیا گیا، اس کو معلوم ہے کہ یہ رقوم زکاۃ کی ہیں اور مجھے واپس بھی کرنا ہے، لہٰذا وہ اپنے علم کے مطابق یہ رقوم معطی کو واپس کر دیتا ہے۔

(ب) کسی مستحق زکاۃ کو مال زکاۃ کی تملیک کا مسئلہ بتا کر اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ میں آپ کو زکاۃ کے رقوم دوں گا، آپ اگر چاہیں تو اس کو اپنے کام میں لگا سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو کسی دینی کام مثلاً مدرسہ، مکتب وغیرہ میں استعمال کے لیے میرے حوالہ کر سکتے ہیں۔اس صورت میں پوری رقم صدقہ کرنے کا ثواب آپ کو ملے گا۔

پھر دوسری مجلس میں اس شخص کو زکاۃ کا مال یہ کہہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ زکاۃ کا مال ہے، اسے لے جاؤ، البتہ دینے والے کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص مجھے زکاۃ کا مال واپس کر دے گا اور لینے والا

بھی دل میں سوچتا ہے کہ مجھے بھی یہ واپس کر دینا چاہیے، لیکن زبان سے کوئی کسی کو کچھ نہیں کہتا۔

(ج) کسی غریب کو زکاۃ کے رقوم دے دیا گیا، پھر اس شخص سے یہ رقوم مدرسہ میں چندہ لے لیا گیا اور غریب شخص کو کچھ رقوم دے دیا گیا۔

(د) مدارس میں زیرِ تعلیم بچوں کے لیے ماہانہ فیس مقرر کر دی جائے، پھر زکاۃ کے رقوم سے اُن کی طرف سے فیس ادا کر دی جائے۔

مسئلہ نمبر: (۲) اکثر مدارس میں اساتذہ کو مکمل تنخواہ نہیں ملتی، اساتذہ رمضان المبارک یا دیگر اوقات میں اموالِ زکاۃ وصول کرتے ہیں، اپنی ضرورت اور بقیہ تنخواہ بابت اموالِ زکاۃ براہِ راست خرچ کرتے ہیں، اُن کا یہ خرچ کرنا کیسا ہے؟

(نوٹ) ایسے حالات میں اساتذہ کے لیے مالِ زکاۃ خرچ کرنے کی کوئی بھی جائز صورت ہو تو اس کی تصریح فرمادیں۔

مسئلہ نمبر: (۳) مدرسہ کے مہتمم صاحب زکاۃ کھانے کے مستحق طلبہ کی طرف سے وکیل بن سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر وکیل بن سکتے ہیں تو اُن کی یہ وکالت تملیک کے لیے کافی ہے یا نہیں؟

مسئلہ نمبر: (۴) سفراء مدارس مدرسہ کے مہتمم صاحب کی طرف سے وکیل بن سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر وکیل بننے کی گنجائش ہے تو اُن کی یہ وکالت تملیک کے لیے کافی ہے یا نہیں؟

مسئلہ نمبر: (۵) مدرسہ کے لیے وصول شدہ اموالِ زکاۃ اسی مدرسہ کے متعلقہ مصرف زکاۃ استاذ صاحب اپنی ذاتی حوائج میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟

مسئلہ نمبر: (۶) حیلۂ تملیک کی ضرورت کے وقت کس حد تک گنجائش ہے؟ برائے کرم مفصلاً بیان فرمادیں۔

مسئلہ نمبر: (۷) مدارس کی تعمیرات خواہ دارالاقامہ یا درسگاہ یا مہمان خانہ یا گیٹ وغیرہ ضرورت کی حد میں شامل ہے یا نہیں؟

(۳۹۶/د ۱۴۳۶ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

مسئلہ نمبر:(۱)......(الف) اس صورت میں ''تملیکِ شرعی'' کا تحقق نہیں ہوا؛ اس لیے کہ جس شخص کو یہ رقم دی جا رہی ہے، وہ اس رقم میں حسبِ منشاء تصرف کرنے کا مختار نہیں ہوتا، جب کہ تملیکِ شرعی کے لیے اس طرح مالک بنا دینا ضروری ہے کہ جس شخص کو زکاۃ کی رقم دی گئی وہ اس میں حسبِ منشاء تصرف کر سکے، **هِيَ – الزّكاة – تَمليكُ جزء مال عيّنه الشّارع مِن مسلمٍ فقيرٍ غيرِ هاشميٍّ ولاَ مَولاهُ مع قَطْعِ المَنْفعَةِ عنِ المُمَلِّكِ مِن كُلِّ وَجْهٍ.** (۱)

(ب) واپس کرنے والا شخص اگر اس رقم کو استعمال کرنے میں اپنے آپ کو مالک و مختار سمجھتا ہے، پھر کسی دباؤ کے بغیر اپنی مرضی سے مدرسہ میں دے دیتا ہے، تو یہ طریقہ درست ہے ورنہ نہیں۔ **والحيلةُ في الجوازِ في هذهِ الأربعة أن يتصدّقَ بمقدارِ زَكَاتِهِ عَلىٰ فَقيرٍ ثُمّ يَأْمُرَهُ بَعد ذلكَ بِالصّرْفِ إلىٰ هذهِ الوُجُوهِ، فَيَكُونُ لِصاحبِ المالِ ثَوابُ الزَّكاةِ ولِلفَقيرِ ثَوابُ هٰذهِ الْقُرب.** (۲)

(ج) ''چندہ لے لیا گیا'' مبہم تعبیر ہے، اس کی وضاحت ضروری تھی، بہر حال اگر یہ صورت ہے کہ ایک غریب آدمی کو زکاۃ کی رقم پورے طور پر مالک بنا کر دے دی جاتی ہے، پھر یہ شخص کچھ رقم اپنے پاس رکھ کر مابقیہ مدرسہ میں بہ طور چندہ دے دیتا ہے، تب اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اگر مراد یہ ہے کہ وہ شخص مالک بننے کے بعد پوری رقم مدرسہ کے حوالہ کر دیتا ہے، پھر ذمے داران مدرسہ کچھ رقم اس غریب کو دے دیتے ہیں، تو ذمے داران کا اس طرح رقم دینا درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ ذمے داران مدرسے کے امین ہوتے ہیں، ان کے لیے ضروریاتِ مدرسہ کے علاوہ دیگر امور میں مدرسے کا مال خرچ کرنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ اس صورت میں تو رشوت کا بھی شائبہ ہے جس کا جائز نہ ہونا واضح ہے۔ **مراعاة غرض الواقفين واجبة.** (۳)

---

(۱) تنوير الأبصار مع الدّرّ المختار: ۱۷۳/۳ .

(۲) البحر الرّائق: ۲/ ٤٢٤، باب المصرف .

(۳) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ٦/ ٦٦٥، مطلب : مراعاة غرض الواقفين واجبة .

(نوٹ) ان تمام صورتوں میں معطین کی طرف سے صراحۃً یا دلالۃً اجازت کے بغیر طلبہ کے علاوہ کسی اور شخص کو رقم دے کر تملیک کرانا شرعًا جائز نہ ہوگا؛ اس لیے کہ مدرسہ میں زکاۃ، صدقات وغیرہ دینے والوں کا منشاء طلبہ پر خرچ کرنا ہوتا ہے نہ کہ غیر متعلقہ شخص پر، اور ذمے داران پر منشاء معطین کی رعایت ضروری ہے...... **الْوَكِيلُ إنّما يَستَفيدُ التَّصرُّفَ مِنَ الْمُوَكِّلِ وقَد أَمَرَهُ بِالدَّفْعِ إلٰى فُلانٍ ، فَلا يَمْلِكُ الدَّفْعَ إلٰى غَيرِه.** (١)

(د) یہ شکل سب سے بہتر ہے کہ مدرسے کا جتنا ماہانہ خرچ بہ شمول مطبخ، تعلیم، تنخواہ مدرسین وغیرہ آتا ہو، اس کو طلبہ پر تقسیم کر کے جو حاصل آئے اُس رقم کو ہر طالب علم پر بہ طور فیس مقرر کر دیا جائے اور ہر مہینہ فیس کے بہ قدر رقم طالب علم کو دے کر اس سے بہ مد فیس وصول کر لیا جائے ـــــــ ہر مہینہ کے بجائے سالانہ فیس کی شکل میں پورے سال کی فیس یکمشت بھی طالب علم کو دے کر اس سے واپس لی جا سکتی ہے؛ لیکن اس صورت میں اگر یہ وضاحت کر دی جائے تو بہتر ہے کہ اس مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کی سالانہ فیس اتنی رقم ہے، خواہ طالب علم پورے سال پڑھے یا بیچ میں چھوڑ کر چلا جائے۔

مسئلہ نمبر: (٢) اساتذہ یا ملازمین کا زکاۃ اور صدقاتِ واجبہ کی رقم براہِ راست تنخواہ میں وضع کر لینا درست نہیں ہے، اس طرح کی رقومات کے حق دار مستحقِ زکاۃ نادار طلبہ ہیں، اُنہیں بہ طور ملک دے دینا ضروری ہے، تنخواہ کی ادائیگی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وصول کنندگان پوری رقم مدرسہ میں جمع کر دیں، پھر ذمے داران مدرسہ طلبہ کو بہ مد وظیفہ دے کر بہ طور فیس مدرسے کے فنڈ میں جمع کرا لیں پھر اُس میں سے اساتذہ کو حسبِ ضابطہ بہ طور تنخواہ رقم دے دی جائے۔

مسئلہ نمبر: (٣-٤) اس سلسلے میں محتاط قول یہ ہے کہ مدرسے کے مہتممین (اور اُن کے واسطے سے) مدرسہ کے نمائندہ سفراء معطین کے وکیل ہیں اور معطین کا منشاء نادار طلبہ پر زکاۃ وغیرہ خرچ کرنا ہے؛ لہٰذا جب تک یہ رقومات طلبہ پر خرچ نہ کی جائیں، ''تملیکِ شرعی'' کا تحقق نہ ہوگا، **إذا قيّدت الوكالة بقيد فليس للوكيل مخالفته.** (٢)

---

(١) المصدر السّابق: ١٨٩/٣ .

(٢) مجلّة الأحكام العدلية ، الفصل الثّاني في بيان الوكالة بالشّراء ، المادّة: ١٤٧٩ .

اگر مہتممین کو وکیل طلبہ قرار دیا جائے جیسا کہ بعض کتابوں میں ہے، تو اس کا صرف اتنا فائدہ ہوگا کہ ''زکاۃ'' مہتممین اور سفراء کے ہاتھوں میں آتے ہی معطین کا ذمہ فارغ ہو جائے گا، اور وہ دوبارہ اس کا مطالبہ نہیں کر سکتے ؟ لیکن اس کی وجہ سے مہتمم کو یہ اختیار نہ ملے گا کہ وہ مالِ زکاۃ جہاں مرضی ہو خرچ کریں؛ بلکہ اب بھی ان پر ضروری ہے کہ مصرفِ زکاۃ طلبہ پر ہی خرچ کریں؛ اس لیے کہ اسلامی حکومت کے ''بیت المال'' کے ''عاملوں'' کے ہاتھ زکاۃ وغیرہ آتے ہی معطین کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود زکاۃ کی رقم مصارف ہی میں خرچ کرنا ضروری ہوتا ہے، اسی لیے ''بیت المال'' کے سارے مدّات الگ الگ رکھے جاتے ہیں؛ تاکہ ہر ایک کو اس کے مصارف ہی میں صرف کیا جائے۔ ''بدائع الصنائع'' میں ہے:...... **ولمّا حصلَ في يدِ الإمامِ حصلت الصَّدَقةُ مُؤدَّاةً حتّى لو هَلكَ المالُ في يدهِ تَسقُطُ الزّكاةُ عن صاحبها.** (۱)

اور درمختار مع الشامی میں ہے:

**بُيوتُ المالِ أربعةٌ لِكلّ ۞ مصارف بَينَتها الْعَالِمُوْنَا**

**وقال الشّامي: ......... ذَكرُوْا أنّهُ يَجبُ عَليه أن يَجعلَ لِكلّ نوعٍ مِنهَا بَيتًا يَخُصهُ ولاَ يَخلِطُ بَعضُهُ بِبَعْضٍ إلخ.** (۲)

مسئلہ نمبر: (۵) مدرسے میں جو حضرات زکاۃ، فطرہ اور دیگر رقومات دیتے ہیں، ان کا منشاء طلبہ یا ضروریاتِ مدرسہ میں خرچ کرنا ہوتا ہے؛ لہٰذا زکاۃ کی رقوم اساتذہ کو دینا جائز نہیں، اگرچہ وہ مستحقِ زکاۃ ہی کیوں نہ ہوں، **إذا قيّدت الوكالة بقيد فليس للوكيل مخالفته.** (۳) **وفي ردّ المحتار: الْوَكِيلُ إنّما يَستَفيدُ التَّصرُّفَ مِنَ الْمُوَكِّلِ وقَد أَمَرَهُ بِالدَّفْعِ إلىٰ فُلانٍ، فَلا يَمْلِكُ الدَّفْعَ إلىٰ غَيرهِ كما لو أوصىٰ لزيد بكذا ليس للوصيّ الدّفع إلى غيره.** (۴)

---

(۱) بدائع الصّنائع: ۱۵۲/۲، فصل: وأمّا الّذي يرجع إلى المؤدّى.
(۲) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۲۸۱/۳، مطلب في بيوت المال ومصارفها.
(۳) مجلّة الأحكام العدليّة المادّة: ۱۴۷۹، الفصل الثّاني في الوكالة بالشّراء.
(۴) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۱۸۹/۳.

مسئلہ نمبر: (۶) اصل تو یہ ہے کہ زکاۃ و صدقاتِ واجبہ مستحقِ زکاۃ غرباء، فقراء، یتیموں اور بیواؤں پر صرف کی جائیں؛ لیکن اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے چوں کہ آج کل دینی مدارس کی پشت پناہی حکومت کی طرف سے نہیں ہو پاتی؛ اس لیے علماء نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ جہاں مدارس اور دینی اداروں کے واقعی اخراجات پورے کرنے کے لیے بھی امداد اور عطیات کی رقم کافی نہیں ہوتی، وہاں بہ قدر ضرورت اموالِ زکاۃ ''شرعی حیلۂ تملیک'' کے بعد مدرسے کی عام ضروریات میں صرف کیے جا سکتے ہیں۔(۱)

مسئلہ نمبر: (۷) ان میں زکاۃ کی رقوم خرچ کرنا جائز نہیں ہے، یہ ضروریاتِ طلبہ نہیں ہیں، طلبہ کی ضروریات میں تو صرف اُن کا کھانا، پینا، علاج و معالجہ، نقد وظیفہ اور وہ مصارف شامل ہیں جن کا تعلق براہِ راست طلبہ سے ہے اور انہی کی ذات پر منتہی ہو جائیں۔ وَلَا يَجُوْزُ أَنْ يبنى بالزَّكَاةِ الْمَسْجِد ، وَكَذَا الْقَنَاطِيْرُ .......... وَكُلُّ مَا لَا تَمْلِيْكَ فِيْهِ إلخ.(۲)

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۲/۴/۱۴۳۶ھ، مطابق: ۲/۲/۱۵ء

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفر لہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ، محمد اسد اللہ غفر لہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## اموالِ زکات کی وصولی اور صرف سے متعلق چند سوالات

محترم و مکرم حضرت مفتی صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

**سوال:** ﴿۵۱﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

اللہ کرے آپ اچھے ہوں، حاجی رمضان علی چیری ٹیبل ٹرسٹ اور اس کے متعلقین نیز کولکاتہ اور بیرون ملک کے بعض تجار حضرات کو زکاۃ کی وصولی اور اس کے موجودہ طریقۂ کار پر رہنمائی چاہیے،

(۱) المصدر السّابق: ۳/ ۲۹٤.

(۲) الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸.

جو درج ذیل ہیں:

(۱) مصارف زکاۃ میں ایک مد عاملین زکات ہے، شریعت میں اس سے کیا مراد ہے؟ عاملین زکات کا اطلاق کس پر ہوگا؟

(۲) مختلف چھوٹے بڑے ادارے، تنظیم اور مدارس کے لیے جو لوگ چندہ کرتے ہیں، کیا ان سب کو عاملین زکاۃ قرار دیا جائے گا؟ یا عاملین زکاۃ کے کچھ اوصاف وشرائط ہیں؟

(۳) چندے کی غرض سے جو سفراء بیرون ملک جاتے ہیں وہاں رہبری، گاڑی، ڈرائیور، رہائش وغیرہ پر اخراجات کثیر ہوتے ہیں، کبھی کبھی بچت کا تناسب صرف تیس چالیس فی صد رہ جاتا ہے، کیا یہ سارے اخراجات عاملین زکاۃ کے مد میں جائیں گے؟ اور بہت کم رقم کے اصل مد پر خرچ ہونے کی وجہ سے زکاۃ کی ادائیگی متأثر تو نہیں ہوگی؟

(۴) اہلِ خیر حضرات جو رقومات دیتے ہیں ان میں مدات کی صراحت ہوتی ہے، اور عموماً ان مدات میں عاملین زکات نہیں ہوا کرتے تو کیا عاملین زکات پر خرچ کی جانے والی رقم اہل خیر کے منشاء اور مد کے علاوہ بھی خرچ کی جا سکتی ہے؟ اگر ہاں تو کیا اس کے بھی کچھ شرائط ہیں، اگر کسی عامل کے پاس زکات کی رقم نہیں ہے، پانی ٹنکی، تعمیر مسجد وغیرہ کی رقم ہے تو اس کی اجرت کس رقم سے ادا کی جائے؟

(۵) بعض سفراء فراہمی مالیت کا کام کمیشن پر کرتے ہیں۔ ان کی اجرت متعین نہیں ہوتی، اخراجات سفر کے ساتھ اور کبھی اخراجات کی رقم کاٹ کر مجموعی وصولی کا فی صد مقرر ہوتا ہے، کبھی کبھی اخراجات اور کمیشن ساٹھ فی صد تک پہنچ جاتا ہے۔ عموماً چھوٹے مدرسے اور ادارے والے اس کو پسند کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو دینے والے کم ہوتے ہیں اور کمیشن کی لالچ میں سفراء زیادہ محنت کرتے ہیں۔

(۶) بعض اداروں میں کمیشن تو نہیں دیتے؛ لیکن مجموعی وصولی پر انعام فی صد کے حساب سے دیتے ہیں، انعام کا فی صد بھی تیس چالیس تک ہوتا ہے، بہ ظاہر انعام اور کمیشن میں لفظی فرق کے علاوہ الگ کچھ نہیں ہوتا، کیا متعینہ فی صد کے ساتھ انعامی رقوم پر کام کرنا درست ہے؟

(۷) بعض اداروں میں دوگنا تنخواہ پر کام ہوتا ہے اور رمضان کے مہینے کی اجرت دوگنی کردی جاتی ہے، یہ دوگنی اجرت چندے ہی کی وجہ سے دی جاتی ہے۔ بلکہ بعض مدارس میں یہ صراحت ہے کہ متعینہ رقومات سے کم لانے پر دوگنی تنخواہ بھی نہیں دی جائے گی، کیا ایسا کرنا درست ہے؟

براہِ کرم تفصیلی اور مدلل جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

المستفتي: محمود عالم

(۱۲۳۱/ د۱۴۳۵ھ)

باسمہ تعالیٰ

الجواب و باللّٰہ التّوفیق :

(۱-۲) ''عاملین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات، زکاۃ وعشر وغیرہ لوگوں سے وصول کر کے ''بیت المال'' میں جمع کرنے کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں۔ وأمّا العاملو ن علیها فهم الّذین نصبهُم الإمام لجبایة الصّدقات (۱) وهٰکذا في معارف القرآن (۲) لہٰذا تنظیموں اور دیگر دینی اداروں کے لیے جو لوگ چندہ جمع کرتے ہیں، وہ شرعی اصطلاح میں ''عاملین'' کے مصداق نہیں ہیں۔

(۳) چوں کہ یہ حضرات ''عاملین'' کے مصداق نہیں ہیں، جیسا کہ جواب: ۱-۲ سے معلوم ہوا؛ اس لیے براہِ راست اموالِ زکات سے ان کی تنخواہوں اور اخراجات کی ادائیگی جائز نہیں؛ (۳) البتہ اگر

(۱) بدائع الصّنائع : ۲/ ۱۵۱۔

(۲) معارف القرآن میں ہے: تیسرا مصرف ''العاملین علیها'' یہاں ''عاملین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کی طرف سے زکات وعشر وغیرہ............ لوگوں سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرنے کی خدمت میں مامور ہوتے ہیں۔ الخ (معارف القرآن: ۴/ ۳۹۷، ط: دیوبند)

(۳) "إنّما الصّدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها" ............ جعل اللّٰہ تعالیٰ الصّدقات للأصناف المذکورین بحرف اللّام وأنّه للاختصاص............ فلو جاز صرفها إلی غیرهم لبطل الاختصاص وهٰذا لا یجوز. (بدائع الصّنائع: ۲/ ۱۴۹، ما یرجع إلی المؤدی إلیه)

ضرورۃً سفراء بھیجے جائیں تو ''عطیات'' کی مد سے اخراجات پورے کیے جاسکتے ہیں؛ مگر یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ چندہ کے لیے ایسے طور پر بھیجنا کہ وصولی کے اخراجات، حاصل شدہ چندہ کے نصف سے زیادہ ہوں، شرعًا پسندیدہ نہیں، اسلامی حکومت میں بھی ''عاملین'' کو جو معاوضہ دیا جاتا تھا اس میں بھی یہ شرط تھی کہ نصف سے زیادہ نہ ہو۔ **والعامل يدفع إليه الإمام بقدر عمله ............ إلّا إن استغرقت كفايته الزّكاة فلا يزاد على النّصف ؛ لأنّ التّنصيف عين الإنصاف اهـ .**

**(هداية مع فتح القدير :۲/ ۲۶۷،ط:زكريا ديوبند)**

(۴) جب اہلِ خیر حضرات مدات کی صراحت کے ساتھ رقم دیتے ہیں تو انہیں معطین کی طرف سے مقرر کردہ مد میں ہی خرچ کرنا ضروری ہے، ان کے منشاء کے خلاف کسی اور مصرف میں خرچ کرنا جائز نہیں۔

**إذا قيّدت الوكالة بقيد فليس للوكيل مخالفته إلخ (۱) وفي ردّ المحتار: ...... الوكيل إنّما يستفيد التّصرّف من الموكّل وقد أمره بالدّفع إلى فلان فلا يملك الدّفع إلى غيره كما لو أوصٰى لزيد بكذا ليس للوصي الدّفع إلى غيره (۲)**

البتہ اگر وہ رقم زکات کی ہے تو مصارفِ زکات ہی میں خرچ کرنا ضروری ہے، اگر چہ معطی نے ان کے علاوہ کی تصریح کی ہو، اور اوپر یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ چندہ وصول کرنے والے حضرات ''عاملین'' کے مصداق ہیں ہی نہیں؛ لہٰذا ان کے اخراجات اور تنخواہیں اموالِ زکات سے ادا نہیں کی جاسکتی؛ بلکہ عام عطیات (جن کے بارے میں معطین نے کوئی مد متعین نہیں کیا ہے) سے ادا کرنا چاہیے۔

**(۱) مجلّة الأحكام العدلية:۱/ ۲۸۷، الفصل الثّاني في بيان الوكالة بالشّراء المادّة:۱۴۷۹۔**

**(۲) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۳/ ۱۸۹۔**

(۵-۶) دارالعلوم دیوبند کی طرف سے جاری کردہ ایک فتویٰ ارسال کیا جا رہا ہے (۱)

(۱) کمیشن پر چندہ کرنا اور چندہ پر انعام لینے کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مسئلہ ذیل میں کہ:

ہمارے مدارس دینیہ میں زیادہ تر آمدنی بمد زکوٰۃ ہوتی ہے، جس کو تملیک کرنے کے بعد مختلف مدات میں خرچ کیا جاتا ہے، اسی ذیل میں چندہ کرنے والے سفراء کی تنخواہ اور ان کا انعام بھی ہے، حسنِ کارکردگی پر سال ختم پر انعام دیا جاتا ہے، کیا سفراء کو انعام دینے کی شرعاً گنجائش ہے، بعض مدارس میں کمیشن طے کیا جاتا ہے اور سفراء کو کمیشن دیا جاتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ نیز انعام اور کمیشن میں کیا فرق ہے؟

بعض اہلِ خیر معطی حضرات کو اشکال واعتراض ہوتا ہے، کہ ہمارے چندہ میں سے کمیشن اور انعام دینے کی اجازت نہیں ہے، اس سلسلے میں شرعی حکم کی وضاحت فرمائیں؛ تاکہ معطی صاحبان اور اہل مدرسہ کے سامنے صحیح صورت حال واضح ہو سکے۔　　والسلام

محمد امان اللہ محلّہ مفتی سہارن پور (۱۴۱۵/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

صرف کمیشن پر چندہ کرنے کا معاملہ کرنا، بہ چند وجوہ ناجائز ہے:

(۱) اجرت من العمل ہے، جو ناجائز ہے [۱] یعنی اس جمع شدہ چندہ میں سے یہ اجرت دی جاتی ہے تو یہ معاملہ جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ صورت "قفیز طحان" کی ہے، جو حدیث شریف کی رو سے ممنوع ہے (اگر مدرسہ اپنے فنڈ سے دے گا، تو یہ وجہ ناجائز ہونے کی باقی نہ رہے گی، مگر دوسری مندرجہ ذیل وجوہ قائم رہیں گی)۔

(۲) اجیر اس عمل پر بنفسہ قادر نہیں، قادر بقدرۃ الغیر ہے، اس کا عمل چندہ دینے والوں کے عمل پر موقوف ہے، اور قادر بقدرۃ الغیر بحکم عاجز ہے، جب کہ صحتِ اجارہ کے لیے بہ وقت عقد اجیر کا قادر علی العمل ہونا اور مستاجر کا قادر علی تسلیم الاجرۃ ہونا، صحت عقد کے لیے شرط ہے؛ لہٰذا یہ اجارہ باطلہ ہوا؛ اس لیے چندہ لانے والے کے لیے اس کی اجرت بہ صورتِ حصہ مقررہ حلال نہیں۔　　(راجع احسن الفتاویٰ) ==

[۱] و لو دفع غزلاً لآخر لينسجه له بنصفه أي بنصف الغزل أو استأجر بغلاً ليحمل طعامه ببعضه ...... فسدت في الكل؛ لأنّه استأجره بجزء من عمله .

(الدّرّ المختار مع ردّ المحتار:۹/۷۸)

اس سے کمیشن اور انعام کا حکم نیز ان کا باہمی فرق واضح ہوجائے گا، ان شاء اللہ۔

(۷) جب دوگنی تنخواہ چندے کی وجہ سے دی جاتی ہے تو یہ اجارے کا معاملہ ہوا؛ لہٰذا اسے عمل کے ساتھ مشروط کرنا چاہیے، یعنی اگر ماہِ رمضان (پورا یا کچھ ایام جیسا طے ہو) میں چندہ کیا تو اضافی تنخواہ ملے گی، ورنہ نہیں، اسے رقم کے ساتھ مشروط کرنا کہ اگر اتنی رقم چندہ کیا تو دوگنی تنخواہ ملے گی،

== (۳) اسی طرح اس میں اجرت اور منفعت بھی مجہول ہے؛ کیوں کہ اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کہ کتنے گھنٹے روزانہ لوگوں کے پاس جانا ہے، ان تمام وجوہات کی بناء پر کمیشن کی بنیاد پر چندہ کرنا ناجائز ہے۔

سفیر کے لیے چندہ جمع کرنے پر اجرت کا بے غبار طریقہ یہ ہے کہ مہتمم مدرسہ جس شخص کو چندہ جمع کرنے کے لیے مقرر کرے، اس کے چندہ جمع کرنے کے عمل کی کوئی معین اجرت طے کردے، خواہ ماہانہ ہو یا یومیہ اور وہ شخص اس طے شدہ معاملہ کے مطابق چندہ جمع کرے، تو یہ صورت بلا شبہ جائز ہے، اور اگر سفیر تنخواہ دار ملازم ہو، تو اس کی حسن کارکردگی یا متعینہ مقدار (وصولیابی کی) پوری کرنے کی وجہ سے تنخواہ کے علاوہ کچھ رقم بطور انعام دینا تو جائز ہے؛ لیکن زکوٰۃ کے پیسے سے دینا جائز نہیں، بلکہ زکوٰۃ کا پیسہ مدرسہ میں جمع کرنا لازم ہے اور یہ انعام مدرسہ اپنے امدادی فنڈ سے (جس سے تنخواہ دی جاتی ہے) دے سکتا ہے۔

اب یہاں دو باتیں ہوئیں کمیشن پر چندہ کرنا (جو کہ ناجائز ہے) دوسرے تنخواہ پر چندہ کر کے اخیر میں انعام دیا جانا، یہ جائز ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ کمیشن اجرت کے درجہ میں ہوتا ہے جس کا اجارہ فاسدہ میں داخل ہونا اوپر ذکر کیا جا چکا اور انعام اجرت کے علاوہ حسن کارکردگی پر اضافی طور پر دیا جاتا ہے، جو شرعاً جائز ہے، ہاں یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر انعام بطور فیصد دیا جائے تو بھی اس کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ یہ اصل اجرت نہیں ہے کہ اجرت مجہول میں داخل ہونے کا گمان ہو۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ خاص چندہ کی رقم، جو عموماً زکوٰۃ، صدقات واجبہ کے مد کی ہوتی ہیں، اس میں سے کمیشن یا انعام دینا جائز نہیں؛ بلکہ مدرسہ اپنے عمومی فنڈ سے تنخواہ یا انعام دے، جس طرح مدرسہ کے دوسرے جائز مصارف میں خرچ کرنے اور ملازمین کو تنخواہ دینے کا مہتمم مجاز ہوتا ہے، اس کا بھی مجاز ہوگا، معطین کی زکوٰۃ وغیرہ رقمِ خاص سے نہیں دیا جاتا کہ معطین کو اعتراض یا اشکال ہو، ہاں اربابِ حل وعقد یا شوریٰ اس کے صواب وناصواب ہونے کی جانچ کرسکتے ہیں، اور جہاں کہیں معطین کی رقم خاص سے تنخواہ یا انعام کمیشن لے لینے کا طریقہ ہو، وہاں معطین کا اعتراض بجا ہوگا۔ فقط واللہ اعلم

ورنہ نہیں، درست نہیں اور اگر اس طرح معاملہ کیا جائے کہ ماہِ رمضان میں چندہ کرنے پر آپ کو اکہری تنخواہ ملے گی؛ اور اگر آپ کا چندہ (مثلاً) پچاس ہزار سے زائد ہو گیا تو ادارہ کی جانب سے آپ کو انعام دیا جائے گا، اس طرح معاملہ درست ہو جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۰/ ۸/ ۱۴۳۲ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

# نکاح، طلاق اور متعلقات

## ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعے نکاح کا حکم

**سوال:** ﴿۵۲﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

مفتی صاحب، آج کل انٹرنیٹ کا دور ہے اور آج کا انٹرنیٹ بہت فاسٹ ہے آدمی دوسرے کی حرکت اور سکنات کو بغیر کسی اشتباہ کے اچھی طرح سمجھ بھی سکتا ہے اور بغیر کسی دقت اور پریشانی کے پہچان بھی سکتا ہے تو کیا آج کل انٹرنیٹ پر آن لائن ہو کر جب کہ کیمرہ بھی چل رہا ہو اور ایک دوسرے کو پہلے سے بھی پہچانتے ہوں کیا نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟؟ اگر نہیں تو کیوں؟ جب کہ کسی قسم کے دھوکے کا کوئی خطرہ بھی نہیں؟

میں قطر میں رہتا ہوں یہاں ایک حنفی مفتی نے جائز کا فتوی دیا ہے اور یہ عمل بنگلا دیش میں حنفی لوگ کرتے ہیں اس لیے اس مسئلہ کی دلیل کے ساتھ وضاحت فرمائیں۔ (۲۳۶/د۱۴۳۳ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق:**

حنفی مفتی صاحب نے جو جواز کا فتویٰ دیا وہ فتویٰ ہمارے سامنے نہیں ہے کہ غور کیا جاتا۔

جہاں تک انٹرنیٹ کے ذریعے نکاح کے عدمِ جواز کی بات ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شرعاً نکاح کے صحیح ہونے کے لیے ایجاب وقبول کی مجلس کا ایک ہونا شرط ہے(۱) اور بدائع الصنائع کی عبارت

---

(۱) قال في الدّرّ المختار: ومن شرائط الإيجاب والقبول اتّحاد المجلس. (۷۶/۴، کتاب النّکاح)

**وأمّا الّذي يرجع إلى مكان العقد فواحد و هو اتّحاد المجلس بأن كان الإيجاب والقبول في مجلس واحدٍ** (۱) سے پتہ چلتا ہے کہ اتحادِ مجلس سے مراد متعاقدین کا کلام ایک ہی زمانہ اور ایک ہی مکان میں مربوط ہو (۲) نیز صحتِ نکاح کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس ایجاب وقبول کو دو شاہدوں (گواہوں) نے سنا ہو (۳) اور ''شاہد'' کہتے ہی ہیں، ایسے شخص کو جو مجلس نکاح میں خود موجود ہو، عاقدین کے کلام کو بلا کسی اشتباہ کے سن سکتا ہو؛ تاکہ بوقت ضرورت گواہی دے سکے؛ لہٰذا انٹرنیٹ پر آن لائن ہو کر نکاح کرنے کی صورت میں اگر چہ گواہان موجود ہوں اور ایجاب وقبول کو سن بھی رہے ہوں پھر بھی نکاح صحیح نہ ہوگا؛ اس لیے کہ مجلس متحد نہیں ہے، نیز شہادت کی شرط بھی پوری نہیں ہو رہی ہے؛ اس لیے کہ یہاں تحریف وتلبیس اور اشتباہ کے کافی مواقع ہیں اور مختلف مناظر کو مصنوعی طریقہ پر ایک دوسرے سے منسلک کرنے کی گنجائش موجود ہے؛ جب کہ فقہاء نے دیوار کے پیچھے سے کوئی چیز سن کر اس کی گواہی دینے کو بھی ناجائز لکھا ہے (۴) **إذا سمعه من وراء الحجاب لا يسعه أن يشهد لاحتمال أن يكون غيره إذ النّغمة تشبه النّغمة . (تبيين الحقائق للزّيلعي، كتاب الشّهادات)**

املاہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/صفر ۱۴۳۳ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ، بلند شہری، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

(۱) بدائع الصّنائع: ٤/ ٣٢٤، كتاب البيوع .

(۲) قال في البحر: فلو اختلف المجلس لم ينعقد ، فلو أوجب أحدهما فقام الآخر، أو اشتغل بعمل آخر بطل الإيجاب ؛ لأنّ شرط الإرتباط اتّحاد الزّمان فجعل المجلس جامعًا تيسيرًا . (البحر الرّائق: ٣/ ١٤٨، كتاب النّكاح)

(۳) وشرط حضور شاهدين ............ سامعين قولهما معًا .

(الدّرّ مع الرّدّ: ٤/ ٨٧-٩١)

(۴) ففي الشّامي نقلاً عن الملتقط : إذا سمع صوت المرأة ولم ير شخصها فشهد اثنان عنده أنّها فلانة لا يحلّ له أن يشهد عليها . (شامي: ٨/ ١٨١، كتاب الشّهادة)

# شادی کی مروّجہ رسومات کی اصلاح اور اس کا طریقۂ کار

**سوال:** ﴿۵۴﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین درج ذیل مسئلہ میں :

ہمارے شہر میں ایک مجلس بہ نام ''مجلسِ احیاء السنۃ'' بنائی گئی، جس میں شہر کے اکثر؛ بلکہ جمیع علماء نے بعد کثیر مشاورت کے حالات حاضرہ کے تناظر میں مندرجہ ذیل نکات پر عہد کیا۔

(۱) لین دین، جوڑا، گھوڑا، جہیز اور ہر طرح کے مطالبہ والی شادیوں کا بائیکاٹ کریں گے۔

(۲) شادیوں میں بے جا رسومات سے پرہیز کریں گے۔

(۳) نکاح میں دعوتِ طعام سے احتراز کریں گے۔

(۴) نکاح کی دعوت صرف غیر مقامی مہمان اور گھر کے افراد کے لیے کریں گے۔

(۵) دعوتِ ولیمہ میں سادگی کے ساتھ ایک قسم کے کھانے پر اکتفاء کریں گے۔

(۶) محفلِ نکاح و ولیمہ میں آتش بازی، باجا، ویڈیو گرافی اور قیمتی رقعہ جات کا استعمال نہیں کریں گے۔

(۷) مسجد میں نکاح کو ترجیح دیں گے۔

**نوٹ:** جس محفلِ نکاح یا ولیمہ میں مندرجہ بالا امور کی خلاف ورزی ہوگی اس کا بائیکاٹ کریں گے۔

وہ حالات جن کو مدنظر رکھتے ہوئے مندرجہ بالا نکات پر عہد کیا گیا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہمارے یہاں لڑکیوں کی شادی بیاہ، ماں باپ کے لیے ایک بڑا سنگین مسئلہ بن گیا ہے؛ کیوں کہ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبہ ہوتا ہے کہ اتنی رقم بند جوڑے کی رقم (نیوتا) کے طور پر دی جائے، اتنے تولہ سونا دیا جائے، فلاں گاڑی دی جائے، فلاں فلاں چیز بہ طور جہیز کے فلاں فلاں کمپنی کی دی جائے۔ گھر یا پلاٹ (قطعۂ اراضی) دی جائے، شادی کے دن دعوت میں اتنے (تعداد) آدمیوں کا اتنے اتنے قسم کا پکوان پکا کر، فلاں معیاری فنکشن ہال (شادی گھر) میں دعوت کا انتظام کیا جائے۔

جس کی وجہ سے درمیانی درجہ کے لوگ بہت متأثر ہورہے ہیں، کیوں کہ مال دار تو اپنے مال کے نشہ میں معیاری شادی کر کے پیسہ برباد کررہے ہیں، تو غریب لوگ بھی مانگ مانگ کر اپنی جمع شدہ رقم اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کررہے ہیں، درمیانی متوسط طبقہ کے لوگ اور یہی امت کا وہ طبقہ ہے جو مندرجہ بالا مفسدات کی وجہ سے مصیبت میں ہے؛ کیوں کہ عزت کی وجہ سے کسی سے مانگ نہیں سکتے اور اگر مذکورہ چیزیں نہ کی گئیں تو سماج میں ناک کٹ جائے گی اور کوئی ان کی لڑکی کو بیاہ کر کے نہ لے جائے گا، جس کی وجہ سے بہت سی باعزت گھرانوں کی لڑکیاں شادی کے انتظار میں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہیں، تو بے شمار لڑکیاں ماں باپ کی مجبوری کو نہ دیکھ سکتے ہوئے، خودکشی نوٹ لکھ کر کہ میرے ماں باپ پر میں بوجھ بن گئی ہوں، خودکشی کررہی ہیں، تو بعض ایسی لڑکیاں جن کی اسلامی صحیح تربیت نہیں ہوئی، کسی غیر مسلم لڑکے سے دوستی کر کے، مرتد ہوکر شادی کررہی ہیں، پوچھنے پر کہہ رہی ہیں کہ ہمارے باپ کے پاس ہماری شادی کی استطاعت نہیں تھی، اور کوئی مسلمان نوجوان مطالبات کے بغیر ہم سے شادی کرنے کو تیار نہ تھا، جس کی وجہ سے مجبوراً ہم کو یہ اقدام کرنا پڑا، جس کے تم لوگ ذمہ دار ہو۔

بعض لوگ سماج میں اپنی عزت باقی رکھنے کے لیے مندرجہ بالا مطالبات کو بہ طور سود قرض لے کر، یا اپنی جائیدادیں فروخت کر کے، یہاں تک کہ اپنے رہنے کا گھر تک بیچ کر، اللہ معاف کرے بعض واقعات تو ایسے ہیں کہ لوگوں نے اپنے گُردے کو فروخت کیا تا کہ اپنی لختِ جگر کا کسی بھی طرح بیاہ ہوجائے۔ مجبوراً معیاری (نام ونمود، دکھاوے، شہرت، عزت، اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے) شادیاں کررہے ہیں۔

اور ہمارے یہاں بعض لڑکے والے ایسے بھی ہیں، جو کہتے ہیں کہ ہماری طرف سے لین دین جوڑے گھوڑے کا کوئی مطالبہ نہیں، آپ اپنی سہولت سے جو دے سکتے ہیں دیں، بس ایک شرط ہے کہ شادی کی دعوت معیاری کی جائے، جس میں ہمارے خاندان، دوست واحباب کے اتنے افراد شریک ہوں گے، جس کے لیے آپ فلاں معیاری شادی محل لیں گے، فلاں فلاں پکوان پکائے

جائیں گے، جس کی وجہ سے جو خرچ جہیز کے مطالبہ میں لین دین میں ہوتا تھا، وہ بے جا کھلانے، پلانے میں ہو رہا ہے، اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ شادی مسجد میں ہوگی، شادی کی کوئی دعوت نہیں ہوگی اور لین دین، جوڑے، گھوڑے کا مطالبہ بھی نہیں، بس ایک شرط ہے کہ ہم لوگ ولیمہ کی دعوت بہترین فنکشن ہال، شادی محل میں پر تکلف کریں گے، جس میں آپ بھی اپنے دوست و احباب، رشتہ داروں کو بلا لائیں، جو خرچ بھی ہوگا آپس میں آدھا آدھا کرلیں گے، ان تمام کا مقصد صرف دکھاوا ہوتا ہے، کہ فلاں صاحب نے اتنی بہترین دعوت کی، اتنا اتنا پکا کر اتنے اتنے لوگوں کو کھلایا، جب کہ ان چیزوں میں صرف پیسوں کا ضیاع ہے، اگر ان پیسوں کو بچا کر وقتِ ضرورت استعمال کریں یا خیر کے کاموں میں خرچ کریں، امت کا بہت فائدہ ہوگا۔ (اللہ توفیق عطا فرمائے)؛ مگر لوگ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے خواہ مخواہ شادی بیاہ کے موقعہ پر زیادہ سے زیادہ پیسہ خرچ کر رہے ہیں، اور لڑکی والے لوگ سود کے دَلدل میں پھنستے جا رہے ہیں، خاص طور پر متوسط درجہ کے لوگ ان چیزوں کی وجہ سے بے حد پریشان ہیں؛ مگر عزت کے لیے اس کا اظہار نہیں کرتے۔

عہد کرنے کے بعد بعض لوگ چند نکات پر اختلاف کر رہے ہیں۔ نکتہ نمبر: ۳- کے متعلق بعض لوگ کہہ رہے ہیں کہ لڑکی والوں کو دعوت سے منع کرنے والے آپ کون ہیں؟ وہ خود اپنی خوشی سے کر رہے ہیں تو کرنے دینا چاہیے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ خوشی سے شاید ہی کوئی کرتا ہو، اکثر تو اس کے لیے بے حد پریشان ہو جاتے ہیں۔ سود پر قرض لینے، رشوت لینے، چوری کرنے، غرض یہ کہ مال جمع کرنے کے حریص بن جاتے ہیں، چاہے مال حلال طریقے سے آئے یا حرام؛ کیوں کہ ان کو اپنی بیٹی کی فکر دامن گیر ہوتی ہے؛ لہٰذا ابتلائے عام کی وجہ سے سب کو ایک نہج پر لانے کے لیے، ہم نے باتفاق یہ طے کیا کہ شادی کے موقعہ پر دعوت نہ کی جائے، ہاں غیر مقامی مہمان ہوں یا گھر کے افراد تو ان کا انتظام کرلیا جائے؛ مگر بڑی پر تکلف، دکھاوے والی دعوت نہ کی جائے، ورنہ بعض کی وجہ سے سب کو مصیبت لاحق ہو رہی ہے، اگر آپ کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہے تو آپ کسی اور موقعہ سے دعوت کرلیں؛ مگر شادی کے موقعہ پر نہیں، تاکہ لڑکیوں کی شادیاں آسان ہوں، عذاب نہ بن جائیں۔

اس سلسلے میں مفصل رہنمائی فرمائیں کہ ہمارا روکنا صحیح ہے؟ اور جو لوگ عہد کرنے کے بعد اختلاف کررہے ہیں ان کا کیا جواب ہے؟ کیا وہ عہد شکن ہیں؟

اسی طرح نکتہ نمبر: ۵- کے متعلق بھی لوگ کہہ رہے ہیں کہ دعوتِ ولیمہ میں سادگی کے ساتھ ایک قسم کا کھانا پکانے کا حکم کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں؟ اور زائد پکوان پر آپ کو روک ٹوک کرنے کا کیا حق ہے؟ اللہ نے کسی کو نوازا ہے تو ''تحدیث بالنعمۃ'' کے طور پر وہ ولیمہ کے موقعہ پر اچھے سے اچھا بیسیوں قسم کے ڈشش بنا کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کھلا رہا ہے، تو اس کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ ہمارے بزرگوں کے متعلق بھی یہ بات ملتی ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کو خوب سے خوب دسیوں اقسام کے کھانے پکا کر کھلاتے ہیں؛ لہٰذا اس پر تحدید نہ لگائی جائے، جب کہ ہمارا منشاء یہ ہے کہ چند افراد کی وجہ سے سب کو پریشانی لاحق ہو رہی ہے؛ کیوں کہ امت کا اکثر طبقہ متوسط ہے؛ مگر وہ سماج میں اپنی عزت باقی رکھنے کے لیے مال دار لوگوں کے برابر دعوتیں کررہے ہیں۔

اس لیے ہم نے سوچا کہ سب کو ایک نہج پر لایا جائے، تو سب کے لیے آسانی ہوگی، رہی بات مال دار لوگوں کی تو وہ کسی اور عنوان سے دعوت کرلیں اور جو چاہے کھلائیں؛ مگر شادی ولیمہ کے موقعہ پر نہیں، تاکہ شادیاں آسان ہوں۔

اس سلسلے میں ہماری مکمل رہنمائی فرمائیں کہ کیا ہمارا اس طرح کا مطالبہ کرنا صحیح ہے؟ اور جو لوگ مندرجہ بالا اختلاف کررہے ہیں اس کا کیا جواب ہے؟ اور جو لوگ عہد کرنے کے بعد جن نکات پر عہد کیا ہے، اس کی خلاف ورزی پر مشتمل شادی ولیمہ کی دعوتوں میں شریک ہو رہے ہیں، ان کا کیا حکم ہے؟ اور اگر کوئی عہد کرنے پر متأسف ہے (ان کا کہنا ہے کہ مفسدات پر مبنی شادی ولیمہ میں شرکت کرتے ہیں تو عہد کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور شرکت نہ کریں تو رشتے ناطے میں فرق آ رہا ہے، دوست واحباب ناراض ہو رہے ہیں)؛ لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ اس عہد سے نکل جائیں، اس کی کیا شکل ہے؟

مفصل جواب دے کر ممنون فرمائیں۔ (اللہ آپ کو اجرِ جزیل عطا فرمائے)؛ کیوں کہ یہ ہمارے یہاں کا ایک سلگتا ہوا مسئلہ ہے، جس میں امت پس رہی ہے۔

مستفتی: محمد ادریس احمد

(کنوینر) وجمیع اراکین مجلس احیاء السنۃ (نلگنڈہ، آندھرا پردیش) (۹۳/ د ۱۴۳۵ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب و باللّٰہ التّوفیق :

شادی میں پائی جانے والی مروجہ ناجائز رسومات کو ختم کرنے کے لیے آپ حضرات کی فکر مندی اور سعی قابلِ مبارک باد ہے(۱) حقیقت یہ ہے کہ شادی جو شریعت کی نظر میں بہت ہی آسان عمل تھا، آج کل اُس میں ایسی رسومات داخل ہوگئی ہیں، جن کی وجہ سے امت کے ہر طبقے کو پریشانی ہی پریشانی لاحق ہے، اور ایک سنت عمل کی بجا آوری کے لیے بسا اوقات بہت سے محرمات و منکرات کا ارتکاب لازم آنے لگا، ایسے حالات میں قوم و ملت کی ہمدردی اور خیر خواہی کے تقاضے سے خصوصًا اُن غریب خاندانوں کی طرف نظر کرتے ہوئے، جن کی زندگیاں اِن رسومات کی وجہ سے اجیرن بن گئی ہیں، اور ہزار ہا ہزار لڑکیوں کے شادی کے مسائل پیدا ہوگئے ہیں رسومات کو مٹانے، ختم کرنے اور شادی کا اِسلامی طریقہ رائج کرنے کی ادنیٰ جدو جہد خصوصًا علماء کی طرف سے یقینًا بہت بڑے ثواب اور آخرت میں رفعِ درجات کا سبب ہوگا؛ لیکن اِصلاح کے لیے شریعت میں تبشیر، ترغیب اور حکمت و نرمی وغیرہ امور کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے(۲) اور تجربہ سے بھی اِس طریقۂ کار کا مفید ہونا ثابت ہے، جبری طریقہ وہاں مفید ہوتا ہے، جہاں اُس کی اہلیت پائی جائے؛ اس لیے بائیکاٹ (یعنی باہم مجتمع ہوکر مروّجہ رسومات پر مشتمل شادی کے بالتعیین بائیکاٹ کا اِعلان کرنے اور جو اُس

(۱) أخرج التّرمذي أنّ النّبيّ – صلّى اللّٰه عليه وسلّم – قال : ...... إنّ الدّين بدأ غريبًا ويرجع غريبًا ، فطوبى للغرباء الّذين يصلحون ما أفسد النّاس من بعدي من سُنّتي .

(التّرمذي، رقم: ۲۶۳۰، باب ما جاء أنّ الإسلام بدأ غريبًا وسيعود غريبًا)

(۲) قال النّبيّ – صلّى اللّٰه عليه وسلّم : ...... إنّما بعثتم ميسرين ولم تبعثوا معسرين .

(أخرجه التّرمذي ضمن قصّة طويلة: رقم: ۱٤۷، باب ما جاء في البول يصيب الأرض)

میں شرکت کرے، اس کی تذلیل وتحقیر کرنے، اُس کو اپنے طبقے سے الگ کرنے وغیرہ وغیرہ) کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے وعظ ونصیحت کا طریقہ اختیار کیا جائے(۱) انفرادی واجتماعی طور پر لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی جائے، مروّجہ رسومات کی قباحت وشناعت اور اُن کے دینی دنیوی نقصانات، اِسلامی شادی کے فضائل ومناقب اور اُس میں حاصل ہونے والی آسانیاں خوب بیان کی جائیں۔(۲)

چند فاسد جزئیات کو مُشخَّص ومعیَّن کر کے ایک مخصوص طبقے سے عہد لینے کے بجائے، کلی طور پر پہلے خود اور پھر دیگر لوگوں کو اِس طرف متوجہ کیا جائے کہ وہ اِسلامی طریقے سے شادی کریں گے، اور ہر حساس اور فکر مند شخص کا بالخصوص مقتدا و پیشوا حضرات لوگوں کو سادگی اختیار کرنے کی ترغیب و تشویق پیدا کرنے کے ساتھ اپنے طور پر دل میں طے کریں، محرمات ومنکرات، مروّجہ ناجائز رسومات، تفاخر وغیرہ امور سے شادی میں احتراز کریں گے اور جس شادی میں مذکورہ چیزیں پائی جائیں گی، اُس میں شرکت کرنے سے خود احتراز کریں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/۲/۱۴۳۵ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفرلہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## لفظ ''چھوڑ دیا'' سے وقوع اور عدمِ وقوعِ طلاق سے متعلق دو فتوے

**سوال:** ﴿۵۴﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

اگر شوہر اپنی بیوی کو بلا نیت طلاق کہے کہ میں نے تجھے چھوڑا، اور اس نے قسم کھائی کہ میں نے

---

(۱) عن عائشة رضي الله تعالى عنها أنّ النّبيّ – صلّى الله عليه وسلّم قال: يا عائشة ! إنّ الله رفيق يحبّ الرّفق ويعطي على الرّفق ما لا يعطي على العنف وما لا يعطي على ما سواه .
(مسلم، رقم: ۲۵۹۳، باب فضل الرّفق)

(۲) ادع إلى سبيل ربّك بالحكمة والموعظة الحسنة . (النّحل: ۱۲۵)

اس سے طلاق کا ارادہ نہیں کیا تھا، سوال یہ ہے کہ کیا اس سے طلاق ہوجائے گی؟ اور سب کچھ ختم ہوجائے گا؟ اس نے اللہ اور اس کے رسول کی قسم کھائی ہے کہ میں نے اس جملہ سے طلاق کا ارادہ نہیں کیا تھا، براہِ کرم اس جانب رہنمائی فرمائیں۔ (۵۲۱/د ۱۴۳۲ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

''میں نے چھوڑا'' عرفاً اب صریح کے حکم میں مستعمل ہے؛ اس لیے اس سے بلانیت طلاق واقع ہوجائے گی، اور شوہر کا یہ کہنا کہ ''میں نے اس سے طلاق کا ارادہ نہیں کیا تھا''، مسموع نہ ہوگا، **قوله : سَرّحْتُكِ وهو ''رها كردم'' لأنّه صار صريحًا في العرف على ما صرح به نجم الزّاهديُّ ......... فإذا قال : رها كردم ، أي سرّحتك ، يقع به الرّجعيّ مع أنّ أصله كناية أيضًا** ( شامی: ۴/ ۵۳۰) شوہر نے اس لفظ کے کہنے سے پہلے سابق میں کوئی طلاق نہیں دی تھی اور اس نے یہ جملہ ایک مرتبہ کہا ہے، تو اس سے ایک طلاق رجعی واقع ہوگی، **كما مرّ عن الشّامي** ، عدت کے اندر رجعت کرسکتا ہے، تجدید نکاح کی ضرورت نہیں، اور بعد انقضائے عدت جدید نکاح کر کے زوجیت میں رکھنے کا مجاز ہوگا، حلالہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۲/۱/۵ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

مفتیان دارالعلوم دیوبند

**سوال:** ﴿۵۵﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

میرا سوال ''میں نے چھوڑا'' کے سلسلے میں ہے، اگر کوئی کہے کہ میں نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا اور وہ اس سے مراد لے آفس یا کسی اور جگہ (چھوڑنا) تو یہ صریح کیسے ہوا؟ (۳۰۱/د ۱۴۳۵ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

لفظ ''چھوڑ دیا'' اصلاً کنایہ ہے؛ لیکن عرف عام میں طلاق کے لیے کثرت سے استعمال ہونے کی وجہ سے الفاظ صریحہ کے حکم میں ہوگیا، جس طرح کہ لفظ ''سَرَّحْتُكِ'' کا استعمال کنایہ میں ہوتا تھا؛ لیکن عرفِ عام میں طلاق کے لیے کثرت سے استعمال کی وجہ سے صریح کے حکم میں ہوگیا؛ چناں چہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: **بخلاف فارسية قوله: سَرَّحْتُكِ، وهو ''رها كردم'' لأنّهٗ صار صريحًا في العرف ............ فإذا قال: ''رها كردم'' أي سَرَّحْتُكِ، يقع به الرّجعيّ، مع أنّ أصلهٗ كناية أيضًا**(۱) اسی طرح شروع میں بعض اکابرین نے بھی لفظ ''چھوڑ دیا'' کو کنایات میں شمار کیا ہے، جیسا کہ ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند''(۲) اور ''کفایت المفتی'' وغیرہ میں ہے؛(۳) اس لیے کہ لفظ ''چھوڑ دیا'' اس وقت عرف عام میں کثرت سے طلاق کے معنی میں مستعمل نہیں تھا؛ لیکن جب یہ لفظ کثرت سے طلاق کے معنی میں استعمال ہونے لگا، تو بعد کے علمائے کرام نے اس کو صریح قرار دیا، جیسا کہ ''امداد الفتاویٰ''(۴) اور ''فتاویٰ محمودیہ''(۵) وغیرہ میں ہے؛ چناں چہ حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ ایک استفتاء میں اس طرح کے اشکال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کا وہ فتویٰ (چھوڑ دی کو کنایہ میں شمار کرنے کا) جس زمانے کا ہے، اس زمانے میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے نزدیک طلاق کے معنی میں متعارف بہ تعارف نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ جواب ہے اور ''امدادالفتاویٰ'' وغیرہ جو بعد کے جوابات ہیں (جس میں چھوڑ دی کو صریح کہا گیا ہے) ان کے زمانے میں طلاق صریح کے لیے متعارف بہ تعارف ہو چکے ہیں؛ اس لیے یہ جواب ہے(۶)

---

(۱) **ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ٤/٥٣٠، باب الكنايات.**

(۲) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۹/ ۳۷۵، کنایات، مکتبہ دارالعلوم دیوبند۔

(۳) کفایت المفتی: ۶/ ۳۷-۳۸، **كتاب الطّلاق**، ط: زکریا دیوبند۔

(۴) امدادالفتاویٰ: ۲/ ۴۵۶۔

(۵) فتاویٰ محمودیہ: ۱۲/ ۳۴۱، **باب الطّلاق الصّريح**، ط: ڈابھیل.

(۶) منتخبات نظام الفتاویٰ: ۲/ ۲۳۵۔

لہٰذا اگر لفظ ''چھوڑ دیا'' کے موقع ومحل کے اعتبار سے دوسرے معنی متعین ہوجائیں، یا کسی جگہ کا یہ عرف نہ ہو، تو ایسی صورت میں اس سے بلا نیت طلاق واقع نہیں ہوگی؛ پس صورتِ مسئولہ میں اگر کوئی شخص ''چھوڑنے'' کے لفظ سے آفس یا کسی اور جگہ چھوڑنا مراد لے اور قرائن سے اس کی تائید ہو تو ایسی صورت میں طلاق واقع نہ ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۰/۳/ ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۲/۱/۲۰۱۴ء

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## تین طلاق کے ایک ہونے کے حوالے سے ایک عرب عالم کے فتوے کا جواب

**سوال:** ﴿۵۶﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

راشد بازار گیا ہوا تھا جب گھر آیا تو معلوم ہوا کہ گھر میں کچھ مہمان آئے ہیں، ایک مہمان کے ساتھ اس کی بیوی سے کچھ اُلجھاؤ ہوگیا تھا، اس کے آنے پر اس مہمان نے اس کی بیوی کی شکایت اس سے کی تو وہ اپنی بیوی کو لے کر کمرے میں چلا گیا اور اسے سمجھایا بجھایا، پھر اس کے بعد مہمان نے اس سے کوئی سخت الفاظ کہے، اس پر اس کی بیوی بول پڑی، اس کی وجہ سے راشد کو غصہ آگیا اور اس نے تین بار یہ لفظ کہا ''طلاق، طلاق، طلاق'' بیوی قدرے فاصلہ پر کھڑی تھی اس کے بعد یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلا گیا کہ میں تیرے گھر والوں کو فون کرتا ہوں۔

راشد کا ارادہ نہ اس وقت بیوی کو طلاق دینے کا تھا نہ اب ہے، مفتیانِ کرام اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب مطلوب ہے!

سوال نامہ کے ساتھ ایک بڑے سعودی عالم کا فتویٰ منسلک ہے، اسے سامنے رکھتے ہوئے

جواب سے نوازا جائے، راشد کی بیوی قریباً چار ماہ کی حاملہ ہے۔(۱)

مستفتی: محمد امجد مظفر نگر

۲۰۵/د ۱۴۳۶ھ

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب و باللّٰہ التّوفیق :

تین طلاق ایک مجلس میں خواہ ایک ساتھ دی گئی ہوں یا علیحدہ علیحدہ، بہر حال وہ تین ہی واقع ہوتی ہیں، یہ حکم کتاب وسنت، اجماعِ امت اور قیاس چاروں ادلۂ شرعیہ سے ثابت ہے، یہی ائمۂ اربعہ اور جمہور فقہاء ومحدثین کا مسلک ہے : قال في عمدة القاري:مذهب جماهير العلماء من التّابعين، ومن بعدهم، منهم الأوزاعي، والنّخعي، والثّوريّ، وأبو حنيفة وأصحابه ، والشّافعيّ وأصحابه وأحمد وأصحابه ، ......... على أنّ من طلق امرأته ثلاثًا وقعن ولكنّه يأثم (۲) بلکہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں، اس پر امام ابوبکر جصّاص رازیؒ نے سلف کا اجماع نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: فالكتاب والسّنّة وإجماع السّلف توجب

---

(۱)

الحمد للّٰه ربّ العالمين والصّلاة والسّلام علىٰ رسوله الأمين وبعد !

سؤال:يسأل السّائل:(يقول طلّقت زوجتي في مجلس واحد ثلاث طلقات فما حكم؟)

جواب: اختلف الفقهاء في طلاق الثّلاث ، والرّاجح أنّه يقع واحدة ، سواء تلفّظ بها بكلمةٍ واحدةٍ كقولهِ : أنتِ طالق ثلاثًا ، أو تلفّظ بها بكلمات متفرّقة ، كقولهِ : أنتِ طالق، أنتِ طالق ، أنتِ طالق ، وهٰذا ما اختاره شيخ الإسلام ابن تيمية رحمه اللّٰه ، ورجّحه الشّيخ السّعدي رحمه اللّٰه ، والشّيخ ابن عثيمين رحمه اللّٰه .

واستدلّوا بما رواه مسلم : (عَن ابنِ عَبّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ الطَّلَاقُ عَلىٰ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِيْ بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدةً فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الخَطَّابِ : إنّ النّاسَ قَدْ اسْتَعْجَلُوْا فِيْ أَمْرٍ قَدْ كَانَتْ لَهُمْ فِيْهِ أَنَاةٌ فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ)

(۲) عمدة القاري:۲/۲۳۳، باب من أجاز الطّلاق الثّلاث ، بيروت .

إيقاع الثّلاث معًا و إن كانت معصية. (۱)

خود سعودی حکومت نے حرمین شریفین اور ملک کے دیگر نامور علمائے کرام پر مشتمل ایک تحقیقاتی مجلس قائم کی تھی جن میں شیخ عبداللہ بن باز، شیخ عبداللہ بن سلیمان بن منیع، شیخ محمد بن عودہ اور دیگر علمائے عرب شریک تھے، اس کمیٹی میں بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں یہی طے پایا کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں، وہ رسالہ احسن الفتاویٰ: ۵/۲۲۳، میں شاملِ کتاب ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں۔

الغرض ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک کہنا کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماعِ امت کے خلاف ہے؛ اس لیے اس کا اعتبار نہیں ہے؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جب راشد نے اپنی بیوی کو تین مرتبہ طلاق، طلاق، طلاق کہہ دیا، تو اس سے تین طلاق مغلظہ پڑ گئیں، اب بغیر حلالۂ شرعیہ راشد کی بیوی اس کے لیے حلال نہیں ہو سکتی۔ قال اللّٰه تعالیٰ: ﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾ (۲)

وفي سنن الدّار قطني: أيّما رجل طلّق امرأته ثلاثًا ........ لم تَحِل لَهُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ. (۳)

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سوال کے ساتھ منسلکہ فتویٰ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی جس روایت سے استدلال کیا گیا ہے، اس سے مذکورہ مسئلہ پر استدلال کرنا متعدد وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔

(۱): اوّلاً اس لیے کہ محدثین کے ایک طبقہ نے جس میں امام بیہقی، ابن عبدالبر، علامہ قرطبی وغیرہ ہیں اس روایت کو شاذ اور مضطرب قرار دیا ہے؛ بل کہ علامہ ابن عبدالبر نے تو اس روایت کو وہم اور غلط بتلایا ہے، فرماتے ہیں: إنّ هذه الرّواية وهمٌ وغلطٌ لم يعرج عليها أحد من العلماء (۴)

(۱) أحكام القرآن للجصّاص: ۱/ ۳۸۸، ذكر الحجج لإيقاع الثّلاث معًا.

(۲) سورۂ بقرہ، آیت: ۲۳۰۔

(۳) سنن الدّار قطني، رقم: ۳۱۴، كتاب الطّلاق.

(۴) الجوهر النّقي على هامش السّنن الكبرىٰ: ۷/ ۳۳۷، باب من جعل الثّلاث واحدة، مطبوعہ: ادارہ تالیفات اشرفیہ۔

لہٰذا صحیح، صریح، غیر مضطرب روایت کے خلاف اس روایت سے استدلال کرنا قطعاً درست نہیں ہے۔

(۲): ثانیاً اس لیے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت خود آپ کے فتوے کے بھی خلاف ہے، چنانچہ حضرت مجاہد، حضرت عطاء، سعید بن جبیر، مالک بن الحارث، عمرو بن دینار ان سب نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی نقل کیا ہے کہ مجلسِ واحد کی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں (۱)

اور یہ محدثین کا طے شدہ ضابطہ ہے کہ راوی اگر اپنی روایت کے خلاف فتویٰ دے تو وہ روایت نا قابلِ احتجاج ہوتی ہے۔ (۲)

(۳): ثالثاً: منسلکہ فتوے میں مذکورہ ابن عباس کی روایت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دورِ نبوی، عہد صدیقی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور میں ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھیں، بلکہ اس کا بالکل واضح اور بے غبار مطلب یہ ہے کہ اس وقت تین الفاظ سے تین طلاق دے کر اگر کوئی شخص کہتا تھا کہ دوسرے اور تیسرے سے میری نیت تاکید کی تھی تو غلبۂ صدق اور سلامت صدر کی بنا پر اس کا قول تسلیم کر کے ایک ہی طلاق کا حکم کیا جاتا تھا، لیکن جب بعد میں طلاق ثلاثہ کے واقعات بہ کثرت پیش آنے لگے، نیز صدق وسلامت روی بھی اس درجہ کی نہیں رہی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تاکید کی نیت کا اعتبار نہ کرتے ہوئے تین لفظ سے تین ہی طلاق کا حکم فرمایا۔ (۳)

(۴): نیز ان سب سے قطع نظر اگر غور کیا جائے تو یہ روایت خود جمہور کی دلیل ہے؛ کیوں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین الفاظ سے تین طلاقوں کے نفاذ کا فیصلہ فرمایا، تو اس وقت صحابۂ کرام کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، لیکن کسی ایک صحابی سے بھی اس فیصلہ پر نکیر منقول نہیں ہے، بل کہ سب نے اس کو تسلیم کیا اور سکوت فرمایا، جس کی وجہ سے اس بات پر صحابۂ کرام کا اجماع ہو گیا اور اہلِ سنت

(۱) سنن أبو داؤد: ۱/۳۰۶، باب بقية نسخ المراجعة بعد التّطليقات الثّلاث .

(۲) عمل الرّاوي بخلاف رواية بعد الرّواية ممّا هو خلاف يقين ، يسقط العمل به عندنا .
(قواعد في علوم الحديث للتّهانوي، ص:۲۰۲، أشرفي ديوبند)

(۳) مستفاد: شرح مسلم للنّووي: ۱/ ۴۷۸، باب طلاق الثّلاث على هامش المسلم .

والجماعت کے نزدیک اجماع صحابہ بھی حجت شرعیہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/۲/ ۱۴۳۶ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ محمد مصعب عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## تین طلاق کے بعد بھی شوہر اگر بیوی کے ساتھ لمبے عرصے تک رہتا رہا تو بیوی پر عدت لازم ہوگی یا نہیں؟

**سوال:** ﴿۵۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی؛ مگر سسرال والوں کے دباؤ اور اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے حرام سمجھتے ہوئے بھی ایک ساتھ رہتے رہے، پھر اُسے ندامت ہوئی اور اب وہ جائز طریقہ پر رہنا چاہتے ہیں، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس عورت کے لیے کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کے لیے عدت گذارنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو عدت کی ابتداء کب سے ہوگی؟

(۳۹۰/ د ۱۴۳۶ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق:**

صورتِ مذکورہ میں اگر شخص مذکور نے طلاق کو بالکل چھپایا نہیں؛ بل کہ براہِ راست کم از کم دو آدمیوں کو بتلایا تو عورت پر وقوعِ طلاق کے وقت سے عدت لازم ہوگی، اگر طلاق کے بعد سے لے کر اب تک تین مکمل ماہواری آچکی یا بہ وقتِ طلاق حاملہ تھی بعد میں بچے کی ولادت ہوئی تو اب شوہر سے علیحدگی اختیار کر کے عورت بلا مزید کوئی عدت گزارے دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے؛ لیکن اگر طلاق کو مکمل طور پر چھپایا کہ براہِ راست دو آدمیوں کو بھی نہیں بتلایا تو عدت علیحدگی اختیار کرنے

کے بعد سے شمار ہوگی۔ وفيها (الخانية) وأبَانَهَا ثـمّ أقامَ معها زمانًا ، إن مُقِرًّا بطلاقها تـنـقضي عدّتها لا إن مُنكرا، وفي أوّل طلاق جواهر الفتاویٰ: أبانها وأقام معها، فإن اشتَهَرَ طلاقها فيما بين النّاس تنقضي وإلّا لا، وكذا لو خَالعَهَا فإن بين النّاس وأشهد علٰى ذلك تـنـقـضي وإلّا لا، هوالصّحيح ، وكذا لو كتَمَ طلاقَها لَمْ تَنْقَضِ زجرًا له (الـدّرّ المختار) وفي ردّ المحتار تحت قولهٖ " و أشْهَدَ " أشارَ إلى أنّ الاشتهار لا بدّ أن يكون بإقراره بين النّاس لابمجرّد سَماعِهِم من غيرهٖ، وإلى أنّ إقراره عند رجُلينِ يكفي: فلايَلزَمُهُ الإقرارُ عندَ أكثرَ؛ فإنّ الشّهادة إشهارٌ كما قالوهُ في النّكاحِ إلخ (١) والحاصل أنّه إن كتمهُ ثمّ أخبر بهٖ بعد مدّة، فالفتوىٰ على أنّه لا يصدق في الإسناد؛ بـل تـجبُ العدّةُ مِن وقتِ الإقرارِ سواءٌ صدّقَتْهُ ، أو كذّبَتْهُ ، وإن لم يَكتُمهُ بل أقرّ بهٖ مِن وقتِ وُقُوعهٖ ، فإن لم يشتهرْ بين النّاس فكذٰلك ، وإن اشْتهرَ بينهُم تجبُ العدّةُ مِن حينِ وقوعهٖ وتنقضي إن كانَ زمانُها مَضَى إلخ(٢) كـمـا يستفاد من الفتاویٰ الرّحيمية (٣) ومن أحسن الفتاویٰ(٤) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۵/ ۱/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفر لہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## مغربی ممالک کی غیر اسلامی عدالتوں کا فسخ نکاح

محترم المقام قابلِ صد احترام حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم دارالعلوم دیوبند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(١) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ٢٠٤/٥، باب العدّة .
(٢) المصدر السّابق: ٢٠٥/٥ .
(٣) فتاویٰ رحیمیہ: ۵٦١/٢، باب العدّة ، ط: مکتبہ الاحسان۔
(٤) أحسن الفتاویٰ: ٤٢٨/٥ ، باب العدّة .

**سوال:** ﴿۵۸﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ حسبِ ذیل مسئلہ میں آپ کی گراں قدر شرعی رائے اور ہمارے حضرات اکابرین رحمۃ اللہ علیہم کے موقف کی روشنی میں رہنمائی کی ضرورت ہے، چوں کہ ہم امریکہ میں رہتے ہیں، امریکہ ایک ایسا ملک ہے، جہاں دنیا کے مختلف ممالک کے لوگ بڑی تعداد میں آ کر آباد ہوئے اور اب بھی آتے ہی جا رہے ہیں، یہاں کے دستور میں ہر ایک بالغ شہری کو اپنے پسندیدہ دین و مذہب پر عمل آوری کا مکمل دستوری و قانونی حق حاصل ہے، چنانچہ بہت سے لوگ اس پر عمل بھی کر رہے ہیں، برصغیر ہندو پاک سے آنے والے حضرات خصوصًا الحمدللہ اپنے اپنے مقامات پر دینی ادارے، مساجد اور مدارس عربیہ وعصریہ کے ذریعہ اپنے ایمان و دین کی حفاظت اور اپنی نسلوں کے دین وایمان کی حفاظت کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اب ایسے میں ایک مسئلہ ہمارے لیے غور طلب ہو گیا ہے وہ یہ کہ شرعًا چوں کہ کسی نکاح کے لیے کاغذی کارروائی کے اہتمام کی خاص ضرورت نہیں، صرف عاقدین کے ایجاب وقبول، شاہدین کی موجودگی، ایک گونہ مہر کا ذکر بھی ہو جائے تو شرعًا نکاح منعقد ہو جاتا ہے؛ لیکن پریشانی اس وقت پیش آتی ہے جب طرفین (شوہر و بیوی) میں جھگڑا یا نزاع پیدا ہو جاتا ہے اور اس وقت قانونی چارہ جوئی کا کسی کو حق حاصل نہیں ہوتا، اگر کوئی فریق کسی طرح عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے تب ثبوت پیش نہ کر سکنے کی وجہ سے جج صاحب اپنے علم و تجربہ اور قانونی دفعہ کے سہارے کوئی فیصلہ کر دیتے ہیں، ایسے میں یہاں کے اسلامی و دینی ادارے یا وہ حضرات جو نکاح میں قاضی یا قاری النکاح کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ عاقدین سے کہتے ہیں کہ پہلے قانونی رجسٹریشن کروالیں، اس میں صرف یہ ہوتا ہے کہ دونوں (عاقدین) جج کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، تو جج صرف یہ کہتا ہے کہ کیا آپ ان کی بیوی بننے اور آپ ان کے شوہر بننے کے لیے بہ خوشی راضی ہیں، وہ دونوں صرف ہاں کہتے ہیں، بس اس کے بعد ان کو ایک فارم دیا جاتا ہے کہ آپ اپنے مذہبی طریقہ پر نکاح کر کے اس فارم کی خانہ پری کرلیں اور ہمارے پاس داخل کر دیں، تو ہم آپ کو میریج سرٹیفکیٹ (شادی کا تصدیق نامہ) دے دیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے یہ نکاح حکومتی سطح پر بھی درج رجسٹر ہو جاتا ہے، تو آگے جھگڑوں میں ثبوت وسند بھی رہتی ہے، اور دینی واسلامی ادارے

بھی اپنے اپنے طور پر ایک وثیقہ دیتے ہیں، جس میں عاقدین کے نام عمر دستخط پتہ اور گواہوں کے نام، مقام نکاح وغیرہ جیسی چیزوں کا اندراج ہوتا ہے، گویا یہ ایک دینی یا اسلامی تصدیق نامہ ہے، یہ بھی ایک سند ہوتی ہے، جو آگے کام آسکتی ہے۔

اصل مسئلہ جو دریافت طلب ہے وہ یہ ہے کہ آگے جب عاقدین میں جھگڑا ہوتا ہے، تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی مدعیہ ہوتی ہے اور وہ قانونی عدالت تک پہنچ جاتی ہے اور اپنے نکاح کو فسخ کرنے کی درخواست دیتی ہے، ضروری اور ابتدائی کارروائیوں کے بعد عدالت مدعیٰ علیہ فریق ثانی لڑکے کے نام نوٹس جاری کرتی ہے، اب اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(۱) یہ کہ مدعیٰ علیہ لڑکا خود بھی حاضر عدالت ہو جاتا ہے اور وہ بھی مقدمہ کی پیروی کرتا ہے اور عدالت کی طرف سے کچھ کاغذات تیار کیے جاتے ہیں، جس میں قانونی اعتبار سے کچھ باتوں کی لڑکے کو ذمہ داری دی جاتی ہے، وہ مختلف ہوتی ہے، اور لڑکا، لڑکی کے مطالبۂ خلع یا طلاق کو کاغذات پر دستخط کر کے قبول کر لیتا ہے، کہ دونوں اس بات پر راضی رہتے ہیں کہ میں یہ کروں گی اور میں یہ کروں گا، اس روشنی میں عدالت دونوں میں علیحدگی کر دیتی ہے اور ایک کاغذ بہ طور سند دیا جاتا ہے کہ قانونی طور پر یہ دونوں میاں بیوی نہیں رہے۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا مذکورہ صورت میں غیر مسلم جج کا یہ علیحدہ کرنے کا عمل شرعًا بھی نافذ العمل ہے یا نہیں؟ـــــ یہ ذہن میں رہے کہ یہ جج کسی کا وکیل نہیں ہے، وہ صرف قانون نافذ کرنے کا حکم جاری کرنے والا ہے؛ چنانچہ اس کے فیصلہ سے کوئی ایک فریق مطمئن نہ ہو تو وہ دوسری عدالت میں بھی اس فیصلہ کے خلاف عرضی داخل کر سکتا ہے۔

(۲) اب اسی بحث کی دوسری صورت عرض ہے: مدعیہ (لڑکی بیوی) جب اس نے اپنے مدعیٰ علیہ (شوہر لڑکے) کے خلاف درخواست داخل کی اور جج سے یہ کہا کہ میرا نکاح توڑ دیا جائے، گویا فسخ کر دیا جائے، تو عدالت مدعیٰ علیہ کے نام نوٹس جاری کرتی ہے، اب مدعیٰ علیہ نہ وہ نوٹس لیتا ہے اور نہ ہی حاضر عدالت ہوتا ہے، چند نوٹسوں اور پیشیوں کے بعد عدالت قانون کی روشنی میں مدعیہ کو یہ کہتی ہے کہ ہم نے تم دونوں میں علیحدگی کر دی ہے، اب آج سے تم دونوں قانونًا میاں

بیوی نہیں رہے ایک کاغذ بہ طور سند دیا جاتا ہے، لڑکے نے نہ کسی کاغذ پر دستخط کیا نہ وصول کیا اور نہ ہی عدالت میں حاضر ہوا؛ بل کہ انکار کرتا ہے کہ میں نے تم کو چھوڑا ہی نہیں، تم بہ دستور میری بیوی باقی ہو۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ ایسی صورت میں جج کی طرف سے دیئے جانے والے قانونی علیحدگی کے کاغذ کی شرعًا کیا حیثیت ہے؟ کیا شرعًا اب دونوں میاں بیوی نہیں ہیں؟

مذکورہ صورتیں تو اس وقت کی ہیں جب کہ مدعیہ بیوی اور لڑکی ہے اور اگر اس کے برعکس تیسری صورت یہ پیش آتی ہے کہ دعویٰ لڑکے (شوہر) کی طرف سے داخل کیا جائے اور وہ مدعی ہو اور بیوی لڑکی مدعیٰ علیہا ہو، جس میں لڑکا اپنی طرف سے کسی وکیل کے ذریعہ عدالت میں یہ عرضی داخل کرتا ہے کہ میرا نکاح فلانہ سے توڑ دیا جائے، یعنی ہم دونوں میں علیحدگی کردی جائے، پھر جج کی طرف سے کاغذات تیار کیے جاتے ہیں اور اس میں دونوں کے درمیان علیحدگی کردینے کا ذکر ہوتا ہے لڑکے کے وکیل کی طرف سے جو عرضی عدالت میں داخل کی جاتی ہے، اس میں لڑکے کے دستخط ہوتے ہیں، یعنی اس کے علم میں بات رہتی ہے، اس میں کوئی وکیل صرف علیحدگی کا لفظ لکھتا ہے اور کبھی کوئی وکیل طلاق کا لفظ انگریزی کے ''DIVORCE'' بھی لکھتا ہے، اس پر لڑکے کے دستخط ہوتے ہیں اور وہ عرضی کے طور پر عدالت میں داخل کی جاتی ہے، آگے جج نے اسی بنیاد پر علیحدگی یا طلاق کا فیصلہ کردیا اب ایسے میں شرعًا اس علیحدگی کا کیا حکم ہے؟ کیا اس کو طلاق تصور کیا جائے گا یا نہیں؟ نکاح باقی ہے یا ختم ہوگیا، یہاں بھی یہ بات ذہن میں رہے کہ جج کسی کا وکیل نہیں، وہ صرف قانونی آدمی ہے، وہ قانونی طور پر فیصلہ صادر کرتا ہے، کیا شرعًا یہ قابلِ عمل ہے یا نہیں؟

یہاں بعض بعض مقامات پر برصغیر ہندو پاک سے آئے ہوئے دیوبندی مکتبِ فکر کے حامل حضرات علمائے کرام نے مجالسِ شرعیہ قائم کی ہیں، ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ شرعی پنچایت کی ہوگی اور ان حضرات نے حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کی ''الحیلة النّاجزة'' کی روشنی میں بعض فیصلے بھی کیے ہیں؛ لیکن مذکورہ دونوں صورتوں میں یہ حضراتِ علمائے کرام بھی مختلف ہوگئے، بعضوں نے لڑکا جب مدعی ہو، تو اس صورت میں اس کو طلاق پر محمول کیا ہے اور بعضوں نے اس سے یوں کہہ کر

انکار کیا ہے کہ چوں کہ جج کسی کا وکیل نہیں؛ اس لیے اس سے جو یہ کہا گیا کہ تم میرا نکاح توڑ دو، اس کے معنیٰ شرعی نکاح توڑنے کے نہیں؛ بل کہ صرف قانونی نکاح مراد ہے، اس کے باوجود وہ اس کی بیوی باقی ہے؛ اس لیے اب اسلامی علیحدگی کے بغیر وہ عورت اس کے نکاح سے خارج نہیں ہوگی، امید ہے کہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم اس طویل عریضہ پر گرانی محسوس نہ فرمائیں گے اور مفصل جواب سے ممنون ومشکور فرمائیں گے۔ فقط والسلام

یکے از خدّام دار العلوم شکاگو

محمد عبدالحلیم عفی عنہٗ

۳؍ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ (۳۹۴/د ۱۴۳۶ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

(۱) غیر مسلم جج کے نکاح فسخ کرنے کی وجہ سے شرعاً نکاح ختم نہیں ہوتا؛ **لأنّ الکافر لیس بأھل للقضاء علی المسلم کما ھو مصرح في جمیع کتب المذھب**؛ (۱) بل کہ شوہر کا طلاق دینا یا باہمی رضامندی سے خلع کرنا ضروری ہے؛ لہٰذا جس طرح نکاح کا رجسٹریشن کرنے کے بعد شرعی طور پر نکاح کیا گیا تھا، اسی طرح فسخ کے کاغذات تیار ہونے کے بعد شرعاً نکاح کو ختم کرنے کے لیے شوہر کا طلاق دینا یا خلع کرنا ضروری ہے۔

(۲) اس صورت میں بھی جج کے نکاح فسخ کرنے سے نکاح ختم نہیں ہوگا، اس کا حل تو یہی ہوسکتا ہے کہ کوئی شرعی پنچایت مقرر کر کے، اس میں معاملہ رکھا جائے اور ''الحیلۃ النّاجزۃ'' میں تحریر کردہ اصول کے مطابق اگر اسباب فسخ میں سے کسی سبب کا تحقق ہو جائے اور شرعی پنچایت

(۱)......(الف) راجع الحیلۃ النّاجزۃ، الجزء الثّاني، ص:۶۰، بہ عنوان: مسلمان مجسٹریٹ کا فیصلہ کرنا۔ مطبوعۃ: مکتبۃ رضي، دیوبند.

(ب) وفي المبسوط للسّرخسيّ: ............ فقول الکافر علی المسلم لیس بحُجّۃ.

(۱۵۸/۷، کتاب العتاق، باب بیع أمّھات الأولاد، ط: بیروت)

نکاح فسخ کردے، تو اس صورت میں رشتۂ نکاح ختم ہو جائے گا۔(۱)

(۳) اگر شوہر ڈائیورس یا اس کے ہم معنی ایسے الفاظ لکھ دے، جو طلاق سے کنایہ ہو سکیں اور پھر اس درخواست کے نتیجے میں جج زوجین کے درمیان تفریق کردے، تو شرعاً اس سے علیحدگی ہو جائے گی؛ البتہ کارروائی مکمل ہونے کے بعد بہتر ہے کہ شوہر طلاق کے الفاظ بھی زبان سے کہہ دے۔

نوٹ:(الف) شوہر اگر جج کو پیش کردہ درخواست میں یہ الفاظ لکھ دے ''میں نے فلانۃ بنت فلاں کو طلاق دے دی؛ لہٰذا میری اس سے علیحدگی کر دی جائے'' تو کیا عدالتی قانون کی رو سے اس میں کوئی رکاوٹ ہے؟؛ کیوں کہ اس صورت میں طلاق کی وجہ سے شرعاً نکاح بھی ختم ہو جائے گا اور علیحدگی کا سرٹیفکیٹ بھی اسے کورٹ سے مل جائے گا۔

(ب) یہ بات صحیح ہے کہ جج مدعی کا وکیل نہیں ہوتا اور نہ ہی وکالۃً تفریق کا کام کرتا ہے؛ بل کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق اپنے قوانین کے دائرے میں فیصلہ کرتا ہے، نیز اگر وکیل مان بھی لیا جائے تو شوہر نے علیحدگی کی درخواست میں اگر کچھ مطالبے اور شرائط لکھی ہوں گی اور جج نے سب کو نافذ نہیں کیا یا ردّ و بدل کر کے نافذ کیا، تو وکیل کے منشأ مؤکل کے خلاف تصرف کرنے کی وجہ سے

(۱) حضرت تھانویؒ ''الحیلة النّاجزة'' میں تحریر فرماتے ہیں:

اور جس جگہ مسلمان حاکم موجود نہ ہو یا مسلمان حاکم کی عدالت میں مقدمہ لے جانے کا قانوناً اختیار نہ ہو یا مسلمان حاکم شرعی قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرتا ہو، تو ایسی صورت میں فقہ حنفی کے اعتبار سے تو عورت کی علیحدگی کے لیے شوہر کی طلاق وغیرہ کے بغیر کوئی صورت نہیں، ایسی صورت میں جہاں تک ہو سکے خلع وغیرہ کی کوشش کی جائے..........اور اگر کسی عورت کا شوہر کسی طریقے سے نہ مانے یا شوہر کے مجنون یا لاپتہ (مفقود الخبر) ہونے کی وجہ سے خلع وغیرہ ممکن نہ ہو اور عورت کو صبر کرنے کی ہمت نہ ہو تو مجبوراً مذہب مالکیہ کے مطابق دین دار مسلمانوں کی پنچایت میں معاملہ پیش کرنے کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ مالکیہ کے مذہب میں قاضی وغیرہ نہ ہونے کی حالت میں یہ صورت بھی جائز ہے کہ محلّہ کے دین دار مسلمانوں کی ایک جماعت جو کہ کم از کم تین افراد پر مشتمل ہو، پنچایت مقرر کرے اور واقعہ کی تحقیق کر کے شریعت کے موافق حکم کر دے، تو یہ فیصلہ بھی فیصلۂ قاضی کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔اھ (الحیلة النّاجزة، ص: ۶۲)

یہ تفریق غیر معتبر ہوگی،(۱) پس جج کا اپنا فیصلہ رہ جائے گا اور وہ شرعاً غیر معتبر ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۲/ ۵/ ۱۴۳۶ھ مطابق: ۳/ ۳/ ۲۰۱۵ء

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## نابالغ بیٹے کے لیے تیار کردہ کپڑے دوسرے کو پہنانا

**سوال:** ﴿۵۹﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر کسی کے دو بیٹے ہیں، جو دونوں نابالغ ہیں، کیا ان کے والد یا ماں اپنے ایک نابالغ بیٹے کے کپڑے چھوٹے بیٹے کو پہنا سکتے ہیں؟ یا کسی دوسرے بچے کو اس کے کپڑے دے سکتے ہیں؟　　(۶۸۴/د ۱۴۳۱ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق:**

کپڑا بنوا کر نابالغ کو صرف پہننے کے لیے دیا ہے تو اس کپڑے کو کسی دوسرے بیٹے کو دے سکتے ہیں؛ لیکن جب صرف پہننے کے لیے نہ دیا گیا ہو؛ بلکہ اسی کے لیے بنوایا گیا اور اسے دے دیا گیا تو نابالغ بچہ اس کا مالک ہوگیا، اب ماں باپ کو یہ اختیار نہیں کہ اپنے کسی دوسرے بیٹے کو دیں؛ بلکہ اسی بیٹے کے کام میں لانا ضروری ہے جس کو مالک بنایا گیا ہے۔(۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

---

(۱) إذا قیدت الوکالة بقید فلیس للوکیل مخالفته إلخ .

(شرح المجلّة: ۲/۴۰۴، الفصل الثّاني في الوکالة بالشّراء)

وهٰکذا انظر: ردّ المحتار علی الدّرّ المختار. (۳/۱۸۹، کتاب الزّکاة)

(۲) ...... (الف) وَلو قال هذا الشّيء، لولدي الصّغیر فلان جاز وتمّ من غیر قبول کذا في التّاتارخانیة. (الفتاوی الهندیّة: ۴/۳۷۶، الباب الأوّل في تفسیر الهبة ورکنها إلخ) ==

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ،

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## زانی پر تعزیراً مالی جرمانہ عائد کرنے کا حکم

محترم القدر مفتیانِ کرام دارالافتاء دارالعلوم دیوبند۔ (یوپی)

**سوال:** ﴿۶۰﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مفتیان عظام درج ذیل مسئلہ میں:

قرآن وسنت کی روشنی میں مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شادی شدہ عورت کے کسی غیر مرد (غیر شادی شدہ) کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے، کچھ عرصے کے بعد اُن کا سارا راز فاش ہوگیا اُن کے سارے پوشیدہ راز اور تعلقات کھل گئے، مرد کی موبائل سم عورت کے پاس پکڑی گئی، اُس کے بعد گاؤں کے معزز اور باشعور اشخاص نے اُس غیر مرد کے وارثین کو بلایا اُس لڑکے نے اپنی حرکات کا اقرار برادری کے سامنے کیا، اب چوں کہ ہم ہندوستان میں رہنے والے ہیں، یہ دارالحرب ہے، دارالاسلام نہیں، یہاں کوئی بھی کسی کو شرعی سزا نہیں دے سکتا ہے، مجبوری ہے، ان حالات کے پیش نظر برادری کے معزز اشخاص نے عبرت کے طور پر اُس مرد کو کچھ اشیاء اور پیسے کی شکل میں سزا مقرر کی، جو اُس نے عورت کے خاوند (شوہر) کو بہ طور عز تانہ دینے کا فیصلہ کیا، پیسے وغیرہ کی ادائیگی کے بعد عورت کا شوہر اُس پیسے یا اشیاء کو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے، یا نہیں؟ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ ذاتی

== (ب) حضرت اقدس تھانویؒ فرماتے ہیں: اپنے نابالغ لڑکے کے لیے کپڑے بنوائے تو وہ لڑکا مالک ہوگیا، یا نابالغ لڑکی کے لیے زیور گہنا بنوایا تو وہ لڑکی اس کی مالک ہوگئی، اب ان کپڑوں کا یا اس زیور کا کسی اور لڑکا لڑکی کو دینا درست نہیں، جس کے لیے بنوائے ہیں اسی کو دے وے؛ البتہ اگر بنانے کے وقت صاف کہہ دیا کہ یہ میری ہی چیز ہے مانگے کے طور پر دیتا ہوں تو بنوانے والے کی رہے گی، اکثر دستور ہے کہ بڑی بہنیں بعض وقت چھوٹی نابالغ بہنوں سے یا خود ماں اپنی لڑکی سے دوپٹہ وغیرہ کچھ مانگ لیتی ہیں تو ان کی چیز کا ذرا دیر کے لیے مانگ لینا بھی درست نہیں۔ (اختری بہشتی زیور: ۵/۴۶)

استعمال میں نہیں لاسکتا ہے؛ بل کہ کشمیر میں جو پانی کا سیلاب آیا ہے، وہاں کے لیے وقف کرے، کچھ کہتے ہیں کہ یہ اُس کی عزت کا مسئلہ ہے، عزت کی قیمت کوئی نہیں دے سکتا ہے؛ اس لیے وہ اپنے استعمال میں رکھ سکتا ہے؛ لیکن اُس بدمعاش مرد سے وصولی کرلی گئی ہے، برادری کے معزز اشخاص کا کہنا ہے کہ اُسے جسمانی سزا کے بدلے مالی سزا ہی بہتر ہے؛ تاکہ قانون کی پکڑ دھکڑ سے بھی بچیں، اور عبرت بھی ہوجائے؛ تاکہ گاؤں میں بستیوں میں اس قسم کے بدمعاشوں کی روک تھام ہوجائے۔ ورنہ کل ایسے جانور اور درندے راستوں میں کسی کی ماں بہن کی عزت لوٹیں گے۔

لہٰذا بہ ذریعہ درخواست التماس ہے کہ اس مسئلہ اور اس پیسے کے صرف کے بارے میں تفصیلات کے ساتھ ہمیں روشناس فرمایا جاوے، اگر کشمیر سیلاب زدگان کی امداد کے لیے دیا جائے تو بھی لکھیں عین خدمت امت ہوگی۔ (۲۰۴/ د ۱۴۳۶ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

صورتِ مسئولہ میں جس شخص نے ایسی قبیح، گھناؤنی حرکت کی ہے، بلا شبہ اس نے بہت بڑا جرم اور گناہِ عظیم کیا ہے(۱) ایسے شخص کے لیے قرآن وحدیث میں بڑی سخت سزا اور وعید وارد

---

(۱)......(الف) قال تعالیٰ : ﴿وَلَا تَقْرَبُوْا الزِّنَا اِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلًا﴾

(سورۂ اسراء، آیت:۳۲)

وفي تفسير المظهري: إنّه أي الزّنا كان فاحشة فعلة ظاهرة القبح زائدته ، وساء سبيلاً أي بئس طريقًا طريقه ، وهو الغصب على الأبضاع المؤدي إلى قطع الأنساب وهيجان الفتن إلخ . (التّفسير المظهري: ۵/۴۳۷، ط: مكتبة الرّشيدية ، باكستان)

(ب): عن أبي هريرة قال قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم : إذا زنى الرّجل خرج منه الإيمان ، كان عليه كالظّلّة ، فإذا انقطع رجع إليه الإيمان .

ترجمہ: جب بندہ زنا کرتا ہے تو ایمان اس سے نکل جاتا ہے اور اس کے سر پر سائبان کی طرح معلق ہوجاتا ہے، پھر جب وہ اس معصیت سے فارغ ہوجاتا ہے تو ایمان اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔

(أبو داؤد، رقم: ۴۶۹۰، كتاب السّنّة ، باب الدّليل على زيادة الإيمان ونقصانه) ==

ہوئی ہے، (۱) یہ شخص خدا کا مجرم ہے، جب تک سچی توبہ کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی نہ مانگ لے، یہ گناہ معاف ہونے والا نہیں ہے، نیز جب تک وہ صدق دل سے توبہ نہ کر لے برادری والوں کے لیے جائز ہے کہ بہ طور تنبیہ اس کا مقاطعہ اور بائیکاٹ کر دیں؛(۲) لیکن چوں کہ مالی جرمانہ عائد کر کے تعزیراً سزا دینا اسلام میں جائز نہیں ہے۔ قال في الدّرّ: لا بأخذ مال في المذهب ، وقال الشّامي : و الحاصل أنّ المذهب عدم التّعزير بأخذ المال (۳) نیز دیگر تعزیری سزائیں نافذ کرنے کا اختیار بھی صرف حاکم وقت کو ہے، عوام کو یہ حق حاصل نہیں ہے؛(۴) اس لیے صورتِ

== وفي الصّحيحين عن أبي هريرة قال قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم: لايزني الزّاني حين يزني وهو مؤمن إلخ. ترجمہ: زنا کرنے والا جب زنا کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا۔ (البخاري في كتاب الحدود ، رقم: ٦٧٧٢، باب ما يحذر من الحدود ، ومسلم في كتاب الإيمان ، باب بيان نقصان الإيمان بالمعاصي إلخ)

(۱)......(الف) ﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِئَةَ جَلْدَةٍ﴾ ترجمہ: زانی اور زانیہ ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ (سورۂ نور، آیت:۲)

(ب) وعن سمرة بن جندبؓ في حديث طويل.......حتّى أتينا إلى ثقب مثل التّنّور أعلاه ضيق ، وأسفله واسع ، تتوقد تحته نار ، فإذا ارتفعت ارتفعوا حتّى كاد أن يخرجوا منها، وإذ خمدت رجعوا فيها ، وفيها رجال ونساء عراة فقلت: ما هٰذا؟ ............ والّذي رأيته في الثّقب فهم الزّناة . (مشكاة المصابيح، ص: ٥٥، كتاب الرّؤيا)

(۲)......(الف) قال البخاري باب " ما يجوز من الهِجرانِ لمن عصى" قال المهلب: غرض البخاري من هٰذا الباب أن يبين صفة الهجران الجائز وأنّ ذلك متنوع على قدر الإجرام فمن كان جرمه كثيرًا فينبغي هجرانه إلخ .

(عمدة القاري: ٢٢/ ١٤٤، باب هل يزور صاحبه كلّ يوم أو بكرة ، ط: بيروت)

(ب) وقال التّهانوي في بيان القرآن : کسی شخص کو بہ وجہ ارتکابِ امرِ خلافِ شرع کے یہ سزا دینا کہ اس سے ترک سلام وکلام کر دیں جائز ہے۔ (بیان القرآن: ۲/۱۶۳، سورۂ توبہ، ط: فیصل)

(۳) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ٦/١٠٥-١٠٦۔

(۴) ............ لكلّ مسلم إقامة التّعزير حال مباشرة المعصية وأمّا بعد المباشرة فليس ذلك لغير الحاكم . (الفتاوىٰ الهندية: ٢/ ١٦٧، فصل في التّعزير)

مسئولہ میں اس شخص پر بہ طور "عزتانہ" مالی جرمانہ عائد کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ زنا کر کے اس شخص نے خالص حق اللہ کو پامال کیا ہے، جس پر کسی قسم کے مال کا مطالبہ کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے۔ **قال في البحر : لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي** ؛(۱) البتہ چونکہ اس میں ضمناً شوہر کی ہتک حرمت بھی ہے؛ اس لیے اسے چاہیے کہ شوہر سے معافی مانگ لے اس لیے بہ طور جرمانہ لی ہوئی رقم اور دیگر اشیاء اس شخص کو واپس کر دینا ضروری ہے، نہ شوہر اُن چیزوں کو استعمال کر سکتا ہے اور نہ فساد زدگان کو وہ رقم دی جا سکتی ہے؛ کیوں کہ فساد زدگان یقیناً امداد کے مستحق ہیں لیکن جسے دینا ہو اپنی خوشی اور مرضی سے دے، کسی پر دباؤ ڈال کر یا جرمانہ کے طور پر رقم دلوانا جائز نہیں ہے حدیث شریف میں ہے: **ألا لا يحلّ مال امرئ إلّا بطيب نفس منه.** (۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۸/۲/۱۴۳۶ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## نامعلوم الاب بچی کی نسبت بہ وقت ضرورت پرورش کنندہ کی جانب کرنا

محترم مفتی صاحب!　　　سلام مسنون!

امید کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

**سوال:** ﴿۶۱﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

زید اسپتال میں ہوئی ایک نوزائیدہ بچی کو گود لینا چاہتا ہے، اسے اس کی والدہ چھوڑ کر چلی گئی ہے،

(۱) البحر الرّائق: ۵/۶۸، كتاب الحدود ، باب في التّعزير .

(۲) عن أبي حرّة الرّقاشيّ عن عمّه قال قال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم ألا لا تظلموا ألا لا يحلّ مال امرئ إلّا بطيب نفس منه .

(مشكاة المصابيح ، ص:۲۵۵، كتاب الغصب والعارية)

اور اس کے والد کا پتہ نہیں، گمان غالب ہے کہ وہ بچی ناجائز رشتے سے تولد ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں کیا زید اسے اپنا نام والد کی جگہ پر دے سکتا ہے؟ کہ سرکاری کام کاج میں ولدیت کی ضرورت ہوتی ہے، دیگر یہ کہ جب بچی جوان ہوگی اور شادی بیاہ کا موقع آئے گا تو اپنے ناجائز پیدائش کو لے کر بچی کو بہت سی پریشانیوں سے گذرنا ہوگا اس میں بے عزتی اور طعن وتشنیع بھی ہوسکتی ہے، پھر اس بے قصور بچی کو بے بیاہتا رہنے کی بھی سزا مل سکتی ہے، اور والد کا نام یا ولدیت ملنے پر وہ بدنامی اور دیگر پریشانیوں سے محفوظ رہے گی۔ امید ہے کہ جلد جواب ارسال فرمائیں گے۔

(۵۰۷/د ۱۴۳۵ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

کسی اجنبی بچہ کو گود لینے سے وہ بچہ گود لینے والے کا حقیقۃً بیٹا یا بیٹی نہیں ہوجاتا؛ چنانچہ وراثت میں ایک دوسرے کے حق دار نہیں ہوتے، اسی طرح بالغ ہونے کے بعد پردہ کے احکام بھی واجب ہوتے ہیں، نیز اس کی ولدیت بھی گود لینے والے کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی (۱) اور حدیث میں کسی بچہ کو غیر باپ کی طرف منسوب کرنے سے ممانعت وارد ہوئی ہے (۲) پس صورتِ مسئولہ میں اجنبی نوزائیدہ بچی کو گود لینا اور اس کی تعلیم وتربیت کرنا، بالغ ہونے کے بعد شادی بیاہ کی ذمہ داری پوری کرنا بہت مستحسن فعل ہے، ان شاء اللہ اس پر ثواب ملے گا؛ لیکن یہ بچی آپ کے ترکہ میں حصہ دار نہ ہوگی، جو کچھ زندگی

---

(۱)......(الف) ﴿وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَ كُمْ اَبْنَآءَ كُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِيْ السَّبِيْلَ﴾ (سورۂ احزاب، آیت:۴)

(ب)........... **الثّاني أنّ الدعيّ والمتبنّى لا يلحق في الأحكام بالابن فلا يستحقّ الميراث ولا يرث عنه المدّعي، ولا يحرم حليلته بعد الطّلاق والعدّة على ذلك المدعي ولا عكسه. (أحكام القرآن للتهانويؒ: ۳/۲۹۱)**

**(۲) من ادّعى إلى غير أبيه وهو يعلم أنّه غير أبيه فالجنّة عليه حرام. (أخرجه مسلم، رقم: ۲۳۱، باب بيان حال إيمان من رغب عن أبيه وهو يعلم)**

میں آپ اسے دے دیں گے یا مرنے کے بعد کے لیے ایک تہائی کے اندر وصیت کر دیں گے وہ اسے ملے گا۔ بالغ ہونے کے بعد اس سے پردہ کرنا آپ کے لیے ضروری اور واجب ہوگا اور اس کے شوہر سے آپ کی بیوی کو پردہ کرنا ہوگا۔ رہی کاغذات میں ولدیت کے طور پر نام لکھ دینے کی بات تو جب اس کے والد کا اَتا پتا نہیں ہے تو مجازاً آپ اسے بیٹی کہہ سکتے ہیں اور سوال میں مذکور مصلحت کے پیش نظر کاغذات میں اپنی طرف اس کی ولدیت منسوب کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے (۱) تا کہ اس کی حالت پردہ خفا میں رہے، اور لوگوں کے سامنے اسے ذلت اور سبکی نہ اٹھانی پڑے۔ حدیث میں ہے جو شخص کسی کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی دنیا اور آخرت میں فرمائیں گے۔ **من ستر مسلمًا ستره اللّٰه في الدّنيا و الآخرة** (۲) حاصل یہ کہ پردہ پوشی کی نیت سے ولدیت میں اپنا نام لکھنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/ ۵/ ۱۴۳۵ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

**(۱) يستفاد ممّا في أحكام القرآن و ظاهر الآية حرمة تعمّد دعوة الإنسان لغير أبيه ، ولعلّ ذلك فيما إذا كانت الدّعوة على الوجه الّذي كان في الجاهليّة و أمّا إذا لم تكن كذلك كما إذا يقول الكبير للصّغير على سبيل التّحنّن والشّفقة يا ابني وكثيرًا ما يقع ذلك ، فالظّاهر علم الحرمة إلخ . (۲۹۲/۳، ط: كراتشي)**

**(۲) أخرجه ابن ماجة ، رقم: ۲۵۴۴، باب : السّتر على المؤمن ودفع الحدود بالشّبهات .**

# کاروبار، شراکت، ہبہ اور وقف وغیرہ

## قسطوں پر خرید وفروخت اور انشورنس کی ایک خاص شکل

**سوال:** ﴿۶۲﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں:

میں گاڑیوں کا کاروبار قسطوں پر کرتا ہوں یعنی (۱) گاڑی کی کل قیمت پانچ لاکھ روپے جس میں ایڈوانس ایک لاکھ روپیہ باقی رقم (چار لاکھ روپے پر 100 فیصد یا 70 فیصد) کے حساب سے منافع لگا کر اس کی کل قیمت نو لاکھ روپیہ ہو جاتی ہے۔ اب خریدار یہ رقم ماہوار قسطوں پر یعنی دس ہزار/ بیس ہزار کے حساب سے ادا کرتے ہیں۔ گاڑی کی چابی اور گاڑی چلانے کے کاغذات ہم ان کے حوالے کرتے ہیں، مالکانہ حقوق کے کاغذات اپنے پاس رکھتے ہیں کہ جب قسطیں ختم ہوں گی اس وقت کاغذات دیتے ہیں۔

(۲) (اور ہم یہ معاملہ بھی کرتے ہیں کہ) اس دوران گاڑی گم ہو جائے یا جل جائے تو اس کی دی ہوئی رقم اور میری بقیہ قسطیں اس پر ختم ہو جاتی ہیں۔ کیا شرعی لحاظ سے یہ کاروبار درست ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اس کام کو شرعی طور پر کرنے کا طریقہ بتائیں؟

(۱۹۲۷/ د ۱۴۳۱ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق:**

(۱) اپنے نفع کی مقدار اصل رقم (قیمت) میں شامل کر کے مجموعی رقم کو قیمت ٹھہراتے ہوں اور

اس مجموعی رقم پر دوسرے شخص کے ہاتھ فروختگی کا معاملہ کرتے ہوں تو یہ شکل جائز ہے (۱) اور پھر اس کی قسطیں مقرر کرنا بھی جائز ہے (۲)

(۲) اس طرح کی گارنٹی کی شرط لگانا جائز نہیں، (۳) اس جز کو اپنے معاملہ سے خارج کردیں۔ خریدار گاڑی کا مالک ہوگیا اور آپ کی بقایا رقم کا وہ مقروض ہے، گاڑی کا نقصان وہ خود برداشت کرے گا اور آپ کے قرض کی ادائیگی اسے بہر حال کرنی ہوگی، اسی نقطۂ نظر سے معاملہ کرنا درست ہے، ضمانت کی جو صورت آپ نے لکھی وہ ناجائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند (۱۲/۴/۱۴۳۱ھ)

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## زمین کا کاروبار کرنے والی ایک کمپنی میں شامل ہونے کا حکم

سوال: ﴿۶۳﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں:

فورسیٹ کمپنی جس کا نام ''بی اے سی ایل لمیٹیڈ'' ہے، جو کہ بنجر وغیر آباد زمین قابلِ کاشت بناتی ہے، وہ اپنے خریدار سے قسطوں میں اور کبھی یکمشت رقم وصول کرتی ہے، اور مدت متعین کرتی ہے، مثلاً پانچ سال، چھ سال، دس سال، بیس سال وغیرہ، جمع کنندہ نے قسط میں ۱۰۰۰ روپے دے دیئے، اور مدت مثلاً ساڑھے پانچ سال ہے تو مذکورہ مدت میں رقم جمع ۶۶۰۰۰ ہوجاتی ہے، تو نصف سال گزرنے پر کمپنی پورے ہندوستان میں کسی بھی جگہ ایک ہزار گز کا پلاٹ خریدار کے نام بہ صورت

(۱) المرابحة بيع بمثل الثّمن الأوّل و زيادة ربح ............ والكلّ جائز ، كذا في المحيط .

(الفتاویٰ الهندية: ۱۶۰/۳ ، كتاب البيوع ، الباب الرّابع عشر في المرابحة والتّولية)

(۲) البيع مع تأجيل الثّمن وتقسيطه صحيح ، يلزم أن تكون المدّة معلومة في البيع بالتّأجيل والتّقسيط . (شرح المجلّة: ۱۲۵/۱ ، المادّة: ۲۴۵-۲۴۶ ، ط: كوئتة)

(۳) لا (يصحّ) بيع بشرط ............ لا يقتضيه العقد ولا يلائمه وفيه نفع لأحدهما .

(الدّرّ مع الرّدّ: ۲۸۱/۷-۲۸۲ ، مطلب في الشّرط الفاسد)

اقرار نامہ کر دیتی ہے، اور جب مکمل رقم جمع ہوجاتی ہے اگر مالک پلاٹ کو رکھنا چاہتا ہے تو موجودہ قیمت لگا کر رکھ سکتا ہے، اور باقی رقم قسطوں میں ہی ادا کرسکتا ہے، اور اگر پلاٹ نہیں رکھنا چاہتا تو خریدار کو ۹۰۹۰۰ روپئے جو کہ پہلے سے متعین تھے مل جاتے ہیں کمپنی اس کام کے لیے اپنے ایجنٹ کو ۱۵% فیصد دیتی ہے، تو اس کمپنی میں شرکت کا کیا حکم ہے اس میں رقم لگانا، اجرت لینا اور ایجنٹ بننا جائز ہے یا نہیں؟ شریعت مطہرہ کی روشنی میں وضاحت کے ساتھ تحریر فرمائیں؛ کیوں کہ اس میں بہت سارے مسلمان کام کر رہے ہیں۔

برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب دیں۔ فقط (۲۹۰/د ۱۴۳۳ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

استفتاء میں مذکور تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے کے تین اہم اجزاء ہیں :

(۱): کمپنی غیر متعین طور پر ہندوستان میں کسی بھی جگہ زمین کی خریداری پر خریدار سے رقم قسطوار وصول کرتی ہے۔

(۲): تمام قسطیں جمع ہونے کے بعد خریدار کے نام کردہ زمین کی موجودہ قیمت لگا کر مابقیہ رقم خریدار سے وصول کی جاتی ہے، اگر وہ زمین لینا چاہے۔

(۳): ورنہ اُسے ۹۰۹۰۰ روپئے ملیں گے، جب کہ اس نے صرف ۶۶۰۰۰ روپئے جمع کیا ہے ـــــ تینوں چیزیں شرعاً ناجائز ہیں، اوّل ودوم تو اس لیے کہ بیع کی صحت کے لیے شرعاً مبیع (زمین) وثمن (قیمت) کا متعین اور معلوم ہونا ضروری ہے۔ **منها (من شرائط صحّة العقد)............ معلوميّة المبيع ومعلوميّة الثّمن بما يرفع المنازعة** (۱)

اور صورتِ مذکورہ میں دونوں مجہول ہیں، اور تیسری چیز تو صریح سود ہے؛ اس لیے کہ خریدار نے جمع کیا صرف ۶۶۰۰۰ روپئے اور اسے ۹۰۹۰۰ روپئے مل رہے ہیں (۲) الغرض کمپنی کا یہ معاملہ صحتِ

(۱) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۷/ ۱۵۔

(۲) **هو (الرّبا) ...... شرعًا : فضل ...... خال عن عوض...... مشروط ...... لأحد المتعاقدين ...... في المعاوضة . (الدّر المختار مع ردّ المحتار: ۷/ ۳۹۸-۴۰۱)**

عقد کے لیے مطلوبہ شرائط نہ پائے جانے کی وجہ سے ناجائز اور باطل ہے؛ اس لیے اس کمپنی میں شرکت کرنا یا اس کا ایجنٹ بننا شرعاً جائز نہیں ہے(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

املاہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۹/صفر المظفر/۱۴۳۳ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## کمرشیل بلڈنگ میں سرمایہ کاری کی ایک صورت کا حکم

**سوال:** ﴿۶۴﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں:

میں کمرشیل (تجارتی) بلڈنگ میں سرمایہ کاری کرنا چاہتا تھا جو کہ نوئیڈا رگڑ گاؤں کی مشہور انفر اسٹرکچر کمپنی کے ذریعہ تعمیر کی جائے گی، ابھی سے انھوں نے زمین خرید لی ہے اور تعمیر جلد ہی شروع ہوگی جو کہ ان کے اندازہ کے مطابق اگلے تین یا چار سال میں مکمل ہوگی؛ چونکہ ان کو تعمیر کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے اس لیے انھوں نے دکان/آفس کی جگہوں کی ابھی سے بکنگ شروع کردی ہے اور جگہ کو بک کرنے کے لیے اس جگہ کی ساٹھ سے اسی فیصد قیمت ادا کرنی ہوگی، اور وہ لوگ ہر سال ماہانہ بنیاد پر بطور منافع کے بارہ فیصد واپس دیں گے یہاں تک کہ وہ قبضہ میں دینے کے لیے تیار ہوجائے۔ کیا ان پیسوں کو لینا جائز ہے؟ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر کوئی یہ ماہانہ منافع نہیں لینا چاہتا ہے تو وہ لوگ بذات خود قیمت میں کچھ چھوٹ دیتے ہیں، لیکن وہ لوگ منافع کی ادائیگی کے لیے پروجیکٹ کی تکمیل کے متوقع مہینہ میں چھوٹ کی رقم کو کل رقم کے ساٹھ یا پچہتر فیصد پر شمار کرتے ہیں مفتی صاحب میں نے پہلے ہی ایک آفس بک کی ہے لیکن مجھ کو اپنی پسند کا انتخاب کرنا ہے۔ براہ کرم مجھ کو جلد شرعی راستہ بتائیں۔ والسلام

(۲۳۰/ د۱۴۳۳ھ)

(۱) لعن رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم آکل الرّبوا وموکلہ وشاھدیہ وکاتبہ.

(أخرجہ التّرمذی: ۲۰۶/۱، کتاب البیوع، باب ما جاء في أکل الرّبا)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

پہلی صورت جس میں کمپنی شروع میں ہی ساٹھ یا اسّی فیصد رقم جمع کرنے پر ہر سال ماہانہ بنیاد پر بہ طور منافع کے بارہ فیصد واپس کرتی ہے، اس کا لینا سود ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، گویا کمپنی والے اپنے پاس رکھی ہوئی رقم پر بارہ فیصد نفع دیتے ہیں؛(۱) البتہ دوسری صورت جس میں کمپنی والے نفع نہ لینے کی صورت میں پوری زمین کی قیمت اپنی طرف سے فیصد کے حساب سے کم کر دیتے ہیں یہ جائز ہے، (۲) یہ حَطّ عن الثّمن (بائع اپنی طرف سے بہ خوشی مقررہ قیمت میں کچھ کمی کر دے) کے قبیل سے ہے، اس میں کمپنی والوں کو اختیار ہے کہ جتنی بھی قیمت وہ کم کر دیں اور اس کا جو بھی فیصد متعین کر دیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

املاہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۸/صفر المظفر ۱۴۳۳ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## رسک منتقل ہونے سے پہلے شیئرز کو آگے فروخت کرنے کا حکم

**سوال:** ﴿۶۵﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

اگر میں کمپنی کا شیئر خریدوں جو حلال بزنس کر رہی ہے، چوں کہ نفع یا نقصان مجھ پر چھوڑ دیا گیا ہے، کیا میں خریدنے کے ایک منٹ بعد بیچ سکتا ہوں؟ (۱۰۸۸/د۱۴۳۱ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

---

(۱) وهو في الشّرع عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض في معاوضة مال بمال .

(الفتاوى الهندية: ۱۱۷/۳)

(۲) صحّ حطّ البائع بعض الثّمن ولو بعد هلاك المبيع .

(مجمع الأنهر: ۱۱۵/۳، ط: فقيه الأمّت ديوبند)

جب تک شیئر آپ کے نام ٹرانسفر نہ ہو جائے اور اس کا رسک آپ کی طرف منتقل نہ ہو جائے، اس کو فروخت کرنا جائز نہیں (۱) ٹرانسفر ہو جانے کے بعد فروخت کرنا جائز ہے؛ البتہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک ڈلیوری نہ مل جائے اس وقت تک اس کو فروخت نہ کریں۔ (۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۵/ ۷/ ۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## حقوق پر معاوضہ لینے کی ایک ناجائز صورت

**سوال:** ﴿۶۶﴾ میں پاکستان کا رہنے والا ہوں اور میں ایک انجینئر ہوں۔ ہمارے یہاں ایک کاؤنسل ہے، جس کا نام ''پاکستان انجینئرنگ کاؤنسل'' (PEC) ہے، ہم تمام انجینئر PEC سے

---

**(۱) نهى رسول الله – صلّى الله عليه وسلّم – عن سلف وبيع وعن شرطين في بيع واحد وعن بيع ما ليس عندك وعن ربح ما لم يضمن. (أخرجه النّسائي، رقم: ٤٦٣١)**

(۲) شیئرز کی بیع میں رسک اور ضمان کا انتقال شرعی طور پر اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ بائع خریدار کو ڈلیوری نہ دے دے، اگرچہ اسٹاک ایکسچینج کے ذمہ دار حضرات کا کہنا ہے کہ شیئرز خریدتے ہی حقوق والتزامات اور رسک بائع کی طرف سے خریدار کی طرف فوراً منتقل ہو جاتے ہیں؛ لیکن حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی تحقیق کے مطابق ڈلیوری کے بعد ہی ضمان شرعی خریدار کی طرف منتقل ہوتا ہے؛ چنانچہ حضرت فرماتے ہیں: ''اس سے پتہ چلا کہ یہ حضرات حقوق والتزامات کی جس منتقلی کا ذکر کر رہے ہیں وہ شرعی مفہوم میں ضمان کی منتقلی نہیں ہے''۔ (فتاوی عثمانی: ۳/ ۱۸۵)

آگے فرماتے ہیں: مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں شرعی حکم یہ ہے کہ شیئرز کے خریدار کے لیے اس وقت تک شیئرز کو آگے بیچنا جائز نہیں ہے جب تک کہ ڈلیوری نہ مل جائے۔ (ایضاً)

مزید فرماتے ہیں: لہٰذا اس وقت جس طرح ڈے ٹریڈنگ (ایک ہی دن حصص خرید کر اسی دن ڈلیوری سے پہلے کسی دوسرے شخص کو فروخت کرنا) ہو رہی ہے وہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

(فتاوی عثمانی: ۳/ ۱۸۶، مطبوعہ: زکریا دیوبند)

رجسٹرڈ ہیں اور ہمارا رجسٹریشن نمبر ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی کمپنی بنانا چاہتا ہے جو بلڈنگ کی تعمیر کا کام کرتی ہے تو کچھ قاعدہ کی رو سے اس شخص کو کسی انجینئر کو اجرت پر رکھنا ہوگا اور اس انجینئر کا PEC سے رجسٹرڈ ہونا ضروری ہے، یعنی کمپنی کے پاس PEC کا نمبر رکھنے والے انجینئر کا ہونا ضروری ہے اب عموماً یہ ہوتا ہے کہ انجینئر لوگ اپنا PEC نمبر فروخت کر دیتے ہیں اور کسی شخص کو اپنی کمپنی رجسٹرڈ کرانے کی اجازت دیتے ہیں اور کمپنی میں کچھ نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی نوکری کرتے ہیں، صرف اپنا PEC نمبر فروخت کر دیتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا یہ حرام ہے یا نہیں؟ تقریباً پانچ لوگوں نے مجھ سے نمبر فروخت کرنے کو کہا ہے ایک سال کے لیے لیکن میں منع کر دیتا ہوں اور کبھی وہ لوگ میرے اتنے قریبی ہوتے ہیں کہ میں ان کو منع نہیں کر پاتا ہوں، اگر میں کسی اور کے پاس بھیجتا ہوں اور اس سے نمبر فروخت کرنے کو کہتا ہوں تو کیا یہ بھی حرام ہے یا نہیں؟

(۲۲۸/د ۱۴۳۵ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

صورتِ مسئولہ میں نمبر فروخت کرنے پر ملنے والی رقم ظاہری بات ہے کہ کسی مال یا محنت کا معاوضہ نہیں ہے، نیز یہ حکومت کے متعلقہ شعبے کو ایک طرح کا دھوکہ دینا ہے؛ اس لیے کہ نمبر خریدکنندہ کمپنی حکومت کے سامنے یہ ظاہر کرے گی کہ فلاں رجسٹرڈ انجینئر کی خدمات ہمیں حاصل ہیں، وہ ہمارے کاموں کی نگرانی کرتا ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، مزید یہ کہ غالباً حکومت کی نگاہ میں بھی اس طرح کی خریدوفروخت جائز نہ ہوگی؛ اس لیے مذکورہ بالا وجوہات کی بناء پر استفتاء میں مذکور طریقۂ کار شرعاً جائز نہیں (۱) نہ آپ کے لیے خود انجام دینا جائز ہے اور نہ ہی کسی اور کے لیے مشورہ

(۱)……(الف): لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجرّدۃ کحقّ الشّفعۃ . (الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۳۳/۷، کتاب البیوع ، مطلب لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجرّدۃ)

(ب): وشرط المعقود علیہ ستّۃ: کونہ موجودًا ما لا متقوّمًا مملوکًا في نفسہٖ .

(ردّ المحتار: ۱۵/۷، کتاب البیوع ، مطلب شرائط البیع أنواع أربعۃ) ==

دینا جائز ہے (۱) ہاں اگر فروخت کنندہ کچھ وقت کمپنی کے کاموں کی نگرانی وغیرہ میں صرف کرے تو اس کے معاوضے کے طور پر رقم لینے کی گنجائش ہے۔ (۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۴/۲/۱۴۳۵ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## معاہدۂ شرکت سے متعلق ایک سوال

**سوال:** ﴿۶۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

**باوضاحت مسئلہ یہ ہے:**

ہم لوگوں نے ایک کمیٹی مندرجہ ذیل شرائط پر تشکیل دی ہے:

(۱) کمیٹی کا ہر ممبر ہر مہینے ایک ہزار روپے دے گا۔

(۲) اس کمیٹی کی مدت دو سال ہوگی۔

(۳) دو سال کے درمیان حاصل شدہ رقم سے کوئی جائز تجارت بھی کی جاتی رہے گی۔

(۴) دو سال پورا ہونے پر یہ کمیٹی حساب کر کے اصل رقم منافع کے ساتھ لوٹا کر ختم کر دی جائے گی، آئندہ اگر کمیٹی چلانی ہوگی تو از سرِ نو تشکیل دی جائے گی۔

(۵) درمیان میں کسی نئے ممبر کو شامل نہیں کیا جائے گا۔

(۶) اگر کمیٹی کو تجارت میں نقصان ہو گیا تو ہر ممبر کو برابر نقصان میں شریک ہونا ہوگا۔

---

= (ج): وفي الحديث النّبوي : من غَشَّ فليس منّا . (أخرجه التّرمذيّ ، رقم الحديث: ۱۳۱۵، باب ما جاء في كراهية الغشّ في البيوع)

(۱) ﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (سورۂ مائدہ، آیت:۲)

(۲) وهي (الإجارة) بيع منفعة معلومة بعوض معلوم دين أو عين .

(ملتقى الأبحر :۱/۵۱۱، ط:بيروت)

(۷) جو حضرات تجارت کریں گے وہ بھی کمیٹی کے ممبر ہوں گے اور رأس المال میں بھی برابر کے شریک ہوں گے۔

(۸) اگر کوئی ممبر دو سال سے پہلے اپنی ممبری ختم کر کے کمیٹی سے جانا چاہے تو اس کو صرف اور صرف اصلی رقم واپس کی جائے گی، تجارت کے ذریعہ اب تک حاصل شدہ منافع اس کو نہیں دیا جائے گا۔

سوال: شرط نمبر:۸- کے متعلق یہ ہے کہ یہ شرط لگانا درست ہے یا نہیں؟ نیز اس کی رقم سے اب تک حاصل شدہ منافع دیگر ممبران کے لیے حلال ہوں گے یا نہیں؟　　فقط والسلام

مفتی محمود صاحب قاسمی ماجروی

نوٹ: دو سال سے پہلے منافع تجارت کا کوئی حساب نہیں ہوگا۔　　(۱۷۵/د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شرکت ایک عقد غیر لازم ہے، ہر شریک کو کسی بھی وقت اپنی شرکت فسخ کرنے کا اختیار رہتا ہے(۱) اور فسخ شرکت کی شکل میں وہ اپنی اصلی رقم اور اس سے حاصل شدہ منافع کا حق دار ہوتا ہے؛ اس لیے اسے منافع نہ دینے کی شرط لگانا درست نہیں ہے اور دوسرے ممبران کے لیے اس کے حصے کے منافع حلال وطیب نہ ہوں گے؛(۲) لہٰذا آٹھ نمبر پر ذکر کردہ شرط صحیح نہیں ہے؛ ہاں یہ شرط لگائی

---

(۱) تَنْفَسِخُ الشِّرْكةُ بِفَسْخِ أَحَدِ الشَّرِيكين أَوْ بإنكارِهِ الشّركة بِقَوْلِ أَحَدِهِمَا لِلآخَرِ: لا أَعْمَلُ مَعَكَ ...... وقال قبل سطرٍ: ...... ولكِنْ يُشْتَرَطُ أنْ يَعْلَمَ الآخرُ بِفَسْخِهِ، ولاَ تَنْفَسِخُ الشِّرْكَةُ مَا لَمْ يَعْلَم الآخرُ بفَسْخِ الشّرِيْكِ.

(درر الحكّام في شرح مجلّة الأحكام: ۳/ ۳۹۰، دار الجيل)

(۲) ...... فإذا قُضِيَ ذلك تَنْفسِخُ الشّركةُ بَينهُمَا ......... فَيَطِيْبُ لهُ مِنَ الرّبْحِ حِصّةُ مَالِهِ ولاَ يَطِيْبُ لهُ الرّبحُ مِنْ مَالِ المَجْنُوْنِ إلخ.

(الفتاوى الهندية: ۲/ ۳۴۸، الباب السّادس في المتفرّقات)

جاسکتی ہے کہ جو ممبر الگ ہونا چاہے اس پر ضروری ہے کہ ایک متعینہ مدت مثلاً ایک مہینہ یا پندرہ دن پہلے الگ ہونے کی اطلاع دے، پھر متعینہ وقت پر اس کی اصل رقم مع منافع لوٹا دی جائے گی اور تاریخ اطلاع سے اسے شرکت سے الگ سمجھا جائے گا، تاریخ اطلاع کے بعد کے منافع کا وہ حق دار نہیں ہوگا، اور دوسرے شرکاء کے لیے یہ نفع درست ہوگا،(۱) نیز یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ کسی شریک کے الگ ہونے کی شکل میں کمیٹی خود یا دیگر ممبران میں سے کوئی شخص یا کوئی اجنبی شخص، الگ ہونے والے کا حصہ خرید لے، کمیٹی (مجموعہ) اگر کاروبار شروع کر چکی ہے اور اس کے پاس کچھ اثاثہ اور سامان ہے تو ایسی صورت میں الگ ہونے والے کا حصہ اصل سرمایہ کے بدلے میں بھی خریدا جا سکتا ہے اگر چہ منافع مل کر کمیٹی میں اس کی رقم زیادہ ہو چکی ہو اور یہ بات بہ طور وعدہ ابتدائے معاہدے میں ہر شریک سے تحریری طور پر لکھوائی بھی جاسکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۴/۲/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## اچانک بعض شرکاء کا کاروبار میں شرکت سے انکار کر دینا

**سوال:** ﴿۶۸﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

چھ آدمیوں نے مل کر ایک کمپنی بنائی جس میں ایک سے پانچ آدمیوں کا حصہ پچاس فیصد اور چھٹے آدمی کا حصہ پچاس فیصد طے ہوا ہے، اور معاہدے میں یہ طے ہوا ہے کہ ہر کام رائے مشورہ سے شریعت کے دائرے میں ہی کیا جائے گا؛ مگر کچھ دنوں بعد اچانک نمبر ایک تا پانچ نے معاہدے کو توڑ دیا، کیا اس طرح سے معاہدہ توڑا جاسکتا ہے؟ براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب دیں۔

(۱۹۱۰/د ۱۴۳۱ھ)

(۱) فتاویٰ عثماني: ۳/۵۷-۷۱، كتاب الشّركة والمضاربة، ط: نعيمية، ديوبند.

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

شرکت کا عمومی ضابطہ یہ ہے کہ ہر شریک کو کسی بھی وقت اپنی شرکت ختم کرنے کا اختیار ہے، صرف شرط یہ ہے کہ دیگر شرکاء کو اس کی اطلاع دے دے۔ **تَنْفَسِخُ الشِّرْكَةُ بِفَسْخِ أَحَدِ الشَّرِيكَينِ أَوْ بِقَوْلِ أَحَدِهِمَا لِلآخَرِ ، لا أَعْمَلُ مَعَكَ ...... وقال قبل ذلك ...... ولكِنْ يُشْتَرَطُ أَنْ يَعْلَمَ الآخَرُ بِفَسْخِهِ ، ولاَ تَنْفَسِخُ الشِّرْكَةُ مَا لَمْ يَعْلَم الآخرُ بفَسْخِ الشّرِيْكِ.** (۱)

لہٰذا سوال میں مذکور شرط کے علاوہ اگر اور کوئی شرط معاہدہ میں نہیں تھی تو ان شریکوں کا شرکت ختم کرنا از روئے شریعت جائز ہے، اگر معاہدے میں شرکت کو ختم کرنے کے سلسلے میں اس کے علاوہ دیگر شرائط بھی تھیں، تو ان کی وضاحت کر کے حکم معلوم کیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱/۱۲/۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## شرکت کی ایک خاص صورت کا حکم

باسمہٖ تعالیٰ

محترم حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم　　بعد سلام مسنون!

**سوال:** ﴿۶۹﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

آں محترم کی خدمت میں ایک دریافت طلب مسئلہ پیش ہے، امید کہ جلد جواب روانہ فرمائیں گے۔

مسئلہ: یہ ہے کہ خالد کا ایک سیل کئی سالوں سے چل رہا تھا، بعد میں خالد نے اپنے ایک عزیز زید کو ورکنگ پاٹنر کہہ کر سیل میں شریک کر لیا اور یہ معاہدہ ہوا کہ سال میں جو بھی منافع ہوگا ہم اس کا

(۱) درر الحكّام في شرح مجلّة الأحكام: ۳/۳۹۰، دار الجيل .

20% پرسینٹ آپ کو دیں گے۔ خالد نے زید کو ایک سال کا حساب اس طرح دیا بھی ہے۔ دوسرے سال سیل میں آگ لگنے کی وجہ سے کافی نقصان ہوا، ایک دو ماہ بعد پھر خالد نے اپنی کوشش سے سیل شروع کر دیا، سیل چل رہا ہے اور دونوں پہلے ہی کی طرح علیٰ حالہ کام کر رہے ہیں۔ لیکن اب خالد کی طرف سے یہ بات آ رہی ہے کہ آپ جس طرح منافع میں شریک ہیں نقصان میں بھی حصہ لیجیے۔

جب کہ زید کی شرکت کے وقت خالد نے صرف یہ کہا تھا محنت آپ کی رہے گی اور منافع میں مذکورہ مقدار دی جائے گی۔ نقصان کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔

اب آپ سے درخواست ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرمائیں کہ شرعاً زید منافع کی طرح نقصان میں بھی شریک ہوگا؟ امید کہ جلد جواب ارسال فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

فقط والسلام

محمد یوسف، مدنی کلاتھ اسٹورس، ممبئی بازار، کھنڈوہ (M.P)

(۱۴۴۰/د ۱۴۳۵ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

استفتاء میں مذکورصورت بہ ظاہر ’’شرکتِ عنان‘‘ ہے(۱) لیکن چوں کہ سرمایہ صرف خالد کا لگا ہے، حالاں کہ شرکتِ عنان میں فریقین کا سرمایہ لگنا ضروری ہے؛(۲) اس لیے شرعاً یہ شرکت صحیح نہیں ہوئی، اور شرکت کے فساد کی صورت میں نفع ونقصان دونوں اس شخص کا ہوتا ہے، جس کا سرمایہ ہے اور دوسرے شخص کو اجرتِ مثل ملتی ہے؟(۳) لہٰذا صورتِ مسئولہ میں کاروبار کے دوران جو کچھ نفع ہوا،

**(۱-۲) وهي (الشّركة) أربعة أنواع : شركة مفاوضة وهي أن يشترك متساوين تصرّفًا و دينا ومالاً و ربحًا ...... وشركة عنان وهو أن يشتركا متساويين فيما ذكرا و غير متساويين ، وتتضمّن الوكالة دون الكفالة قال صاحب المجمع فيما ذكر أي في المفاوضة .**

**(ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر : ۵۵۲/۲، دار الكتب العلمية ، بيروت)**

**(۳) و الرّبح في الشّركة الفاسدة بقدر المال ولا عبرة بشرط الفضل فلو كلّ المال لأحدهما فللآخر أجر مثله إلخ . (الدّرّ مع الرّدّ: ۵۰۳/۶)**

وهٰكذا في شرح المجلّة . (۲/۲۷، رقم المادّة: ۱۳۶۸)

سب خالد کا ہے، اسی طرح جو کچھ نقصان ہوا وہ بھی خالد کو برداشت کرنا پڑے گا، اور زید نے جتنی مدت خالد کے ساتھ کام کیا اسے اس کی اجرتِ مثلی ملے گی۔ اب خالد کو چاہیے کہ زید نے اب تک جو نفع لیا ہے اسے جوڑے، اس طرح پوری مدت کی جو اجرت مثلی زید کی بنتی ہو اس کا حساب کرے پھر دونوں کا موازنہ کر کے لین دین کر کے اور حساب چُکتا کر لے اور آئندہ کے لیے اس معاہدہ اور معاملہ کو خلافِ شرع ہونے کی وجہ سے ختم کر دے، نیز کسی معتبر عالم دین کے مشورے سے شرعی خطوط پر کاروبار چلائے۔ **والرّبح في الشّركة الفاسدة بقدر المال، ولا عبرة بشرط الفضل، فلو كلّ المال لأحدهما فللآخر أجر مثله إلخ (الدّرّ مع الرّدّ:٦/٥٠٣)** فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲/۱/۱۴۳۵ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## شرکت ومضاربت کی بعض ضروری شرطیں

**سوال:** ﴿۷۰﴾ پارٹنرشپ (مشارکت) میں تجارت کرنے کے کیا اصول ہیں؟

(۸۹۳/ د ۱۴۲۸ھ)

باسمہ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰه التّوفيق :**

(الف) پارٹنرشپ کی ایک قسم مضاربت ہے، جس میں ایک شخص کا پیسہ ہوتا ہے اور دوسرے شخص کی محنت،(۱) اس کے صحیح ہونے کی چند شرطیں ہیں:

(۱) جو رقم اس کام میں لگانی ہے وہ مضارب کے حوالہ کر دی جائے۔

(۲) نفع میں شرکت کا معاملہ صاف طے ہو، مثلاً دونوں آدھا آدھا نفع لیں گے یا رب المال دو

---

(۱) **المضاربة: هي شركة في الرّبح بمال من جانب و عمل من جانب .**

**(ملتقى الأبحر : ٣/٤٤٣)**

تہائی لے گا، اور مضارب کو ایک تہائی ملے گا، رقم کی مقدار متعین کر کے طے کرنا درست نہیں ہے، مثلاً میں ہر ماہ ایک ہزار نفع لوں گا، باقی دوسرا لے گا۔(۱)

(۳) نفع نہیں ہوا؛ بلکہ اصل مال میں سے کچھ گھٹ گیا، تو رب المال کی پونجی میں سے کم ہوگا۔(۲) اس کے علاوہ کاروبار کرنے کے وقت اور سوالات یا شبہات پیدا ہوں تو انہیں صاف طور پر لکھ کر معلوم کرلیا جائے۔

(ب) پارٹنرشپ کی دوسری شکل شرکت ہے، اس میں نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہونے کی شرط پر جو معاملہ آپس میں طے کرلیا جائے، درست ہے، خواہ پونجی دونوں کی لگے اور عمل بھی دونوں کریں، یا ایک کی صرف پونجی ہو اور دوسرا پونجی اور عمل دونوں کے ذریعہ شریک ہو پھر پونجی اور عمل میں کمی (۳) زیادتی کی شرط کر کے طے کرنا بھی درست ہے، جو طریقہ آپ تجویز کریں اس کی تفصیل لکھ کر حکم اور مشورہ حاصل کرلیں۔

---

**(۱) وشرط تسليم المال إلى المضارب بلا يد لربّ المال فيه عاقدًا كان أو غير عاقد...... وكون الرّبح بينهما مشاعًا ، فتفسد إن شرط لأحدهما عشرة دراهم مثلاً .**

**(ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر: ۳/٤٤٥-٤٤٦)**

**(۲) وما هلك من مال المضاربة صرف إلى الرّبح أوّلاً ؛ فإن زاد على الرّبح لا يضمن المضارب . (ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر : ۳/٤٥٨)**

**(۳)......(الف) وأمّا شركة العقود فأنواع ثلاثة : شركة بالمال وشركة بالأعمال ، وكلّ ذلك علىٰ وجهين : مفاوضة وعنان ...... وركنها الإيجاب والقبول .**

**(الفتاوى الهندية: ۲/۳۰۱، كتاب الشّركة)**

**(ب) وتصحّ عامًّا وخاصًّا ومطلقًا وموقّتًا ومع التّفاضل في المال دون الرّبح ، وعكسه ، وببعض المال دون بعض وبخلاف الجنس كدنانير من أحدهما ودراهم من الآخر وبخلاف الوصف كبيض وسود وإن تفاوتت قيمتهما والرّبح علىٰ ما شرطا ومع عدم الخلط لاستناد الشّركة في الرّبح إلى العقد لا المال فلم يشترط مساواة واتّحاد وخلط . (الدّرّ المختار مع ردّ المحتار :٦/٤٨٣-٤٨٦)**

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۸/ ۱۱/ ۱۴۲۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، ظفیر الدین عفی عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## مضاربت پر کام کرنے والی ایک کمپنی کے طریقۂ کار کا حکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

**سوال:** ﴿۱۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

مفتی صاحب! ہم مضاربت پر مبنی ایک کاروبار چلاتے ہیں جس کے اصول وضوابط منسلک ہیں(۱) براہِ کرم مجھ کواس کاروبار کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق بتائیں کہ کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟　　والسلام

(۶۱۷/ د۱۴۳۴ھ)

---

(۱)

اصول وضوابط:

(۱): کمپنی لوگوں سے مضاربت پر رقم لیتی ہے اور کمپنی تین مضاربین پر مشتمل ہے، جن میں سے ایک مضارب خرید وفروخت کرتا ہے اور دو مضارب کمپنی کے حساب وکتاب، ارباب الاموال سے رقم کی وصولی اور انتظامی ودفتری امور سرانجام دیتے ہیں۔

(۲): کمپنی صرف جائز اشیاء کی خرید وفروخت کرتی ہے۔

(۳): کمپنی تمام تجارتی معاملات شرعی اصولوں کے مطابق کرنے کی پابند ہے۔ بیع فاسد، بیع قبل القبض وغیرہ سے احتراز کرتی ہے۔

مضاربین اس طرح کے معاملات فاسدہ سے واقف ہیں اور معاملات آپس میں مشورہ سے کرتے ہیں، اگر تجارت کی نئی یا پیچیدہ صورت پیش آتی ہے تو مستند دارالافتاء سے رجوع کرتے ہیں۔

(۴): مضاربین نے بھی اپنی ذاتی رقم کمپنی میں شامل کی ہے، اور اس کی بنیاد شرکت پر ہے نفع ونقصان کی تفصیل اصول نمبر: ۱۰، میں ملاحظہ ہو۔　　==

== (۵): کمپنی کے پاس جامد اثاثے موجود نہیں ہیں۔ سرمایہ نقد صورت میں ہے، یا مال تجارت کی صورت میں، مال تجارت جن گوداموں میں رکھا جاتا ہے کمپنی مشترکہ کاروبار سے اس کا کرایہ ادا کرتی ہے، کمپنی ارباب الاموال کی رقوم سے جامد اثاثے ہرگز نہ خریدے گی۔ اگر جامد اثاثوں مثلاً گاڑی، مکان وغیرہ کی ضرورت پڑی تو مضاربین اپنی ذاتی رقم سے اپنے لیے جامد اثاثے خریدیں گے اور کمپنی کے لیے استعمال کی صورت میں مضاربین مارکیٹ ریٹ کے مطابق کرایہ وصول کریں گے، اور مضاربت کا معاملہ اس سے مشروط نہیں ہے۔

(۶): کمپنی مہینہ میں صرف ایک بار ۵ تاریخ کو لوگوں سے سرمایہ وصول کر کے کاروبار میں شامل کرتی ہے اور آئندہ ۵ تاریخ کو حساب وکتاب کر کے نفع دیتی ہے۔ درمیان کی تاریخوں میں رقم پول میں شامل نہیں کرتی، لہٰذا مقررہ تاریخ تک رقم جمع کرائی جائے، اگر کوئی رب المال درمیانی تاریخ میں رقم جمع کرائے تو کمپنی وصول کرنے کی پابند نہیں اور نہ کمپنی رب المال سے اس رقم کا مطالبہ کرتی ہے؛ لیکن اگر رب المال اپنی مرضی سے جمع کراتا ہے تو اس کی رقم آئندہ ۵ تاریخ تک کمپنی کے پاس امانت ہوگی اور اس میں بلا اجازت کسی قسم کا تصرف نہیں کیا جائے گا۔

(۷): کمپنی ہر ماہ کی ۵ تاریخ تک نفع تقسیم کرتی ہے، اور اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے کمپنی کے بلا واسطہ اخراجات کو منہا کیا جاتا ہے، اس کے بعد اگر مال تجارت موجود ہو تو اس دن مارکیٹ میں ویلیو کے مطابق اس کی قیمت فروخت لگا کر نفع معلوم کیا جاتا ہے۔

(۸): کمپنی ہر ماہ منافع تقسیم کرتی ہے کسی رب المال کا نفع رأس المال کے ساتھ شامل نہیں کرتی مثلاً خالد نے ایک لاکھ روپیہ بہ طور مضاربت لگایا ہے اور اسے ماہانہ ۵ ہزار روپیہ ملا تو نفع اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ نفع رأس المال میں شامل کر کے رأس المال ایک لاکھ پانچ ہزار بن جائے۔ بلکہ اگر وہ نفع کمپنی میں رأس المال کے طور پر رکھنا چاہے تو نفع لے کر رکھ لے جب پچاس ہزار بن جائیں تو گذشتہ معاہدہ میں ترمیم کر کے رأس المال بڑھا دے۔

(۹): جو رب المال اپنی رقم نکلوا کر معاملہ ختم کر دے گا، آئندہ کے نفع ونقصانات سے اس کا کوئی تعلق نہ رہے گا۔

(۱۰): چوں کہ مضاربین نے اپنی رقم بھی لگائی ہوئی ہے، لہٰذا وہ اپنی رقم کے منافع طے شدہ اصولوں کے مطابق لیں گے، اور لگائی ہوئی رقم کی حد تک اس کے تناسب سے ان کا نقصان بھی ہوگا۔

== (۱۱): رأس المال مضارب کے پاس امانت ہوتا ہے، اگر اس کی تعدی کے بغیر ضائع ہوا تو اس پر ضمان نہیں آئے گا، لیکن اگر مضارب نے تعدی کی ہو تو وہ ضامن ہوگا۔

(۱۲): کمپنی شرعی اصول کے مطابق ارباب الاموال سے نفع کی شرح مختلف رکھ سکتی ہے؛ لیکن اگر نقصان ہوتا ہے تو شرعی مسئلہ کی رو سے مضارب کی محنت ضائع ہوگی اور رب المال کا سرمایہ؛ لیکن اگر رب المال اور مضارب پہلے منافع لے چکے ہیں تو خسارہ ان سے پورا کیا جائے گا؛ کیوں کہ مضاربت ابھی ختم نہیں ہوئی اور حتمی نفع ونقصان کا فیصلہ بھی نہیں ہوا، حتمی فیصلہ مدت معاہدہ ختم ہونے پر ہوگا، اگر تقسیم شدہ نفع بھی خسارہ پورا نہ کر سکے تو رب المال کا سرمایہ ضائع ہوگا اور مضارب کی محنت۔

(۱۳): کمپنی اس بات کی پابند ہے کہ وقت عقد سے مدت معاہدہ ختم ہونے تک رأس المال، نئے آنے والے ارباب الاموال، آنے کی تاریخ اور ان میں اور مضاربین میں ماہ بہ ماہ جو منافع تقسیم ہوتے ہیں ان کا ریکارڈ محفوظ رکھے گی۔

(۱۴): رب المال کسی بھی مضارب کے پاس خود رقم جمع کرا سکتا ہے اور رب المال خود جا کر مضارب سے اپنا ماہانہ نفع وصول کرے گا، مضارب اس کے گھر پہنچانے کا پابند نہیں ہے، اگر کوئی رب المال خود مضارب کے پاس جمع نہیں کرا سکتا یا ماہانہ نفع لینے نہیں آسکتا تو وہ اپنے لیے وکیل بالاجرت مقرر کر سکتا ہے، رب المال اپنی طرف سے اس کو اجرت دے گا اس کا مضاربت سے کوئی تعلق نہ ہوگا، اسی طرح اگر کوئی شخص از خود لوگوں سے رقوم جمع کر کے مضارب کے پاس بہ طور وکیل جمع کرائے اور اپنے مؤکل کی طرف سے مضاربت نامہ پر کرے تو درست ہے، لیکن وہ اجرت کا مطالبہ اپنے مؤکل سے کرے گا اور اس اجرت کا مؤکل و وکیل کے لیے معلوم و متعین ہونا بھی ضروری ہے؛ لیکن اس کا کمپنی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے؛ لہٰذا اگر وکالت کے معاملہ میں کوئی جہالت ہو تو اس کا کمپنی کے کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

(۱۵): کمپنی کی کوشش ہوتی ہے کہ ۵ تاریخ تک اصل سرمایہ اور نفع کا حساب کر لیا جائے اور اس میں سے نفع علیحدہ کر کے تقسیم کر دیا جائے؛ لیکن ہر مرتبہ ایسا ہونا ضروری نہیں، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ سامانِ تجارت کی قیمت لگا کر حساب کر لیا جائے اور ارباب الاموال کا جو نفع بنتا ہے اس کی ادائیگی ۵ تاریخ تک جن نئے ارباب الاموال نے رقوم جمع کی ہیں ان سے کر دی جائے، نئی رقوم چوں کہ مضاربت کے پول میں شامل ہو کر کاروبار کا حصہ بن چکی ہیں، لہٰذا وہی رقوم بھی پرانے ارباب الاموال کو بہ طور نفع دی جا سکتی ہیں۔

== (۱۶): کمپنی ہر ماہ حساب و کتاب تک حاصل ہونے والا منافع ہی تقسیم کرتی ہے، اندازے سے منافع تقسیم نہیں کرتی یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مہینہ نفع بالکل نہ آئے، اگر آئے تو وہ کم بھی ہوسکتا ہے اور زیادہ بھی غرضیکہ جتنا نفع آئے کمپنی اتنا ہی نفع دے گی اپنی طرف سے تبرعاً زیادہ نہ دے گی۔

(۱۷): کمپنی کی مدت مضاربت ۳۱ دسمبر تک ہے، اس کے بعد نیا معاہدہ کیا جائے گا، اگر کوئی اس سے پہلے اپنی رقم نکلوانا چاہے تو نکلوا سکتا ہے۔ کمپنی اس بات کی بھرپور کوشش کرے گی کہ رب المال نے جس تاریخ کو مضاربت ختم کرنے کا نوٹس دیا ہے اس کے بعد آنے والے ۶ ماہ میں اس کی رقم مع منافع دے دے۔

لیکن جب تک رب المال کی رقم واپس نہیں ملتی اس کی رقم کاروبار میں استعمال ہوتی رہے گی، اور نفع بھی ملتا رہے گا۔

(۱۸): اگر رقم ۵ ملین سے زیادہ ہو تو اس کے ملنے میں ۶ ماہ سے زیادہ مہینے بھی لگ سکتے ہیں؛ لیکن منافع بھی ملتے رہیں گے۔

(۱۹): کمپنی پچاس ہزار سے کم رقم مضاربت میں نہیں لگاتی۔

(۲۰): رأس المال کی کمی بیشی کے اعتبار سے کمپنی شرح نفع کم وبیش رکھ سکتی ہے، مثلاً ایک رب المال نے لاکھ روپئے کا سرمایہ دیا اور دوسرے نے پچاس لاکھ کا، تو کمپنی شرعاً پہلے رب المال کو بیس فیصد اور دوسرے کو پچیس یا تیس فیصد دینا آپس میں طے کرلے تو ایسا ہوسکتا ہے شرعاً بھی اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

(۲۱): رب المال یا مضارب کے انتقال کی صورت میں مضاربت ختم ہوجائے گی، اگر مرحوم کا وصی یا وارث کاروبار جاری رکھنا چاہتا ہے تو تجدید عقد ضروری ہے۔

(۲۲): مضاربین کی آپس میں شرکت عنان ہوتی ہے، جب کہ ارباب الاموال کے ساتھ ان کا عقد مضاربت ہے اور خود ارباب الاموال کی آپس میں شرکت عنان ہوتی ہے؛ لہٰذا ان کے درمیان شرکت عنان کے احکام کے مطابق معاملہ ہوگا۔

(۲۳): چوں کہ ارباب الاموال کے لیے ہر معاملہ کی نوعیت معلوم کرنا مشکل ہے؛ لہٰذا اگر کوئی معاملہ خلاف شرع ہوا تو مضاربین ہی اللہ کے حضور جواب دہ ہوں گے۔

(۲۴): مضاربت کے ضروری اصول وضوابط تحریر کردیے ہیں، اگر کوئی اصول لکھنے سے رہ گیا ہو اور آئندہ اس پر عمل کی نوبت آئے تو اس بارے میں قرآن وسنت اور فقہ حنفی کے اصول مضاربت کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

مضاربت تجارت کا ایک طریقہ ہے، جو اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے؛ مگر اس کے جواز کی کچھ شرائط ہیں، مثلاً:

(الف) رب المال نقد رقم (یا سونا، چاندی) کی شکل میں ''رأس المال'' مضارب کے حوالے کرے، عروض یا دیون سے مضاربت جائز نہیں ہے۔

(ب) منافع حصہ مشاع (مثلاً نصف، تہائی) کے طور پر طے ہو۔

(ج) منافع باہم رضامندی سے کسی بھی تناسب سے طے کیا جا سکتا ہے، مضارب کو جو کچھ ملے گا وہ حاصل شدہ منافع ہی میں سے ملے گا، اس کے لیے تنخواہ یا ''رأس المال'' میں سے نقد رقم متعین کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

(د) رب المال کی طرف سے مضارب کو جس نوع کے کاروبار کی اجازت دی گئی ہے، اس میں مضارب کو عرف کے مطابق دورانِ کاروبار ہر طرح کے تصرف مثلاً نقد یا اُدھار خرید وفروخت، سفر کرنے، بہ وقت ضرورت قرض لینے یا رہن رکھنے کی اجازت ہوگی۔

(ھ) رب المال یا مضارب میں سے کسی کی وفات کی صورت میں ''عقدِ مضاربت'' ختم ہوجائے گا۔

(و) اگر مالِ مضاربت ہلاک ہوجائے یا کاروبار میں خسارہ لاحق ہوجائے تو سابقہ منافع سے سرمایہ کی تکمیل کی جائے گی، اگر منافع سے تکمیل نہ ہو پائے یا منافع ہوئے ہی نہ ہوں تو نقصان رأس المال سے شمار ہوگا۔ مضارب پر کسی قسم کا تاوان نہ آئے گا۔ ''قدوری'' میں ہے: **ولا تصحّ المضاربة إلّا بالمال الّذي بيّنا أنّ الشّركة تصحّ به ، ومن شرطها أن يكون الرّبح بينهما مشاعًا لا يستحقّ أحدهما منه دراهم مسمّاة ............ فإذا صحّت المضاربة مطلقة جاز للمضارب أن يشتري ويبيع ويسافر ويبضع ويوكل ......... وإذا مات ربّ المال أو**

**المضارب بطلت المضاربة ........... وما هلك من مال المضاربة فهو من الرّبح دون رأس المال ، وإذا زاد الهالك على الرّبح فلا ضمان على المضارب فيه ........... ويجوز للمضارب أن يبيع بالنّقد والنّسيئة .**

سوال کے ساتھ منسلکہ اصول وضوابط ہم نے بہ غور پڑھا، یہ اصول فقہ وفتاویٰ میں ذکر کردہ شرائط و اصول کے مطابق ہیں، اس کے ساتھ ہی مذکورہ کمپنی کی یہ دفعہ بھی بہت اہم اور ضروری ہے کہ کسی نئی یا پیچیدہ صورت پیش آنے پر مستند دارالافتاء سے رجوع کرتے ہیں۔ پس یہ سب دفعات شریعت کے مطابق ہیں؛ لہٰذا ان کی پابندی کرتے ہوئے کاروبار کرنا یا ان کی پابندی کرنے والی کمپنی میں حصہ لینا جائز اور درست ہے، نفع اندوزی اور سرمایہ کاری کا جائز اور صحیح طریقہ ہے۔

البتہ دو باتیں بہ طور تذکیر عرض ہیں: (۱): ۷ میں بلا واسطہ اخراجات سے کس نوعیت کے اخراجات مراد ہیں؟ یہ سب مضاربین یا ارباب الاموال کے درمیان طے رہنا چاہیے کہ کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔

(۲): سال پورا ہونے پر جب حتمی نفع نقصان ظاہر ہوتا ہے، اس وقت اگر سامانِ تجارت موجود ہو تو اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہیں؟ اسے بھی اربابِ اموال اور مضاربین کو سمجھ لینا چاہیے، ابہام نہ رہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۲/۵/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## ناجائز سرمایہ سے شروع کردہ کاروبار اور حلال چیز کا حرام نام رکھنے وغیرہ سے متعلق سوالات

(از: حلال کمیٹی، مہاراشٹر)

**سوال:** ﴿۲۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

(۱) اگر کسی کھانے کی ایسی چیز کا جو حلال ہے، حرام نام رکھ دیا جائے جیسے حلال بیئر، یا حلال

شیمپین وغیرہ، جو کہ آج کل عرب ملکوں میں عام ہو رہا ہے اس میں دو صورتیں ہیں: اوّل یہ کہ یا تو یہ حلال ہے یا حرام ہے، اگر حرام ہے تو اس میں کوئی اشکال نہیں؛ لیکن اگر یہ حلال ہے تو اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم تو اسے اس لیے استعمال کر رہے ہیں کہ اس کے اجزاء حلال ہیں؛ لیکن آنے والی نسل جو اپنے بڑوں کو ان کا استعمال کرتے ہوئے دیکھ رہی ہے، پورا اندیشہ ہے کہ وہ آئندہ حلال وحرام کی تمیز کے بغیر ان ممنوعہ اشیاء کا استعمال کرنے لگیں گے۔

(۲) اسی طرح حلال گوشت کو حرام برانڈ (تجارتی نام) دے دیا جائے جیسا کہ آج کل مارکیٹ میں Ham اور Dog کے نام سے بہت سی کھانے کی اشیاء بِک رہی ہیں، خاص طور سے مغربی مما لک میں، اس صورت میں ہماری تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حلال ہے، تو کیا اس کو کھانا حلال ہوگا؟ اور کیا ہر کسی کے لیے اس کی تحقیق آسان ہوگی؟ اور کیا اس طرح کے ناموں کی حوصلہ افزائی کی جائے یا نہ کی جائے؟

(۳) ایک کمپنی ایسی ہے، جس کی ابتداء میں اس کا پورا سرمایہ حرام تھا، اور ہماری تحقیقات بھی اس سلسلے میں پختہ ہیں، تو کیا اس کے مصنوعات حلال کہے جا سکتے ہیں اور اُن کا حلال سرٹیفیکٹ جاری کیا جا سکتا ہے؟

(۴) آج کل کالی مہندی کے مصنوعات بہت کثرت سے بنائے جا رہے ہیں، اور بعض مصنوعات کے تعلق سے ہماری تحقیق یہ ہے کہ اس کے تمام اجزاء حلال ہیں، تو کیا اس کالی مہندی کا استعمال جائز ہوگا جس کے اجزاء حلال ہوں؟

(۵) اگر الکحل کے تمام اجزاء حلال ہوں، تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟ اور کیا اس کا استعمال جائز ہوگا؟

(۶) انقلابِ ماہیت کا تحقق کب ہوگا؟ ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی چیز ایسی ہے جس کی ماہیت بلا قصد تبدیل ہوگئی، جیسا کہ گدھا نمک کی کان میں گر گیا اور نمک بن گیا؛ لیکن ایک صورت یہ ہے کہ مثلاً قصداً بہت سارے گدھوں کو کان میں گرا دیا گیا اور وہ نمک بن گئے، جیسا کہ آج کل حلال اشیاء کی موجودگی کے باوجود حرام اشیاء کی ماہیت کو تبدیل کیا جاتا ہے، کیا ان دونوں صورتوں میں

احکام مختلف ہوں گے یا دونوں صورتوں میں حکم ایک ہی ہوگا ؟

برائے کرم مندرجہ بالا سوالات کے تفصیلی اور مدلل جوابات عنایت فرمائیں۔

**جزاك الله أحسن الجزاء**

حلال کمیٹی، جمعیۃ علماء مہاراشٹر، ممبئی

(۳۸/۷/ ۱۴۳۴ھ)

**باسمہٖ تعالیٰ**

**الجواب و بالله التّوفيق :**

(۱) شریعت نے کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کا مدار نام پر نہیں رکھا؛ بل کہ حقیقت، ماہیت، منشأ اور مقصد پر رکھا؛ اس لیے اگر کوئی خوردنی چیز فی نفسہٖ حلال ہے؛ لیکن اس کا نام حرام رکھ دیا گیا، تو صرف ''حرام نام'' کی وجہ سے وہ حرام نہ ہوگی؛ بل کہ وہ چیز حلال ہی رہے گی؛ البتہ شریعت نے غیروں کی مشابہت سے بچنے کی بھی بڑی تاکید کی،(۱) مختلف احادیث میں تشبہ اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے، نیز آپ ﷺ نے بچہ پیدا ہونے پر اچھا نام رکھنے کی ترغیب دی، (۲) اور آپ ﷺ نے بہت سے ایسے ناموں کو بدل دیا، (۳) جس سے کسی غلط معنیٰ کا وہم پیدا ہوتا تھا؛ اس لیے

**(۱) عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جدّهٖ أنّ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم قال: ليس منّا من تشبّه بغيرنا ، لا تشبّهوا باليهود ولا بالنّصارىٰ الحديث .**

**(سنن التّرمذي،رقم: ٢٦٩٥)**

**(۲) ...... (الف) قال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم : سمُّوا بأسماء الأنبياء ، ولا تسمّوا بأسماء الملائكة . (فيض القدير :رقم: ۴۷۱۷)**

**(۳)......(الف) عن ابن عمرؓ أنّ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم غيّر اسم ''عاصية'' وقال: ''أنت جميلة'' . (الصّحيح لمسلم، رقم:۲۱۳۹، باب استحباب تغيير الاسم القبيح)**

**(ب) قال النّووي: معنى هٰذهٖ الأحاديث تغيير الاسم القبيح أو المكروه إلى حسن، وقد ثبت أحاديث بتغييرهٖ صلّى الله عليه وسلّم أسماء جماعة كثيرين من الصّحابة .**

**(شرح النّووي على مسلم: ۲/ ۱۲۰-۱۲۱، المطبعة المصرية بالأزهر)**

بیئر (شراب) کے ساتھ ''حلال'' ـــــ جو ایک پاکیزہ لفظ ہے ـــــ کو جوڑ کر ''حلال بیئر'' نام رکھنا قطعًا مناسب نہیں،(۱) اگر واقعۃً اس میں شراب یا اس کے اجزاء شامل نہیں ہیں، تو اس کا کوئی دوسرا نام رکھنا چاہیے۔

(۲) اس کا جواب بھی سابقہ جواب سے معلوم ہو گیا کہ اگر ایک چیز فی نفسہٖ حلال ہے، تو حرام نام رکھ دینے سے وہ چیز حرام نہ بنے گی؛ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ حلال مصنوع کا نام Ham (خنزیر کا گوشت) یا Dog (کتا) رکھنے کی کیا وجہ ہے؟ ہاں اگر کوئی کمپنی ہے جو مختلف حلال وحرام مصنوعات تیار کرتی ہے؛ جن میں سے ہر ایک کا اپنا مستقل نام ہے؛ لیکن کمپنی کا برانڈ (رجسٹرڈ نام) نام Ham یا Dog ہے؛ اس لیے مصنوعات پر کمپنی کا یہ نام بھی درج رہتا ہے، تو ایسی صورت میں اگر کوئی قابلِ اعتماد ادارے کی طرف سے بعد تحقیق ان مصنوعات (گوشت یا اُس سے تیار شدہ اشیاء) کے حلال ہونے کی تصریح کی گئی ہو، تو ان کا استعمال حلال ہوگا، فروخت کنندگان یا مالکان کی طرف سے صرف یہ کہہ دینا کہ یہ ''حلال'' ہے کافی نہ ہوگا۔ وشرط العدالة في الدّيانات؛ فإنّ مِن الدّيانات الحلّ والحرمة كما إذا أخبر بأن هذا حلال أو حرام. (۲) بہر حال ''حلال مصنوع'' کا حرام نام صحیح نہیں ہے، اس کی کسی بھی صورت میں حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی، مسلمانوں خصوصًا حلال کمیٹیوں کو اس پر بیزاری اور بے رغبتی کا اظہار کرنا چاہیے۔

(۳) اگر متعاقدین زبانی معاملۂ بیع کر لیتے ہیں، بہ وقت عقد ثمن سامنے نہیں رکھا جاتا؛ بل کہ بات چیت مکمل ہونے کے بعد قیمت ادا کر دی جاتی ہے، اب ایسی صورت میں اگر خالص حرام کمائی سے قیمت ادا کی جائے، پھر بھی امام کرخیؒ کے نزدیک خرید کردہ چیز میں حرمت متعدی نہیں ہوتی، اگر چہ یہ اتنی رقم ادا کنندہ کے ذمہ دَین رہے گی، اسے اصل مالک کو لوٹانا، یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو، صدقہ

(۱)......(الف) وكان رسول الله صلّى الله عليه وسلّم يغيّر الاسم القبيح إلى الحسن، جاءه رجل يُسمّى "أصرم" فسمّاه "زرعة". (ردّ المحتار: ۹/۵۹۹، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع)

(ب) أبو داؤد باب في تغيير الاسم القبيح .

(۲) ردّ المحتار: ۹/ ۴۹۷، كتاب الحظر والإباحة .

کرنا واجب ہوگا، اس زمانے میں غلبۂ حرام کی وجہ سے علماء نے اس پر فتویٰ دیا ہے، شامی میں ہے:

**تَوْضِيحُ الْمَسأَلَةِ ما في التّاتَارخَانِيةِ حيثُ قال: رجلٌ اكتَسَبَ مالاً مِن حرامٍ، ثمّ اشترىٰ فَهٰذا علىٰ خمسةِ أوْجُهٍ: إمّا إنْ دفعَ تِلك الدّرَاهِمَ إلى البائِعِ أوّلاً ثمّ اشترىٰ منه بهَا، أو اشترىٰ قبلَ الدّفْعِ بهَا ودَفَعَهَا، أو اشترىٰ قبلَ الدّفْعِ بهَا ودفَعَ غيرَهَا، أو اشترىٰ مُطْلَقًا وَدفعَ تِلكَ الدّرَاهِمَ، أو اشترىٰ بِدَارَهِمَ أخرَ ودَفَعَ تِلكَ الدّرَاهِمَ ........ وقال الكرخيُّ: في الوَجْهِ الأوّلِ والثّانِي لا يطيبُ، وفي الثّلاثِ الأخِيْرَةِ يَطِيْبُ، وقالَ أبُوبَكْرٍ: لَا يَطِيْبُ فِي الكُلِّ؛ لكِنْ الْفَتْوىٰ الآنَ علىٰ قولِ الكَرْخِيّ دَفْعًا لِلحَرَجِ عنِ النّاسِ** (۱) اور آج کل بالعموم ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے؛ اس لیے سوال میں مذکور کمپنی کے کاروبار میں جو اضافہ ہوا، وہ حلال (خرید کردہ چیز) پر ہوا؛ لہٰذا کمپنی کا مالک اپنے سرمایے کا مالک ہے اور وہ آگے فروخت کرنے کا حق بھی رکھتا ہے، نیز دوسرے لوگ اسے خرید بھی سکتے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کی کمپنی کی مصنوعات اگر فی نفسہٖ حلال ہیں، تو ان کے بارے میں حلال سرٹیفیکیٹ دیا جا سکتا ہے۔

نوٹ: مذکورہ حکم اس تقدیر پر لکھا گیا کہ کمپنی مسلمان کی ہے، ورنہ اگر غیر مسلم ہے، تو حکم میں بہت وسعت ہے؛ اس لیے کہ بہت سے معاملات مسلمانوں کے نزدیک قطعًا حرام ہیں؛ لیکن غیر مسلموں کے یہاں جائز ہیں، ایسی صورت میں اگر وہ مسلمانوں کو یہ رقم یا اس سے خرید کردہ سامان دیں گے، تو اس کا لینا مسلمانوں کے لیے جائز رہے گا۔ (۲)

(۴) بابِ خضاب کی احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خضابِ سیاہ کی ممانعت اجزاء

---

(۱) المصدر السّابق: ۷/۴۹۰، كتاب البيوع، مطلب إذا اكتسب حرامًا ثمّ اشترى فهو على خمسة أوجهٍ.

(۲)......أوكَاتَبَ كافرٌ عَبْدَه الكافرعلى خمرقال صاحب البحر: يعني يصحّ هٰذا العقد للآخر إذا سمّٰى قدرًا من الخمر معينًا؛ لأنّ الخمر عندهم مال متقوّم كالعصير في حقّ المسلم.

(البحر الرّائق: ۸/۷۹، كتاب المكاتب، ألفاظ الكتابة)

ترکیبی کے ناپاک ہونے پر نہیں ہے؛ بل کہ مدار رنگ پر ہے، نیز ممانعت اس استعمال پر ہے جس سے دھوکے کا امکان ہو، مثلاً بالوں یا ڈاڑھی میں استعمال؛ اس لیے بالوں یا ڈاڑھی میں خالص کالی مہندی —— کسی بھی مصنوع کی شکل میں ہو، اگر چہ اس کے تمام اجزاء حلال ہوں —— کا استعمال شرعاً جائز نہیں، ہاں اگر اس کا رنگ خالص سیاہ نہ ہو یا مذکورہ بالا استعمال کے علاوہ کسی اور طریقے پر استعمال کیا جائے تو اس کی گنجائش ہے۔(۱)

(۵) اگر الکحل اشربہ محرمہ سے تیار کیا جائے تو وہ بلا شبہ حرام ہے، اگر چہ اس کے ابتدائی اجزاء فی نفسہ حلال ہوں جیسا کہ شراب خود حرام ہوتی ہے حالاں کہ اس کے ابتدائی اجزاء مثلاً انگور وغیرہ حلال ہیں؛ البتہ ''الکحل'' کے بارے میں بہت سے علماء کی تحقیق یہ ہے کہ اس زمانے میں عموماً ''الکحل'' انگور یا کھجور —— جن سے تیار کردہ شراب عند الاحناف بالاتفاق حرام ہے —— سے تیار نہیں کیا جاتا؛ بل کہ اناج، چھلکے، پٹرول وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے، نیز اس میں عموم بلویٰ بھی ہے؛ اس لیے علماء نے ''الکحل'' پر مشتمل اشیاء کے استعمال اور خرید و فروخت کی اجازت دی ہے۔ **وإنّ معظم الكحول الّتي تستعمل اليوم في الأدوية والعطور وغيرها لا تتّخذ من العنب أو التّمر إنّما تتّخذ من الحبوب أو القشور أو البترول وغيره ........... وحينئذ هناك فسحة في الأخذ بقول أبي حنيفة عند عموم البلوى ، والله سبحانه أعلم.** (۲)

**وهٰكذا في هامش فتاوىٰ دار العلوم ديوبند.** (۳)

(۶) ''انقلابِ ماہیت'' کا حکم اس وقت لگے گا، جب شئ کے اندر خود بہ خود یا کیمیائی عمل یا کسی دوسری شئ کی آمیزش کی وجہ سے اتنی تبدیلی آجائے کہ اس کے خواص اور بنیادی وصف —— جو

(۱) ومذهبنا أنّ الصّبغ بالحناء والوسمة حسن كما في "الخانية"، قال النّووي: ومذهبنا استحباب خضاب الشّيب للرّجل والمرأة بصفرة أو حمرة وتحريم خضابه بالسّواد على الأصحّ لقوله – عليه الصّلاة والسّلام – "غيّروا هٰذا الشّيب واجتنبوا السّواد"

(ردّ المحتار: ۱۰/۴۸۸، مسائل شتّٰى من كتاب الخنثىٰ)

(۲) تكملة فتح الملهم: ۵/۳۴۳، ط: أشرفي ديوبند .

(۳) فتاوىٰ دار العلوم ديوبند: ۱۶/۱۲۹، مكتبة دار العلوم ديوبند .

مدارِ حکم ہیں ـــ ختم ہوجائیں یا ختم ہونے کے قریب ہوجائیں؛(۱) لیکن خواص باقی ہیں یا نہیں؟ اس کا اندازہ لگانا ایک مشکل مرحلہ ہے، بالغ نظر علماء اور خواصِ اشیاء کے ماہرین ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

شامی میں ہے: **تخليل الخمر بإلقاء شيء فيها وهو كالتّخلّل بنفسها، وهما داخلان في انقلاب العين** (۲) یعنی شراب میں کوئی چیز ملا کر اسے سرکہ بنایا جائے یا شراب خود بہ خود سرکہ بن جائے، دونوں صورتیں انقلابِ ماہیت میں داخل ہیں، اس سے پتہ چلا کہ انقلابِ ماہیت کے بعد حکم بہر حال بدل جاتا ہے، خواہ قصداً کسی عمل کے ذریعے ماہیت تبدیل کی گئی ہو یا خود تبدیل ہوجائے؛ لیکن یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انقلابِ ماہیت کا سببِ طہارت ہونا، ائمۂ احناف کے درمیان ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے، صرف امام محمدؒ اس کے قائل ہیں؛ البتہ عمومِ بلویٰ کی وجہ سے فقہاء نے ان کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔ درمختار میں ہے: **ويطهر زيت تنجّس بجعله صابونًا به يفتٰى للبلوىٰ، وقال الشّاميؒ: ثمّ هٰذه المسئلة قد فرعوها على قول محمّد بالطّهارة بانقلاب العين الّذي عليه الفتوىٰ ، واختاره أكثر المشايخ خلافًا لأبي يوسفؒ** (۳) نیز انقلابِ ماہیت کا تحقق ہوا یا نہیں؟ یہ انتہائی مشکل مرحلہ ہے؛ اس لیے حلال اشیاء کی موجودگی کے باوجود حرام اشیاء کا سہارا لینا ـــ جب کہ اس میں یہ احتمال ہو کہ انقلابِ ماہیت نہ ہوا ہو ـــ کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۶/۶/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

(۱) **يستفاد ممّا في بدائع الصّنائع: إنّما يعرف التّخلّل بالتّغيّر من المرارة إلى الحموضة بحيث لا يبقى فيها مرارة أصلًا عند أبي حنيفة رضي اللّٰه عنه حتّى لو بقي فيها بعض المرارة لايحلّ، وعند أبي يوسف و محمّد تصِيرُ خلًّا بظهور قليل الحموضة فيها .**

**(بدائع الصّنائع: ۲۷۸/۴)**

(۲) **ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۵۳۴/۱، كتاب الطّهارة .**

(۳) **المصدر السّابق: ۵۱۹/۱۔**

# بینک اکاؤنٹ پر قبضہ کے تحقق اور تقسیم جائداد سے متعلق چند سوالات

مکرمی و محترمی حضرت مفتی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

**سوال:** ﴿۴۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں:

میں خالدہ ہوں، میرا پہلا عقد بکر سے ہوا تھا؛ لیکن دل کی بیماری کی وجہ سے اُن کی وفات ہوگئی، چند سالوں کے بعد میرا عقد ثانی خالد کے ساتھ ہوا، بکر سے میری ایک بچی ہے (عامرہ) جو میرے ساتھ موجودہ شوہر خالد کے یہاں رہ رہی ہے، یہ شوہر اگر چہ نہ تو میرے سابقہ شوہر کے رشتے دار ہیں اور نہ ہی میری بچی کے لیے محرم ہیں؛ لیکن ''بچی'' کا بہت خیال کرتے ہیں، میرے سابق شوہر نے انتقال سے پہلے تندرست ہونے کی حالت میں مجھ سے کہا تھا کہ اگر میری موت ہوگئی (چوں کہ اُن کو دل کی بیماری تھی) تو اس کی وجہ سے تمہیں کوئی معاشی تنگی نہیں ہوگی، تمہارے لیے میں نے دس کٹھے زمین خرید دی ہے، ایک آفس جو میرے نام ہے وہ تمہاری ہوجائے گی، بیٹی عامرہ کا اکاؤنٹ تمہارے نام کر دیا ہے، ایک انشورنس کروادیا ہے جس کا ''نومینی'' تم ہو اور ''ابا'' کو کہہ دیا ہے کہ باقی جائداد میری بیٹی عامرہ کے نام کر دیں گے اور تمہیں ''کیرٹیکر'' بنا دیں گے، چناں چہ شوہر سابق نے اپنی کمائی کی جائداد میرے نام پر بالیقین سپرد کر دی اور پاس بک ATM کے ساتھ مجھے سونپ دیا، نیز انہوں نے کچھ زیورات بھی تحفے میں دیئے تھے جن میں ہیرے کی انگوٹھی بھی تھی، میرے سابق شوہر نے اپنے والدین کی طرف سے حاصل شدہ جائداد سے متعلق اپنے والد سے کہا کہ اس کو بچی کے نام کر کے مجھے (بچی کی ماں کو) اس کی ''ولی'' بنا دیں گے؛ لیکن افسوس کہ میرے عقد ثانی کے بعد سابق سسرال کا رویہ بالکل بدل گیا، میرے دَین مہر کے پچاس ہزار روپئے اور بھائیوں کی طرف سے جہیز میں دیئے گئے زیورات کے علاوہ مجھے کچھ نہ دیا؛ بلکہ وہ میری بچی کو بھی مجھ سے لے جانا چاہتے ہیں، جب کہ بچی کی حالت یہ ہے کہ مجھ کو چھوڑ کر ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں رہ سکتی۔

مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں مندرجہ ذیل سوالات کا شرعی جواب دے کر ممنون فرمائیں:

(۱): بچی، ماں کی پرورش میں کب تک رہ سکتی ہے؟

(۲): میرے مرحوم شوہر نے جن چیزوں کو اپنی زندگی میں مجھے دے دیا تھا یا میرے نام کر دیا ان چیزوں کی شرعًا میں مالک ہوں یا اور کوئی ؟

(۳): میرے مرحوم شوہر جن چیزوں کو اپنی ملکیت میں چھوڑ کر مرے کیا اس میں شرعًا میرا حق ہے؟ اگر ہے تو کتنا ؟

(۴): اسی طرح میری بچی کا کیا حق ہے؟ اور کتنا ؟

(۵): بچی کے نام کی جائیداد کا کیر ٹیکر (ولی) مجھے بنایا گیا ہے، شرعًا وہ جائیداد کس کی ہوگی؟ اور میں کب تک کیر ٹیکر (ولی) رہ سکتی ہوں؟ حکم شرع سے مطلع فرمائیں؟

(۶): بچی کے دادا نے مجھے کیر ٹیکر (ولی) بنایا تھا اور عدالت نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، کیا میں ولی ہوگئی؟ اور دادا کا حق ولایت ختم ہوا یا نہیں؟ جب کہ انہوں نے ہی مجھے کیر ٹیکر (ولی) بنایا ہے، اور عدالت سے تصدیق ہوگئی ہے۔

(۷): جو چیزیں شوہر کی جانب سے مجھے ملی تھیں مثلاً زیورات وغیرہ شرعًا اس کا مالک کون ہوگا؟

(۲۶۸/ د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التّوفیق :

(۱) بچی کی عمر نو{ ۹} سال ہونے تک حقِ پرورش ماں کو حاصل رہتا ہے؛(۱) لیکن اگر ماں بچی کے نامحرم سے نکاح کر لیتی ہے، تو حقِ پرورش ساقط ہوجاتا ہے، پھر یہ حق نانی کو ملتا ہے، اگر نانی با حیات نہ ہوں، تو دادی کو یہ حق پہنچتا ہے۔(۲)

(۱) ففي الدّرّ مع الرّدّ: والأمّ والجدّة لأمّ أو لأب أحقّ بها أي بالصّغيرة حتّى تحيض أي تبلغ في ظاهر الرّواية ...... ...... وغيرهما أحقّ بها حتّى تشتهي ، وقُدِّرَ بتسع وبه يفتى ......... وعن محمّد أنّ الحكمَ في الأمّ والجدّة كذلك ، وبهٖ يفتى لكثرة الفساد. (۲٦۸/۵)

(۲) ثـمّ أي بعد الأمّ بأن ماتت أو لم تقبل أو أسقطت حقّها أو تزوّجت بأجنبيّ أمّ الأمّ ...... ثمّ أمّ الأب وإن علت . (المصدر السّابق: ۲٦۲/۵، مطلب في لزوم أجرة مسكن الحضانة)

صورتِ مسئولہ میں چوں کہ آپ کا نکاح بچی کے نامحرم کے ساتھ ہوگیا، نیز آپ کی والدہ یعنی بچی کی نانی بھی باحیات نہیں ہیں؛ اس لیے حقِ پرورش دادی کو حاصل ہے؛ اگر وہ پرورش کرنا چاہیں تو بچی کو نہ دینے پر آپ اصرار نہیں کرسکتیں؛ لیکن بچی سے ملاقات کرنے کا حق آپ کو بہر حال حاصل رہے گا۔(۱)

زندگی میں جو چیز وارث کو دی جاتی ہے، وہ ہبہ ہوتی ہے، اور ہبہ کی صحت کے لیے پورے طور پر قبضہ دے کر مالک بنادینا ضروری ہے۔(۲)

لہٰذا صورتِ مذکورہ میں جو جائیداد شوہر نے اپنی زندگی میں آپ کو دے کر قبضہ بھی کرادیا تھا اس کی آپ مالک ہیں، اس میں میراث جاری نہیں ہوگی، اور جو جائیداد صرف آپ کے نام کر دیا تھا یا دینے کا وعدہ کیا تھا، آپ کو قابض و متصرف نہیں بنایا تھا، اس کی آپ مالک نہیں ہیں، اس میں میراث جاری ہوگی؛ پس صورتِ مسئولہ میں وہ جائداد جو آپ کے نام تو کردیا تھا؛ لیکن قبضہ نہیں دیا تھا، نیز وہ تمام چیزیں جو آپ کے شوہر نے بہ وقت وفات اپنی ملکیت میں چھوڑا تھا سب کے چوبیس حصے کر کے تین حصے آپ کو، بارہ حصے آپ کی بیٹی کو، پانچ حصے آپ کے خسر کو اور چار حصے آپ کی ساس کو ملیں گے، اور بقیہ رشتے دار محروم رہیں گے۔ نقشہ حسبِ ذیل ہے:

مسئلہ: ۲۴

میت:

| زوجہ | بنت | اب | ام |
|---|---|---|---|
| ۳ | ۱۲ | ۴+۱=۵ | ۴ |

جہاں تک دونوں بینک اکاؤنٹ کی بات ہے تو استفتاء میں مذکور تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ اکاؤنٹ آپ کے نام کر کے چیک بک، اے، ٹی، ایم، کارڈ، پاس بک سب آپ کو دے دیا تھا، اگر واقعۃً ایسا ہی ہوا، تو چوں کہ اس طرح ہبہ تام ہوجاتا ہے؛ (۳)

(۱) أو متزوّجة بغير محرم الصّغير ......... ولا تمنعه عن الأمّ قال الشّامي : أي عن رُؤيتها له وتعهّدها إيّاه . (الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۵/۲۵۵، باب الحضانة)

(۲) الهبة لا تفيد الملك إلّا بالقبض .(الفتاوى السّراجية ، ص:۴۰۳، ط: اتّحاد، دیوبند)

(۳) فتاوى عثماني: ۳/۴۵۴۔

اس لیے دونوں اکاؤنٹ کی آپ مالک ہوں گی، ان میں میراث جاری نہ ہوگی؛ لیکن ''نومینی'' کی حیثیت چوں کہ وکیل و نائب کی ہوتی ہے؛ اس لیے انشورنس میں جمع کردہ رقم آپ کی ملک نہ ہوگی؛ بلکہ اس میں میراث جاری ہوگی، انشورنس میں جمع کی ہوئی رقم سے زائد کمپنی جو سود دے گی وہ رقم واجب التّصدق ہوگی۔(۱)

(۵-۶-۸) استفتاء کی تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم نے قبل از وفات بچی کی جائیداد کے سلسلے میں آپ کو وصی بنانے کی ذمے داری اپنے والد کو دی تھی؛ لہٰذا جب مرحوم کے والد نے آپ کو قانونی طور پر بھی وصی بنادیا تو بچی کے بالغہ ہونے تک آپ ہی ''وصی'' رہیں گی، اور جائیداد کی دیکھ بھال کی ذمے داری آپ پر رہے گی، چوں کہ وصی بنانا درحقیقت مرحوم (باپ) کی طرف سے تھا؛ اس لیے دادا اس کو ختم نہیں کرسکتے۔(۲)

(۷) جو زیورات مرحوم نے تحفہ یا گفٹ کی صراحت کے ساتھ زندگی ہی میں آپ کو دے دیا تھا، وہ تو آپ کے ہوگئے، ان میں میراث جاری نہ ہوگی، اور جن کے بارے میں کوئی تصریح نہیں کی گئی تھی، ان کے بارے میں مرحوم شوہر کے خاندان کا عرف مدار بنے گا، اگر عرف بہ طور ملکیت دینے کا ہے، تو آپ اُن کی مالک ہیں، سسرال والوں کا رکھ لینا درست نہ ہوگا، اگر صرف عاریۃً دینے کا ہے تو پھر آپ مالک نہ بنیں گی؛ بلکہ اصل مالک کون ہے، اس کے اعتبار سے حکم جاری ہوگا، اگر شوہر مالک تھا، تو نمبر:۲ کے تحت ذکر کردہ تفصیل کے مطابق میراث جاری ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۲/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام غفرلہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

(۱) لو مات الرّجل و كسبه من بيع الباذق أو الظّلم ...... تصدّقوا بها؛ لأنّ سبيل الكسب الخبيث التّصدّق إذا تعذّر الرّدّ على صاحبه .

(ردّ المحتار:۹/۵۵۳، كتاب الحظر، فصل في البيع)

(۲) وفي الخانية والخلاصة وغيرهما: أنت وصيّي ؛ أوأنت وصيّي في ما لي، أوسلمت إليك الأولاد بعد موتي؛ أو تعهّد أولادي بعد موتي ، أوقم بلوازمهم بعد موتي ، أو ما جرى مجرى هٰذه الألفاظ يكون وصيًّا . (ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۱۰/۴۰۹)

# متعدد لوگوں کو مشاعًا فیکٹری ہبہ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

محترم جناب مفتیان کرام دارالعلوم دیوبند، انڈیا

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

سوال: ﴿۴۷﴾

ای میل کے ساتھ منسلکہ درج ذیل فتویٰ جامعہ دارالعلوم کراچی سے جاری ہوا ہے، مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے بھی اس کی تصدیق مطلوب ہے۔ ازراہِ کرم منسلکہ فتویٰ کی تصدیق فرما کر ممنون فرمائیں۔ والسلام

مستفتی: محمد بلال

ڈیرہ اسماعیل خان، پاکستان (۳۲/ ۷/ دس۱۴۳۳ھ)

سوال: میرے والد محترم کی ایک صابن کی فیکٹری تھی، یعنی صابن کا وسیع کاروبار تھا، میرے والد محترم نے اپنی زندگی میں حالتِ صحت میں ۱۹۹۸ء میں کاروبار اور اس سے منسلک مشینری، مٹیریل، دوکانیں، اور پانچ گاڑیاں میرے پانچ بھائیوں کو مشترکہ ہبہ کردیں، جو چیزیں میرے والد صاحب نے ہبہ کیں اُن اشیاء کے متعلق واضح طور پر کہا کہ یہ کاروبار اور ان سے منسلک ہر چیز، بیٹوں کی ہے، اس میں بیٹیاں شریک نہیں، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

چار عدد پلانٹر مشینیں، چار عدد صابن کٹائی مشین، ایک عدد ٹھپائی مشین، ۱۳ عدد صابن والے کڑھا، ۳ عدد مدہانی مشین، ۳ عدد تیل کی ٹینکی، ۳ عدد لوڈر صابن (سپلائی کرنے کی گاڑیاں) ۲ عدد دوکانیں صابن سیل آفس، ایک عدد جیپ، ایک عدد کار، اس کے علاوہ ''۱۰۵۰'' ٹن صابن تیار شدہ ۶۰۰ من لکڑی، ۱۱۰ خالی ڈرم، ۲۰۰ عدد سانچے صابن والے ۷۵ ڈرم صابن بنانے کا مختلف قسم کا کیمیکل۔

یہ تمام چیزیں میرے والد محترم نے اپنی زندگی میں حالتِ صحت میں میرے پانچوں بھائیوں کو ہبہ کردیں، یہ تمام چیزیں جن کی تفصیل مذکورہ بالا عبارت میں بیان ہوچکی ہے، میرے والد نے

پانچوں بھائیوں کو زبانی لفظوں میں برابر کے حصے بتا کر مشترکہ کاروبار دیا؛ لیکن ہر شئے میں ہر بھائی کے حصے کی زبانی لفظوں میں تمیز کردی، مثال کے طور پر ۲۰۰ ڈرم میں ہر بھائی کے ۴۰ ڈرم کے حصے کی تمیز کردی، اور اسی طرح ہر شئے میں برابر برابر تمیز کردی، جو چیز نام ہوسکتی تھی نام پر کردی اور باقی چیزوں کا قبضہ بھائیوں کو دیا، اور خود کاروبار سے لاتعلق ہوگئے، جس وقت والد نے ہبہ کیا اس وقت تین بھائی بالغ اور دو بھائی نابالغ تھے، دونابالغ بھائیوں کا قبضہ بھی بڑے بھائیوں کو دیا۔

اس کے علاوہ ۷۰ لاکھ روپے کا بینک اکاؤنٹ جو کہ والد صاحب کے نام پر تھا، اپنے نام سے اکاؤنٹ سے خارج کرکے ۷۰ لاکھ روپے میں سے ہر بھائی کے رقم کے حصے تمیز کرکے دو بھائیوں کے نام مشترکہ اکاؤنٹ کھلوایا، یعنی والد نے رقم کا ہبہ بھی کیا، دو بھائیوں کے نام اکاؤنٹ کھلوانے کی وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر کاروبار وہی سنبھالتے تھے اور دو بھائی نابالغ تھے، اگر نابالغ بھائیوں کے نام اکاؤنٹ کھلوایا جاتا تو پیسہ کاروبار میں لگانے کا مسئلہ ہوتا۔

اگر اس کاروبار کو علیحدہ علیحدہ والد صاحب کرواتے تو ایک بھائی پر اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ ہر بھائی علیحدہ سے کاروبار چلاسکتا اور صابن بنانے کا کام تو صرف ایک بھائی جانتا تھا، جب کہ دوسرے بھائی صابن کا کام علیحدہ سے کیسے چلاتے اور نابالغ بھائی تو بالکل ناسمجھ تھے اور صابن کا کاروبار برانڈ کے نام سے چل رہا ہے، فیکٹری کا نام بھی مشہور ہے۔

فیکٹری کے کاروبار کا کام بھائیوں میں کیسے تقسیم کرتے، اس لیے والد صاحب نے تمام اشیاء بھائیوں کو مشترکہ دے کر ہر بھائی کے حصہ کی زبانی لفظوں میں تمیز کردی، جس کی تفصیل سوال میں موجود ہے، والد محترم والد ہونے کی حیثیت سے بیٹوں کی سرپرستی کرتے، کاروبار میں تجربے کی بنیاد پر صابن کے کاروباری نکتوں کے بارے میں گائیڈ کرتے تھے، باپ یا استاذ ہونے کی حیثیت سے والد صاحب نے جب کاروبار ہبہ کیا، تو یہ بات واضح کی کہ فیکٹری کی جگہ، بلڈنگ اور گھر جو ہے، یہ میری ملکیت ہے، یہ میرے مرنے کے بعد میری وراثت ہوگا اور اس میں تمام بہن بھائی شریک مالک ہوں گے اپنے اپنے حصے کے۔

۲۰۰۲ء میں میرے والد صاحب وفات پاگئے، ان کے نام کی جائیداد ایک فیکٹری کی جگہ جس

کی قیمت مع بلڈنگ ۵۵ لاکھ تھی اور گھر جو کہ ۲۳ مرلے کا تھا اس کی قیمت ۳۰ لاکھ تھی، ٹوٹل ۸۵ لاکھ روپے ترکہ بنا، جس میں میری دو والدہ، نو بہنیں، اور پانچ بھائی شریک حصہ تھے، ۸۵ لاکھ کے حساب سے ایک والدہ کا حصہ، ایک بھائی کا حصہ ایک بہن کا حصہ؛ لیکن میرے بھائیوں نے حساب و کتاب میں مغالطہ کی نیت یا بھلائی کی نیت سمجھ کر ایک بہن کو یعنی ہر بہن کو دس دس لاکھ روپیہ دیا۔

آپ مفتی حضرات سے گزارش ہے کہ آیا جو کاروبار اور اس سے منسلک ہر چیز جو والد صاحب نے اپنی زندگی میں ہبہ کی، کیا اس میں ہم بہنوں کا حصہ بنتا ہے اور کیا والد صاحب فیکٹری کی جگہ اپنے نام رکھ کر کاروبار ہبہ کر سکتے ہیں؟

اور والد صاحب نے جو کاروبار ہبہ کیا اس کی اشیاء میں ہر بھائی کے برابری کے حصے کی تمیز گھر پر کی، اور چیزیں فیکٹری پر موجود تھیں، کاروبار پر میرے بھائیوں کا قبضہ پہلے سے تھا، لیکن والد صاحب کے ہبہ کرنے کے بعد وہ کاروبار پر ہر لحاظ سے قابض ہو گئے، آپ حضرات سے التجاء ہے کہ آپ ہمیں شرعی مسئلہ بتائیں کہ ہمارا کاروبار اس وقت بھی مشترکہ ہے اور سب بھائی مل کر اس کاروبار کو خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں، والد صاحب کے کہنے کے مطابق ہر بھائی کا نفع اور نقصان برابر کا الگ الگ ہے۔

**المستفتي: محمد بلال، ڈیرہ اسماعیل خان**

**الجواب حامدًا و مصلّيًا :**

**(جواب از: دارالافتاء دارالعلوم کراچی)**

(الف) اصل سوال کے جواب سے پہلے آپ ہبہ (گفٹ) کے بارے میں شریعت کا اصول سمجھ لیجئے کہ قابلِ تقسیم چیز اگر ایک سے زیادہ افراد کو ہبہ کی جائے تو اس کے نافذ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہر ایک کا حصہ الگ الگ تقسیم کر کے دیا جائے؛ لیکن اگر ناقابلِ تقسیم چیز ایک سے زیادہ افراد کو ہبہ کی جائے تو اس میں ہر ایک کا حصہ الگ الگ تقسیم کرنا ضروری نہیں، اب کون سی چیز قابلِ تقسیم ہے اور کون سی چیز ناقابلِ تقسیم، تو اس کے متعلق فقہاء کرام کے مختلف اقوال سامنے آئے ہیں، صاحبِ کفایہ اور صاحبِ عنایہ نے ناقابلِ تقسیم اشیاء کی ایک تعریف یہ نقل کی ہے کہ ”ایسی چیز

جس کو تقسیم کرنے سے اس کی مالیت کم ہو جائے، نا قابلِ تقسیم کہلائے گی‘‘۔

ان اصولی باتوں کو سامنے رکھ کر جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ آپ کے والد صاحب نے پانچ بھائیوں کو مساوی طور پر صابن کی جو فیکٹری ہبہ کی تو آیا وہ فیکٹری قابلِ تقسیم تھی یا نا قابلِ تقسیم، تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر فیکٹری میں موجود اشیاء کے لحاظ سے غور کیا جائے تو ان میں سے کچھ اشیاء فی نفسہٖ قابلِ تقسیم معلوم ہوتی ہیں اور کچھ اشیاء فی نفسہٖ نا قابلِ تقسیم معلوم ہوتی ہیں؛ لیکن اگر مجموعہ فیکٹری کے لحاظ سے غور کیا جائے تو صاحبِ کفایہ اور صاحبِ عنایہ کی نا قابلِ تقسیم اشیاء کی تعریف کے مطابق مجموعہ فیکٹری نا قابلِ تقسیم ہے؛ کیوں کہ اگر فیکٹری کو پانچ مساوی حصوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کو اس کا حصہ الگ الگ دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ اس طرح پانچ حصوں میں تقسیم کرنے سے فیکٹری کی اصل حیثیت ختم ہو کر اس کی مالیت میں معتد بہ کمی ہو جاتی؛ لہٰذا اس تعریف کے مطابق مجموعہ فیکٹری نا قابلِ تقسیم ہے۔

چنانچہ اگر والد صاحب مرحوم کے منشاء پر غور کیا جائے تو:

(۱) اُن کا مقصد مجموعہ فیکٹری کا ہی ہبہ تھا، نہ کہ فیکٹری میں موجود ہر ہر چیز کا الگ سے ہبہ مقصود تھا

(۲) نیز فیکٹری میں غالب اشیاء نا قابلِ تقسیم ہوتی ہیں، اور ہبہ کرنے والے کا اصل مقصود ان نا قابلِ تقسیم اشیاء کا ہبہ ہی ہوتا ہے، اس کا اصل مقصود قابلِ تقسیم کا ہبہ نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ ضمناً اس میں داخل ہوتی ہیں۔

(۳) نیز شیئرز کے ہبہ میں یہ شرط نہیں لگائی گئی کہ ان شیئرز کی نمائندگی کرنے والے اثاثے کمپنی سے الگ کر کے ہبہ کئے جائیں؛ بلکہ اثاثوں کے نمائندہ کاغذات (شیئرز) پر قبضہ کو ان اثاثوں پر قبضہ قرار دیا گیا ہے۔

لہٰذا اس تفصیل کے پیشِ نظر آپ کے والد صاحب مرحوم نے پانچ بھائیوں کو مساوی طور پر جو فیکٹری ہبہ کی تو اس فیکٹری کا ہبہ ان پانچ بھائیوں کے حق میں مکمل ہو گیا، پانچوں بھائی اس کے مالک ہو گئے، اور اب یہ فیکٹری والد صاحب مرحوم کی وراثت میں تقسیم نہیں ہوگی۔

نیز اگر والد صاحب مرحوم نے اس فیکٹری کے علاوہ بھی کوئی اور چیز اپنے بیٹوں اور بیٹیوں میں

سے کسی کو مالک اور قابض بنا کردی ہے تو وہ بیٹا اور بیٹی اس چیز کے مالک ہوگئے ہیں اور اب وہ چیز بھی والد صاحب کی وراثت میں تقسیم نہیں ہوگی۔

**في الكفاية على فتح القدير: ۷/ ۴۸۸، كتاب الهبة.**

**هبة المشاع فيما لا يقسم جائزة يعني به ما لا يحتمل القسمة أي لا يبقى منتفعًا بعد القسمة ......... أو لا يبقى بعد القسمة من جنس الانتفاع الّذي كان قبل القسمة ......... وفي الذّخيرة و ذكر الإمام أحمد الطّواويسيّ إذا وهب الرّجل نصف درهم صحيح من الدّراهم العدالية يجوز وهو الصّحيح وجعل هذا بمنزلة المشاع لا يحتمل القسمة فقال كلّ شيء يضرّه التّبعيض فيوجب نقصانًا في ماليته فإنّه لا يحتمل القسمة وإذا لم يوجب التّبعيض نقصانًا في ماليته فهو ممّا يحتمل القسمة ، خرج على هذا هبة بعض العدالية لأنّ التّبعيض يضرّه .**

**وفي العناية: ۱۲/ ۲۷۷، ولا تجوز الهبة فيما يقسم إلّا محوزة مقسومة إلخ الموهوب إمّا أن يحتمل القسمة أو لا، وضابط ذلك أن كلّ شيء يضرّه التّبعيض فيوجب نقصانًا في ماليته لا يحتمل القسمة وما لا يوجب ذلك فهو يحتملها فالثّاني كالعبد والحيوان والبيت الصّغير والأوّل كالدّار والبيت الكبير .**

(ب) جہاں تک سوال میں ذکر کردہ ستر لاکھ روپے کی رقم کے گفٹ کا تعلق ہے تو اگر یہ رقم فیکٹری کے اثاثوں میں شامل تھی جیسا کہ سوال سے بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے تو ایسی صورت میں فیکٹری کے ہبہ کے ساتھ اس کا ہبہ بھی درست ہوگیا، پانچوں بھائی اس رقم کے مساوی طور پر مالک ہوگئے، اگر چہ قانونی مجبوری کی وجہ سے اکاؤنٹ صرف دو بھائیوں کے نام کھولا گیا ہو، اب یہ رقم بھی والد صاحب مرحوم کی وراثت میں تقسیم نہیں ہوگی۔

(ج) والد صاحب نے چوں کہ فیکٹری کی جگہ اور بلڈنگ اپنے بیٹوں کو گفٹ نہیں کی تھی، صرف کاروبار گفٹ کیا تھا، لہٰذا وہ جگہ اور بلڈنگ بہ دستور والد صاحب کی ملکیت تھی اور ان کے انتقال کے بعد اُن کی وراثت میں تقسیم ہوں گی۔

في الهندية: ۴/۳۸۰، ولو وهب دارًا فيها متاع الواهب وسلم الدّار إليه أو سلمها مع المتاع لم تصح ، والحيلة فيه أن يودع المتاع أو لا عند الموهوب له ويخلي بينه وبينه ثمّ يسلم الدّار إليه فتصحّ الهبة فيها وبعكسه لو وهب المتاع دون الدّار وخلي بينه وبينه صحّ ، وإن وهب له الدّار والمتاع جميعًا وخلى بينه وبينهما صحّ فيهما جميعًا هٰكذا في الجوهرة النيّرة .

في بدائع الصّنائع: ٦/ ۱۲۵، ولو وهب ما فيها من المتاع دون الدّار وخلى بينه وبين المتاع جازت الهبة ؛ لأنّ المتاع لايكون مشغولاً بالدّار والدّار تكون مشغولة بالمتاع لهٰذا افترقا فيصحّ تسليم المتاع ولا يصحّ تسليم الدّار . واللّٰه سبحانه وتعالىٰ اعلم.

کتبہ الاحقر: ابراہیم عیسیٰ دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی، ۵/ ۸/ ۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: محمد عبدالمنان عفی عنہ ۸/ ۸/ ۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: احقر محمود اشرف غفراللہ لہ ٦/ ۸/ ۱۴۳۱ھ

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التّوفيق :

دارالافتاء دارالعلوم کراچی کا منسلکہ فتویٰ ۵٦/ ۱۲۸۹، محررہ ۵/ ۸/ ۳۱ھ بہ غور پڑھا اس فتوے میں مذکور فیکٹری اور اس کے اثاثے کے صحتِ ہبہ کی بات درست ہے؛ البتہ والد کے اکاؤنٹ کی رقم کو فیکٹری کا اثاثہ قرار دینے میں تردد ہے، ہاں اگر وہ رقم فیکٹری کے ورکنگ کیپٹل کی ہو(۱) تو اثاثہ بلاتردد ہوسکتا ہے؛ لیکن رقم فیکٹری کے ورکنگ کیپٹل کی ہے، یہ امر محتاج ثبوت رہے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہٰ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۴/ ۵/ ۱۴۳۳ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری، وقار علی غفرلہٗ، فخرالاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

(۱) وہ نقد رقم جس کا موجود رہنا فیکٹری چلانے کے لیے ضروری ہو۔

# مالِ موقوفہ کو غیر مصرف میں خرچ کرنے کا حکم

**سوال:** ﴿۵۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

شہر...... میں واقع وقف نمبر...... پر کروڑوں روپیوں کی قیمت کے اراضیات، مکانات ودیگر جائداد وقف ہیں جو کہ محرم کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے پروگراموں اور غریبوں، یتیموں، بیواؤں، مسکینوں، اپاہجوں اور سماج کے دیگر کمزور طبقات کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ تقریباً سوا تین سو سال سے مذکورہ وقف اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتا آ رہا ہے۔

ادھر کچھ سالوں سے مذکورہ اوقاف کے فنڈ سے غریبوں، مسکینوں، بیواؤں، یتیموں، اپاہجوں اور سماج کے دیگر کمزور طبقات کی فلاح کے لیے خرچ کی جانے والی رقوم کا ایک بڑا حصہ ہر سال محرم کی آٹھویں تاریخ کو ضلع اور پولیس انتظامیہ کے حکام اور اپنے حواریوں کو دعوتِ شیراز دے کر خرچ کیا جا رہا ہے جس سے غریبوں، بیواؤں، یتیموں، مسکینوں، اپاہجوں اور سماج کے کمزور طبقات کی زبردست حق تلفی ہو رہی ہے۔

برائے مہربانی ہمیں یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں کہ کیا مذکورہ حق تلفی ایک مناسب امر ہے؟ اگر مناسب ہے تو کیسے؟ اور اگر نا مناسب ہے تو شریعت اسلامیہ اس نامناسب اقدام کو کیسی نظر سے دیکھتی ہے؟ اور اس غیر مناسب فعل کو شریعت کی زبان میں کیا نام دیا جائے گا؟　　فقط والسلام

(۱۴۲۱/ د ۱۴۳۵ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

اوقاف جن جائز اور مستحسن مصارف کے لیے وقف کیے گئے، انہیں مصارف میں اوقاف کی آمدنی کا خرچ کیا جانا ضروری ہے؛ (۱) کیوں کہ جائداد وقف ہونے کے بعد اس مالک کی ملکیت سے

---

(۱) ......(الف) أنّهم صرّحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة.

(ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ٦/ ٦٦٥، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة) ==

نکل کر اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں چلی جاتی ہے(۱) متولی اس کا صرف منتظم کار ہوتا ہے، اگر واقف نے متولی (منتظم) کے لیے آمدنی کا کچھ حصہ وقف نامہ میں مقرر کیا ہے، تو وہ بس اسی قدر لینے اور اپنی مرضی سے خرچ کرنے کا مختار ہوگا (جس قدر آمدنی اس کے لیے وقف نامہ میں مقرر کی گئی) باقی جملہ آمدنی وقف کے جائز مصارف میں خرچ کرنا لازم اور ضروری ہوگا، جب وقف کے مصارف غریبوں بیواؤں، محتاجوں، اپاہجوں کے لیے وقف نامہ میں متعین کیے گئے ہیں تو متولی انہیں مصارف میں خرچ کرنے کا پابند ہے، اس میں کسی قسم کی خیانت کرنا یا غیر متعلقہ مصارف میں خرچ کرنا سخت گناہ ہے، یہ بات ایسی صاف اور کھلی ہوئی ہے کہ اس کا غیر مناسب ہونا بالکل واضح اور ظاہر ہے اور غیر مصارف میں خرچ کرنا خیانت، حق تلفی اور ظلم کے دائرہ میں آتا ہے، جس کی ادنیٰ مقدار بھی انسان کی عاقبت برباد کرنے کے لیے کافی ہے، حدیث میں ہے: **الظّلم ظلمات يوم القيامة** (۲) ظلم قیامت کے دن تاریکیوں کی شکل میں رونما ہوگا۔ **عن خولة الأنصارية رضي الله عنها قالت سمعت النّبيّ صلّى الله عليه وسلّم يقول: إنّ رجالاً يتخوّضون في مال الله بغير حقّ فلهم النّار يوم القيامة** (۳) یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک جو لوگ اللہ کے مال میں بے جا تصرف کرتے ہیں ایسے لوگ قیامت کے دن جہنم کی آگ کے مستحق ہوں گے۔

نیز ارشاد خداوندی ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا﴾ (۴) یعنی جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں

---

== (ب) شرط الواقف كنصّ الشّارع أي في المفهوم والدّلالة و وجوب العمل به . (الدّرّ مع الرّدّ: ٦/٦٤٩)

(۱) هو حبسها على حكم ملك الله تعالىٰ وصرف منفعتها على من أحبّ (درّ مختار) وفي ردّ المحتار: قدر لفظ "حكم" ليفيد أنّ المراد أنّه لم يبق على ملك الواقف ولا انتقل إلى ملك غيره؛ بل صار على حكم ملك الله تعالىٰ الّذي لا ملك فيه لأحد سواه .

(ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ٦/٥٢٠-٥٢١)

(۲) أخرجه التّرمذي، رقم: ۲۰۳۰، باب ما جاء في الظّلم .

(۳) أخرجه البخاري، رقم: ۳۱۱۸، باب قول الله تعالىٰ فأنّ للّٰه خمسه .

(۴) سورۂ نساء، آیت: ۱۰۔

آگ کا انگارا بھر رہے ہیں اور کل قیامت میں وہ جہنم (دہکتی ہوئی آگ) میں داخل کیے جائیں گے۔

اوقاف کی آمدنی اللہ تعالیٰ کا مال بھی ہے اور ان کی آمدنیاں یتیموں کا حق ہیں، پس اس میں بے جا تصرفات کرنے والے قرآن وحدیث دونوں کی رو سے جہنم میں لے جانے والا کام کر رہے ہیں، چند انسانی چہروں کو خوش کر کے بے شمار یتیموں مسکینوں کے چہروں کو غمگین و رنجیدہ چھوڑ رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ناراض کر رہے ہیں، یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ اور خود جائیداد وقف کرنے والوں کو کل قیامت میں کیا منہ دکھائیں گے اور جب اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے والے مساکین و یتامیٰ کی ایک لمبی قطار ان کا دامن پکڑ کر اللہ کے دربار میں استغاثہ پیش کرے گی، تو یہ کہاں جائیں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۵/۱۲/۲۲ھ مطابق ۱۴/۱۰/۱۸ء

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## ورثہ اگر وصیت کا انکار کریں تو اس کے ثبوت کے لیے گواہ ضروری ہیں

**سوال:** ﴿۷۶﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

میری ماں کا چند مہینے پہلے انتقال ہو گیا، ان کی عمر تقریباً اکیاسی سال تھی، ان کو لکھنا نہیں آتا تھا اپنے انتقال سے چند سال پہلے انھوں نے مجھ سے اپنے اثاثہ کے ایک تہائی کے متعلق آخری وصیت کی بات چیت کا آڈیو ٹیپ ریکارڈ کرنے کو کہا۔ انہوں نے وضاحت کی کہ وہ کس طرح اس رقم کو اسلامی مقاصد، اپنے ناتی (میری ایک بہن کے لڑکے) اور نواسی (میری دوسری بہن کی لڑکی) کے درمیان تقسیم کرنا پسند کریں گی، کوئی بھی رقم کسی بھائی یا ان کے بچوں کے لیے نہیں ہے، ہم پانچ بھائی اور دو بہنیں ہیں، سب باحیات ہیں، میرے بھائی لوگ ان کا آڈیو ٹیپ سنے بغیر اس وصیت کو یہ کہہ کر خارج کر رہے ہیں کہ میرے علاوہ دوسرے دو اور لوگ بہ طور گواہ کے ہونے چاہئیں، برائے کرم اس صورت حال کے بارے میں مجھ کو ایک فتویٰ عنایت فرماویں۔　(۲۲۲۷/ د ۱۴۳۰ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

آپ کے بھائی لوگوں کو مذکورہ آئڈیوٹیپ رکارڈ وصیت پر شبہ ہے اس لیے اس پر وہ یقین نہیں کر رہے ہیں؛ لہٰذا ان کی طرف سے دو گواہوں کا مطالبہ کیا جانا درست ہے، بغیر گواہ کے مذکورہ وصیت کا تسلیم کرنا ان پر لازم نہیں ہے: **قال في الدّرّ و إن سمعوا كلامه ولم يروه لا تجوز شهادتهم عليه لأنّ النّغمة تشبه عليه فتقع الشّبهة.** [۱] فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

(۱) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۶/۱۰ ۴۷، مسائل شتّٰی .

# قرض، سود اور سودی معاملات کے احکام

## لون، قرض، اور ''تحفہ'' کی تعریف اور ان کے درمیان فرق

**سوال:** ﴿۷۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

میں قرض حسنہ، لون، یا تحفہ کی صحیح تعریف جاننا چاہتا ہوں، کیوں کہ مجھے لون کے سلسلہ میں ایک پریشانی ہے جو کہ حسب ذیل ہے:

{۱} میرے چچا نے مجھے دس لاکھ روپیہ کا بینک چیک دیا، اور کہا کہ لو اس کو رکھ لو اور بہن اور کزن کی تعلیم اور اپنے گھر اور والد کی دوکان کے لیے استعمال کرو، میری ماں اور بہن گواہ ہیں، اب چار سال کے بعد میرے چچا وہ پیسہ واپس مانگ رہے ہیں (دس لاکھ) اور میں نے اس کو اپنے والد اور روزانہ کے اخراجات میں استعمال کر دیا ہے، اب اس پریشانی کا کیا حل ہے؟ مجھے بتائیں کہ کیا یہ لون ہے یا نہیں؟؛ کیوں کہ میرے چچا نے کبھی نہیں کہا کہ میں تم کو لون دے رہا ہوں اور تم اس کو مجھے چار سال یا اس کے بعد واپس کرنا۔

{۲} برائے کرم سود کا مطلب بتائیں، نیز مختلف بینکوں کے ذریعہ کار فائنانسنگ کے بارے میں بتائیں، کیا یہ سود ہے یا نہیں؟ (۱۱۳۸/د ۱۴۲۹ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق:**

''قرضہ حسنہ'' اس قرض کو کہتے ہیں جو کسی شخص کی ضرورت پر یا اس کے طلب پر دیا جائے، قرض حسنہ

میں دینے والے کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اجر آخرت کی امید ہوتی ہے، سود لینا نہیں ہوتا(۱)

لون: انگریزی لفظ ہے، قرض کو کہتے ہیں جس میں کبھی مع سود واپسی مشروط ہوتی ہے۔(۲)

تحفہ: کسی کا دل خوش کرنے یا اظہار محبت وتعلق کے لیے جو چیز کسی کو ہبہ کی جائے اسے تحفہ، گفٹ، ہدیہ کہتے ہیں، اس میں مہدی لہ (جس کو تحفہ دیا جائے) کا دل خوش کرنا، یا اس سے اظہار محبت وتعلق یا اس کا اکرام کرنا مقصود ہوتا ہے (جائز موقعہ پر اچھی نیت کی وجہ سے) ثواب اس پر بھی ملتا ہے۔(۳)

**{۱}** صورتِ مسئولہ میں آپ کے چچا نے چیک دیتے وقت یہی الفاظ کہے تھے کہ ''لو اس کو رکھ لو اور بہن کزن'' الخ، اس کے علاوہ کوئی جملہ نہیں کہا تھا جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ طور قرض دے رہے ہیں تو ایسی صورت میں مذکورہ چیک ہبہ اور توکیل کے قبیل سے ہوا، (۴) یعنی آپ کو بلاعوض وہ چیک دے کر مذکورہ مصارف (بہن کزن کی تعلیم الخ) میں خرچ کرنے کا وکیل بنایا ہے؛ لہٰذا آپ نے اگر مذکورہ مصارف میں خرچ کردیا تو آپ بری الذمہ ہو گئے اور اس رقم کی واپسی آپ پر واجب نہیں ہے، نہ ہی آپ کے چچا کا مطالبہ کرنا جائز ہے؛ البتہ چچا نے چیک دیتے وقت ایسا کوئی جملہ بھی کہہ دیا ہو جس سے قرض (لون) ہونا ظاہر ہوتا ہو تو حکم بدل جائے گا۔

**{۲}**...... (الف) سود اس زیادتی کو کہتے ہیں جو عقد معاوضہ (مثلاً قرض) میں عوض (بدل) سے خالی ہو اور (دو معاملہ کرنے والوں میں سے) کسی ایک کے لیے پہلے سے طے کرلی جائے، جیسے

---

(۱) قرض حسنہ: بلا میعاد اور بلا سود قرض (فیروز اللغات) قرضِ حسن سے مراد وہ قرض ہے جس پر سود کا معاملہ نہ کیا جائے۔(فتاویٰ عثمانی: ۳/۲۰۰، مطبوعہ: نعیمیہ دیوبند)

(۲)(Loan) ما تعطيه من المثليات ليرد لك مثله في المستقبل .

(معجم لغة الفقهاء: ۱/۳۶۱)

(۳) هي (الهبة) لغةً : التّفضّل على الغير ، ولو غير مال ، وشرعًا : تمليك العين مجانا أي بلا عوض . (الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۸/۴۸۸)

(۴) وتصحّ (الهبة) بإيجاب كوهبت ونحلت و أطعمتك هٰذا الطّعام ولو ذلك على وجه المزاح ........... و تصحّ بقبول أي في حقّ الموهوب له .

(الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۸/۴۹۰، كتاب الهبة)

آپ نے کوئی رقم کسی سے قرض لی کہ ہم چھ ماہ بعد اسے واپس کریں گے اور قرض کا معاملہ اس شرط پر طے ہوا ہے کہ مثلاً پانچ سو روپئے زائد دینے ہوں گے تو یہ پانچ سو کی رقم سود ہوئی جس کا لینا اور دینا دونوں حرام ہے۔(۱)

(ب) اگر آپ کار خریدنے کے لیے بینک سے نقد رقم لیتے ہیں پھر اضافہ کے ساتھ اسے ادا کرتے ہیں، تو اضافہ جو دونوں کے درمیان طے ہوا ہے وہ اضافہ کی رقم سود ہوگی، اس طرح معاملہ کرنا جائز نہیں؛ البتہ کار فائنانسنگ اگر اس طریقہ پر کریں کہ بینک کار خرید کر اپنے سود کی رقم اصل قیمت میں شامل کر کے مجموعی رقم پر کار آپ کے بدست فروخت کردے، اور آپ مجموعی رقم قسطوں میں ادا کردیں تو یہ صورت جائز ہے، اس میں اگر چہ بینک نے سود کے نام سے اضافہ کیا ہے؛ مگر یہ اضافہ نقد قرض پر نہیں ہے؛ بلکہ کار کی قیمت پر ہے جس سے کار کی قیمت میں اضافہ ہوگیا اس طرح خریداری کرنا جائز ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: ظفیر الدین غفرلہٗ، حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ،

محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## قرض خواہ کا پتہ نہ چلنے پر اس کی طرف سے صدقہ کرنے کا حکم

**سوال:** ﴿۷۸﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

حضرت میں کافی عرصہ پہلے ابوظہبی میں تھا، وہاں میں نے ایک دوست سے کچھ درہم اُدھار لیے تھے، اس دوران میرا پاکستان آنا ہوا، اس دوست نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ اگر تم واپس نہ آسکو تو

(۱) هو فضل مال خال عن عوض شرط لأحد العاقدين في معاوضة مال بمال وعلّتهُ القدر والجنس ، فحرم بيع الكيلي والوزنيّ بجنسهِ متفاضلاً أو نسيئة ولو غير مطعوم .
(ملتقى الأبحر مع المجمع: ۱۱۹/۳، ط: فقيه الأمّة)

میری رقم میرے بینک اکاؤنٹ میں جو بنگلہ دیش میں ہے، بھیج دینا، میں نے جب ان کا اکاؤنٹ کسی صاحب سے چیک کروایا تو معلوم ہوا کہ ان کا اکاؤنٹ بند ہے، میرا سوال یہ ہے کہ آیا میں یہ رقم ان کے حق میں صدقہ دے سکتا ہوں کہ نہیں؟ اگر ہاں تو کس شرح سے؟ اس وقت تبادلہ زر کی شرح کچھ اور تھی آج کل کچھ اور ہے۔ (۱۳۱/ د ۱۴۳۱ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التوفیق :**

دوست سے رابطہ ہوجانے کی امید ہو تو ان سے رابطہ کر کے روپیہ بھیجنے کا طریقہ معلوم کرلیں، اور اگر رابطہ ہوسکنے کی امید نہ ہو تو ان کی طرف سے صدقہ کرسکتے ہیں؛ لیکن کبھی اگر آئندہ ملاقات ہوئی اور انہوں نے صدقہ کو منظور نہیں کیا؛ بلکہ اپنے درہم کا مطالبہ کیا تو دینا پڑے گا۔(۱) درہم قرض لینے کی صورت میں درہم کے ذریعہ ادائیگی واجب ہوگی، اگر ایسا نہ ہوسکے تو دوسری کرنسی سے ادا کرنے میں ادائیگی کے وقت کی شرح معتبر ہوگی۔

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۵/۱/ ۱۴۳۵ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیانِ دارالعلوم دیوبند

## سود سے متعلق چند سوالات کے جواب

**سوال:** ﴿۹۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

---

(۱) علیہ دیونٌ ومظالِمُ جهِلَ أربَابَها وأيسَ مَن عليه ذلك من معرفتهم فعليه التّصدّق بقدرها من ماله إلخ . (الدّرّ المختار)

وفي ردّ المحتار: وإن لم يجد المديون ولا وارثه صاحب الدّين ولا وارثه فتصدّق المديون أو وارثه عن صاحب الدّين برئ في الآخرة .

(الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۴۴۳/۶، كتاب اللّقطة)

(الف): سود کی تعریف کیا ہے؟

(ب): اور کیا موجودہ دور میں سود کے بغیر کاروبار ممکن ہے؟

(ج): نیز اسلام آنے کے بعد کتنے عرصے تک بلا سودی نظام چلتا رہا؟

(د): اور سب سے پہلے کس اسلامی مملکت یا کس اسلامی حکمراں نے غیر سودی نظام ترک کیا اور کیوں؟　　(۹۵/ د ۱۴۲۸ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

(الف): سود کی تعریف فقہائے کرام یہ کرتے ہیں: کیلی یا وزنی چیز کے تبادلہ میں دونوں فریق میں سے کسی ایک کو ایسی زیادتی کا ملنا جو عوض سے خالی ہو اور عقد میں مشروط ہو۔ (۱)

(ب): ضرور ممکن ہے خواہ کچھ دشواری اور تنگی کے ساتھ بہ شرطیکہ مال و دولت کی حرص زائد اور تکاثر بے جا سے بچا جائے اور جو اقل قلیل جز سود کا پھر بھی باوجود احتیاط واحتراز کے کاروبار میں شامل ہو جائے اس سے توبہ و استغفار کرتا رہے۔ حدیث میں پیشین گوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یقیناً لوگوں پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ کوئی بھی بغیر سود کھائے نہ بچ سکے گا، اور اگر کھایا نہیں تو کم از کم اس کا دھواں یا گرد تو پہنچ ہی جائے گا۔ (۲)

حاصل یہ ہے کہ حرام کو حرام سمجھ کر اس سے بچنے کی کوشش کرنا فرض ہے، اور مجبوری میں جو جز شامل ہو جائے اس سے استغفار ضروری ہے، اور مجبوری کی حالت کو اللہ بہتر جانتا ہے۔ **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ.** (۳)

(۱) فضل خالٍ عن عوض بمعيار شرعيّ مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة.
(تنوير الأبصار مع ردّ المحتار: ۷/۴۰۰)

(۲) ليأتين على النّاس زمان لا يبقى أحد إلاّ أكل الرّبا، فإن لم يأكله أصابه من بخاره قال ابن عيسىٰ: أصابه من غُباره. (أخرجه أبوداؤد: رقم: ۳۳۳۱، باب في اجتناب الشّبهات)

(۳) العنكبوت: ۴۵۔

(ج): اسلام سے قبل جاہلیت میں سودی لین دین کا رواج تھا، جب قرآن میں اس کی حرمت نازل ہوئی تو مسلمان پورے طور پر اس سے کنارہ کش ہو گئے اور ایک طویل زمانہ تک اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومتیں اس سے محفوظ رہیں۔

(د): سودی نظام کو عالم گیر پیمانہ پر سسٹم بنا کر پیش کرنا اور حکومتوں حتی کہ افراد کا اس میں ملوث ہو جانا اللہ تعالیٰ کی مبغوض جماعت یہودیوں کی کرشمہ سازی ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ فرمایا ہے۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، ظفیر الدین غفرلہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## سود کا نام بدلنے سے حکم نہیں بدلتا

**سوال:** ﴿۸۰﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

میں گھر کے لیے لون لے رہا ہوں، وہ مجھے ایک لاکھ پر دس ہزار روپیہ کارروائی فیس کے ساتھ واپس کرنے پڑیں گے، جو کہ قسطوں پر تقسیم ہوں گے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کارروائی فیس کے جو یہ دس ہزار روپئے وصول کیے جا رہے ہیں، سود میں شامل ہوں گے؟ جب کہ میں آٹھ لاکھ لون لے رہا ہوں تو دو لاکھ مجھے کارروائی فیس کے ساتھ دس لاکھ واپس کرنے ہیں، ماہانہ قسطوں میں؟

(۱۵۹۴/د۱۴۳۰ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب و باللّٰہ التّوفیق:

(۱) یعنی بڑے حرام کھانے والے (معارف القرآن: ۳/۱۳۸، ط: ربانی بک ڈپو)

جی ہاں زائد رقم سود کہلائے گی،(۱) جس کا لینا اور ادا کرنا دونوں حرام ہیں،(۲) خواہ سود کے نام سے ادا کیا جائے یا کارروائی فیس کے نام سے۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۸/ ۸/ ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## فکسڈ ڈپوزٹ اور اس پر ملنے والے سود کا حکم

**سوال:** ﴿۸۱﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟
بینک سے فکس ڈپوزٹ پر ملی سودی رقم کے سلسلے میں شریعت کیا کہتی ہے؟ (۱۷۵/ د ۱۴۲۹ھ )

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

فکس ڈپوزٹ میں اصل رقم سے زائد ملی ہوئی رقم سود ہے، اس کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے (۳) اور مال بڑھانے کی نیت سے فکس ڈپوزٹ کرانا بھی حرام ہے (۴) البتہ حفاظت کی کوئی دوسری صورت

(۱) هو (الرّبا) في الشّرع عبارة عن فضل مال لايقابلهٗ عوض في معاوضة مال بمال .

(الفتاوى الهندية : ۳/ ۱۱۷، كتاب البيوع ، الفصل السّادس في تفسير الرّبا وأحكامه)

(۲) ما حرم أخذه حرم إعطاؤه كالرّبا. (الأشباه والنّظائر: ص:۳۹۱، الفنّ الأوّل ، القاعدة الرّابعة عشر ، ط: زكريا ديوبند)

(۳) قال اللّٰه تعالىٰ : ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۷۵)

في جامع التّرمذي : عن ابن مسعودؓ قال : لعن رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم اٰكل الرّبا وموكلهٗ وشاهديه وكاتبه . (أخرجه التّرمذي : ۱/ ۵۳۰، رقم: ۱۲۰۶، كتاب البيوع ، باب ما جاء في اٰكل الرّبا)

(۴) وفي الدّرّ المختار : وفي الأشباه : كلّ قرض جرّ نفعًا حرام .

(الدّرّ مع الرّدّ: ۷/ ۳۹۴-۳۹۵، كتاب البيوع ، باب المرابحة والتّولية)

نہ ہونے کی بنا پر حفاظت کی غرض سے بینک میں (کرنٹ یا سیونگ اکاؤنٹ کے طور پر) رقم رکھ دینے کی شکل میں جو زائد رقم بہ نام سود اس کے اکاؤنٹ میں آئے اسے نکال کر غرباء، مساکین، مستحقین زکاۃ پر صدقہ کر دینا واجب ہے(۱) اپنے استعمال میں لانا ناجائز ہے۔

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۵/۵/ ۱۴۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## سود کی رقم سے گھر کا خرچ چلانا

**سوال:** ﴿۸۲﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

میرے والد صاحب نے بینک میں پیسہ جمع کروایا ہے، اور ہم سب اس جمع شدہ پیسہ سے آنے والے سود کو استعمال کرتے ہیں، ہماری مشترکہ فیملی ہے، مجھے رہنمائی چاہیے کہ اس سلسلہ میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میرے خیال میں یہ حرام ہے، اگر ایسا ہے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ (۳۰۰/د ۱۴۳۰ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق:**

سود کا استعمال کرنا حرام ہے، (۲) قرآن وحدیث میں اس پر سخت وعید آئی ہے، ایک درہم سود کا

---

(۱)......(الف) ما حصل بسبب خبيث فالسّبيل ردّهٗ .

(قواعدالفقه ، ص:۱۱۵، ط: دارالكتاب ديوبند)

(ب) وفي الشّامي: ويردّونها على أربابها إن عرفوهم، وإلّا تصدّقوا بها ؛ لأنّ سبيل الكسب الخبيث التّصدّق إذا تعذّر الرّدّ على صاحبه .

(الدّرّ مع الرّدّ: ۹/۵۵۳، كتاب الحظر والإباحة ، فصل في البيع)

(۲) ......(الف) ﴿وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾. (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۷۵)

(ب) ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۷۹)

جسے آدمی استعمال کرتا ہے اس کا گناہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ ہے۔(۱) آپ نرمی اور حکمت سے اپنے والد کو سمجھائیں اور سود کی قباحت ان کے دل میں بٹھائیں، براہِ راست نہ سہی تو والدہ کے توسط سے اس کی حرمت وقباحت گھر والوں کو بتلائیں،(۲) نیز اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کریں کہ آپ کا گھرانہ اس نحوست سے چھٹکارا حاصل کرلے۔ اگر والد صاحب سود کی رقم استعمال کرنے سے احتیاط کر لیتے ہیں تو فبہا، ورنہ اگر گھر کے خرچ کا پورا انحصار خالص سودی رقم پر ہے، دوسرا کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے تو آپ اپنے لیے جائز ذریعہ معاش کی فکر کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۰/۲/۱۳ھ
الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ
مفتیان دارالعلوم دیوبند

## سودی رقم انکم ٹیکس میں دینا کیسا ہے؟

**سوال:** ﴿۸۳﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟
کیا سود کے پیسے کو انکم ٹیکس میں بھر سکتے ہیں؟ (۶۷/د۱۴۲۹ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق:**

سود کی رقم جو آپ کے کھاتے میں آ گئی، اسے نکال کر غرباء ومساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے(۳)

---

**(۱) عن عبد اللّٰہ بن حنظلة غسیل الملائکة رضي اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیه وسلّم: درهم ربوا یأکلهٗ الرّجل وهو یعلم أشدّ من ستّة وثلاثین زنیة.**
**(رواه أحمد، رقم: ۲۱۹۵۷)**

**(۲) عن أبي سعید مرفوعًا: من رأی منکم منکرًا فلیغیّره بیدهٖ، فإن لم یستطع فبلسانهٖ، فإن لم یستطع فبقلبهٖ، وذلك أضعف الإیمان.**
**(رواه مسلم، رقم: ۴۹، باب بیان کون النّهي عن المنکر من الإیمان)**

**(۳) لأنّ سبیل الکسبِ الخبیث التّصدّق إذا تعذّر الرّدّ علٰی صاحبه.**
**(ردّ المحتار: ۵۵۳/۹، کتاب الحظر والإباحة، فصل في البیع)**

اپنے استعمال میں لانا درست نہیں۔ بعض علماء انکم ٹیکس میں دینے کی اجازت دیتے ہیں؛(۱) لیکن صدقہ کردینا زیادہ بہتر ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱/۳/ ۱۴۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن، عفا اللہ عنہ،محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری، ظفیر الدین غفرلہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## کمپنی از خود انشورنس کرادے تو ملازم کے لیے اس سے انتفاع کا حکم

**سوال:** ﴿۸۴﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

فی الحال میں عرب امارات میں ایک امریکی کمپنی میں کام کر رہا ہوں، ہماری کمپنی درج ذیل منافع دیتی ہے، براہِ کرم اس سلسلے میں حکم صادر فرمائیں، ہمیں زیورچ لائف انشورنس کمپنی سوئزرلینڈ کی طرف سے لائف انشورنس ملتا ہے، معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ میری موت ہونے کی صورت میں میری فیملی کو تین مرتبہ میری پوری سالانہ تنخواہ ملے گی اور مستقل کام کرنے پر قادر نہ ہونے پر میری تنخواہ میں سے 60% ملے گا۔ ہماری کمپنی انشورنس کمپنی کو روپئے دیا کرے گی، ہمارا کام صرف زیورچ کمپنی کو ایک فارم میں اپنی تمام تفصیلات اور تنخواہ کے سلسلے میں تفصیلات فراہم کرنا ہے، کیا اس طرح کے منافع حاصل کرنے کے لیے جانا جائز ہے؟ میں اس وقت فارم بھر رہا ہوں، واضح رہے کہ یہ پلان لازمی نہیں ہے اور کمپنی انشورنس کے لیے انشورنس کمپنی میں جو رقم جمع کرے گی وہ تنخواہ سے نہیں کاٹی جائے گی، یہ ایک اضافی سہولت ہوگی، ہم صرف فارم بھرنے کی صورت میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(۸۵۲/د ۱۴۲۹ھ)

---

(۱) ويستفاد ممّا في الدّرّ مع الرّدّ :

غصب دراهم إنسان من كيسه ، ثمّ ردّها فيه بلا علمه برئ ، وكذا لو سلّمهٗ إليه بجهة أخرىٰ كهبة ، أو إيداع ، أو شراء ، وكذا لو أطعمهٗ فأكله .

(الدّرّ مع الرّدّ:۹/ ۲۶۷، كتاب الغصب مطلب في ردّ المغصوب إلخ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

آپ نے جو تفصیل لکھی ہے اگر واقعۃً یہ درست ہے اور آپ خود کوئی رقم انشورنس کمپنی کو نہیں دیتے اور نہ ہی اپنی کمپنی سے انشورنس کرانے کا کوئی معاملہ کرتے ہیں؛ بلکہ آپ کی کمپنی از خود لائف انشورنس کمپنی میں آپ کی طرف سے رقم جمع کر دیتی ہے جس کا فائدہ بعد میں آپ کی فیملی کو حاصل ہوگا، تو آپ کی فیملی کے لیے اس رقم کا لینا درست ہوگا، نیز اس وقت انشورنس کمپنی میں اپنی تفصیلات پر مشتمل فارم کا بھرنا بھی آپ کے لیے درست ہے۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۰/ ۶/ ۱۴۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

محمد ظفیر الدین غفرلہٗ، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## سڑک حادثہ کے متأثرین کا انشورنس کمپنی سے معاوضہ لینا کیسا ہے؟

**سوال:** ﴿۸۵﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

اگر کسی کار چلانے والے سے حادثہ ہوجاتا ہے اور اس میں کسی کی موت ہوجاتی ہے یا کوئی زخمی ہوجاتا ہے تو کیا ڈرائیور کو زخمیوں کو یا مرحوم کے ورثہ کو معاوضہ دینا ہوگا؟ (ڈرائیور اور حادثہ کے شکار مرحوم یا زخمی دونوں مسلمان ہیں؛ لیکن غیر اسلامی ملک میں رہتے ہیں) اگر گاڑی انشورنس شدہ ہو (اس بات سے اتفاق ہے کہ انشورنس حرام ہے) اور انشورنس کمپنی زخمی شخص کو یا مرحوم کے ورثہ کو

---

(۱) يستفاد ممّا في الدّرّ المختار: هو (الرّبا) فضل ولو حكمًا ...... خالٍ عن عوض ...... بمعيار شرعيّ ...... مشروط ذلك الفضل لأحد المتعاقدين ...... في المعاوضة فليس الفضل في الهبة بربا، فلو شرى عشرة دراهم فضّة بعشرة دراهم وزاده دانِقًا، إن وهبه منهُ انعَدَمَ الرِّبَا ولم يفسد الشّراء. (الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۷/ ۳۹۸-۴۰۱، باب الرّبا)

معاوضہ دیتی ہے تو کیا اس سے ڈرائیور کو نجات مل جائے گی؟ اور کیا انشورنس کمپنی کی طرف سے ملنے والا معاوضہ زخمی افراد یا مرحوم کے ورثہ کے لیے حلال ہوگا؟ اور کیا انشورنس کمپنی سے اس طرح کا معاوضہ دلوانا درست ہوگا؟ (۳۷۲/د۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

گاڑی ڈرائیور کے چلانے سے چلتی اور حرکت کرتی ہے، بہ ذاتِ خود اس کے اندر چلنے کی صلاحیت نہیں ہے، جیسا کہ جانوروں میں ہوتا ہے؛ اس لیے گاڑی کی حرکت اور اس سے پیش آنے والے حوادث کی نسبت ڈرائیور کی طرف ہوگی؛ لہٰذا کار حادثہ کی وجہ سے اگر کوئی شخص مر جاتا ہے یا اس کو زخم لاحق ہوتا ہے تو شرعاً ڈرائیور کو خطاً قتل کرنے یا زخمی کرنے کا ملزم قرار دیا جائے گا، **تکملہ فتح الملہم** میں ہے: **والظّاهر أنّ سائق السّيّارة ضامن لما أتلفته في الطّريق سواء أتلفته من القدّام أو من الخلف ، و وجه الفرق بينها وبين الدّابّة على قول الحنفيّة أنّ الدّابّة متحرّكة بإرادتها فلا تنسب نفحتها إلى راكبها بخلاف السّيّارة ؛ فإنّها لا تتحرّك بإرادتها ، فتنسب جميع حركاتها إلى سائقها ، فيضمن جميع ذلك**(۱) لہٰذا حادثہ میں ہلاک ہونے والوں کے ورثاء یا اس میں زخم خوردہ لوگ معاوضہ کا مطالبہ کر سکتے ہیں؛ لیکن قتلِ خطأ میں معاوضہ و دیت کی ادائیگی شرعاً تنہا قاتل پر لازم نہیں ہوتی؛ بل کہ عاقلہ پر ہوتی ہے، اور شرعی اعتبار سے ملزم کے عاقلہ وہ لوگ ہوں گے جن کے ساتھ اس کا تناصر و تعاون کا تعلق ہو، مثلاً ہم پیشہ افراد، اہلِ قبیلہ، برادری کے لوگ۔ **والعاقلة أهل الدّيوان إن كان القاتل من أهل الدّيوان يؤخذ من عطاياهم في ثلاث سنين ............ ومن لم يكن من أهل الدّيوان فعاقلته قبيلته ؛ لأنّ نصرته بهم ، وهي المعتبرة في التّعاقل** (۲) لیکن غیر اسلامی ممالک میں قوانینِ اسلامیہ نافذ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر عمل بہت مشکل ہے؛ اس لیے اس طرح کے

---

(۱) تكملة فتح الملهم: ۲/۳۱۰، كتاب الحدود ، ط: أشرفي ، ديوبند .

(۲) الهداية: ۴/۶۴۵-۶۴۷ ۔

مما لک میں یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ انشورنس کمپنی کوملزم کے عاقلہ کے قائم مقام سمجھا جائے، اس کو عاقلہ بنانے کے لیے جو عقد ناجائز کیا گیا وہ دونوں کا اپنا عمل ہے، جس کے وہ خود ذمے دار ہیں؛ لیکن جب عرفاً وقانوناً وہ عاقلہ کے قائم مقام بن گئی تو اس سے وصول کرنے کی بھی گنجائش ہے، کفار چوں کہ مخاطب بالفروع نہیں ہوتے؛ اس لیے انشورنس کمپنی کے اموال کے اکثر حصہ کا عقودِ فاسدہ کے ذریعے حاصل ہونے کی بنیاد پر حرام ہونا، اس سلسلے میں مانع نہ بنے گا۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہٰ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۳/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## گاڑی کی ٹکر سے مرنے والے لوگوں کے اولیاء کا ڈرائیور کے خلاف مقدمہ کر کے رقم حاصل کرنا کیسا ہے؟

**سوال:** ﴿۸۶﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

زید کے دولڑکے اور ایک لڑکی (تینوں بالغ) بڑا لڑکا عمر تقریباً ۲۵ سال (جس کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی) گزشتہ ۲۰ر مئی ۲۰۱۲ء کو اپنی کار سے جے پور سے دلی جا رہا تھا اور علی الصبح جے پور شہر سے تقریباً ۷۰ر کیلو میٹر کی دوری پر اس کی کار آگے چل رہی ٹرک سے ٹکرا گئی اور لڑکے کی موقع پر ہی موت ہوگئی، انا للہ وانا الیہ راجعون، کفن دفن وجنازہ دوسرے دن جے پور میں کی گئی۔

زید نے جے پور شہر میں ریاست راجستھان کے ذریعہ قائم شدہ ایکسیڈنٹ کے معاملات کی عدالت میں دو ماہ بعد ٹرک ڈرائیور کے خلاف مقدمہ دائر کیا، عدالت نے جنوری ماہ میں ٹرک کے انشورنس کمپنی سے ہرجانہ کی کچھ رقم والدین کو دلائی ہے یہ عبوری معاوضہ ہے اور امید ہے کہ آگے اور بھی معاوضہ کی رقم دلائی جائے گی۔

---

(۱) مستفاد از فتاوىٰ عثماني: ۳/۵۴۵، فصل في القصاص والدّيات.

(۱) کیا والدین اس رقم کا مصرف اپنی ذات، بچوں کی تعلیم اور اُن کی شادی کرانے میں لے سکتے ہیں؟ (والدین پر زکاۃ فرض ہے)۔

(۲) اس رقم میں سے کسی مسجد کی تعمیر یا مرمت میں صرف کیا جا سکتا ہے؟

(۳) اس رقم میں سے کسی غریب کو صدقہ کے مد میں دیا جا سکتا ہے؟

(۴) اس رقم پر اور آگے ملنے والی رقم پر کیا زکاۃ فرض ہوگی؟

(۵) اس رقم کو یا آگے ملنے والی رقم کا بہتر مصرف کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

العارض: محمد شکیل اختر

(۴۲۳/د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

حادثے کی جو صورت استفتاء میں بیان کی گئی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ٹرک آگے چل رہا تھا اور زید کا لڑکا اپنی کار اس کے پیچھے چلا رہا تھا، پھر اچانک اس کی کار آگے چل رہے ٹرک سے ٹکرا گئی، جس کے نتیجے میں یہ حادثہ پیش آیا، اگر واقعۃً یہی صورت تھی، تو اگر ٹرک ڈرائیور کی کسی غلطی یا لا پرواہی یا ضابطہ (ٹرافک رول) کی خلاف ورزی کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا، تو یہ قتل خطاء کے درجے میں ہوگا جس میں قاتل (ڈرائیور) کے عاقلے پر دیت لازم ہوتی ہے(۱) اور غیر اسلامی ممالک میں انشورنس کمپنی کو ''عاقلہ'' کا درجہ دیا جا سکتا ہے؛ (۲) اس لیے اس سے جو کچھ رقم ملی یا آگے ملے گی سب بہ حکم

(۱) والثّالث خطأ، وهو نوعان ......... وموجبه الكفّارة والدّية على العاقلة والإثم دون إثم القتل. (الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۱۰/۱۶۰-۱۶۱، كتاب الجنايات)

(۲) فالحاصل أنّ قضاء عمر بمحضر من الصّحابة – رضي الله عنهم – دلّ على أنّ الحكم كان مناطه النّصرة، فيتغيّر بتغيّره، ويمكن أن يقال في عصرنا إنّ التّناصر أصبح للعمّال بوفاقهم الّذي يسمّى " تريد يونين" وللسّياسيين بأحزابهم السّياسية فينبغي أن تكون عاقلة عامل رفاقه، وعاقلة سياسي حزبه السّياسي إلخ.

(تكملة فتح الملهم: ۲/۲۲۵، ط: أشرفي، ديوبند)

دیت ہوگی اور اس میں وراثت جاری ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں پوری رقم کا ایک تہائی ماں کو اور باقی باپ (زید) کو ملے گی، باپ یا ماں کو اختیار ہے اپنے حصے کی رقم کو جہاں چاہیں خرچ کریں، ان کے پاس رہے گی، تو زکاۃ بھی واجب ہوگی؛ لیکن ٹرک ڈرائیور اگر صحیح طریقے پر اپنی گاڑی چلا رہا تھا، اس کی طرف سے کسی طرح کی کوئی کمی نہیں پائی گئی، زید کے لڑکے کی کار اچانک کسی وجہ سے ٹرک سے ٹکرا گئی، تو ایسی صورت میں چوں کہ ٹرک ڈرائیور کا کوئی قصور نہیں ہے؛ اس لیے اس کے خلاف مقدمہ کرنا یا ہرجانہ لینا شرعًا جائز نہیں ہے(۱)

**يستفاد ممّا في الدّرّ: وَمَنْ ضَرَبَ دَابّةً عَلَيْهَا رَاكِبٌ أوْ نَخَسَهَا بِعُوْدٍ بِلَا إذْنِ الرّاكِبِ، فنفحت أو ضربت بيدها شخصًا آخر غير الطّاعنِ، أو نفرت فصدمته وقتلته ضمن هو، أي النّاخس، لا الرّاكبُ قال الشّامي لأنّه غَيرُ مُتَعدٍّ فَتَرَجَّحَ جَانِبُ النّاخِسِ فِي التّغْرِيْمِ للتّعدّي.**

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۴/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## کریڈٹ کارڈ کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

**سوال:** ﴿۸۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

میں ایسے ملک میں رہتا ہوں، پورے ملک میں موجودہ نامساعد حالات کی وجہ سے نقد رقم لے جانے کی کوئی اجازت نہیں دیتا ہے، ڈاکوؤں اور چوروں سے مزاحمت کرنے پر بہت سارے لوگ قتل کردئے گئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ انٹرنیٹ کے ذریعہ کسی بھی چیز کا خریدنا بہت آسان ہوگیا ہے، ان حالات میں کریڈٹ کارڈ کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ میں اپنے استعمال ہونے والے بہت سے سامان جیسے کمپیوٹر کے سامان وغیرہ نیٹ پر دیکھتا ہوں، یہ سب سامان یا تو مارکیٹ میں

(۱) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۱۰/۲۸۰۔

دستیاب نہیں ہوتے یا عام طور پر نہیں ملتے ہیں۔ یہاں کوئی بھی اسلامی بینک کریڈٹ کارڈ کی پیش کش نہیں کرتا ہے، اگر مجھے یہ استعمال کرنا ہے تو یہ کسی ایسے بینک سے ہوسکتا ہے جو جزئی یا کلی طور پر اسلامی بینک نہیں ہے۔ براہ کرم، میری رہنمائی فرمائیں۔　　　(۲۱۶۹/ د ۱۴۲۸ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

کاروباری ضرورت یا مالی تحفظ کی غرض سے کریڈٹ کارڈ لینے اوراس کے استعمال کرنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ پہلے سے اکاؤنٹ کھلوالیا جائے تاکہ کارڈ جاری کرنے والا ادارہ اپنا قرض وہاں سے وصول کرلے، اوراگر اکاؤنٹ سے فی الحال قرضہ منہا کرنے کا انتظام نہ ہوتو اس کی انتہائی احتیاط برتی جائے کہ جاری کردہ بلوں کی قیمت مقررہ مدت کے اندر ادا کردی جائے تاکہ ان پر سود لاگو نہ ہوسکے؛ کیونکہ سود کا ادا کرنا حرام ہے، یہ کارڈ غیر اسلامی بینک سے بھی لے سکتے ہیں۔(۱)

الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، ظفیر الدین غفرلہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## مال مرہون سے انتفاع کا حکم

**سوال:** ﴿۸۸﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

زید نے اپنا مکان عادل کو بنا بھاڑے کے صرف پانچ لاکھ جمع کرنے پر دے دیا ہے، اور عادل اپنی مرضی سے زید کو بھاڑے کے طور پر ایک سو پچاس روپئے ہر ماہ دیتا ہے، اب عادل نے زید کے مکان کو ساحل سے ایک لاکھ روپئے جمع لے کر تین سو روپئے پر بھاڑے کے طور پر دے کر آمدنی کا ذریعہ بنالیا ہے، کیا ایسا کرنا درست ہے؟　　　(۱۷۸۳/ د ۱۴۳۱ھ)

(۱) القرض لا یتعلّق بالجائز من الشّروط فالفاسد منها لا یبطله ولکنه یلغو شرط ردّ شيء آخر إلخ . (الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۳۹۴/۷، مطلب في شراء المستقرض القرض)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

بنا بھاڑے کے پانچ لاکھ روپیہ جمع کرنے پر عادل کو جو مکان ملا ہے، اس میں رہائش اختیار کرنا عادل کے لیے درست نہیں؛ کیوں کہ یہ مکان رہن کے طور پر ہے، اور رہن سے انتفاع حاصل کرنا جائز نہیں (۱) پھر ایک سو پچاس روپیہ بہ طور کرایہ دے کر ساحل سے ایک لاکھ جمع لے کر اسے تین سو پر کرایہ پر دینا بھی جائز نہیں اور مقروض کی ملکیت سے کم کرایہ دے کر فائدہ اٹھانا بھی ایک طرح کا سود لینا ہے۔ **کلّ قرضٍ جرّ نفعًا فھو ربًا** (۲) پس یہ معاملہ ناجائز امور پر مشتمل ہوا؛ اس لیے جائز نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۹/۱۱/۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

(۱) عن عبد اللّٰہ محمّد بن أسلم السّمر قنديّ ......... أنّه لا يحلّ له أن ينتفع بشيء منه (الرّهن) بوجه من الوجوه و إن أذن له الرّاهن ؛ لأنّه إذن له في الربوا إلخ .

(ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۸۳/۱۰)

(۲) كلّ قرضٍ جرّ منفعة فهو ربًا . (مصنّف ابن أبي شيبة، رقم: ۲۰۶۹۰، باب من كره كلّ قرضٍ جرّ منفعة)

# اجارہ اور ملازمت سے متعلق مسائل

## رشتۂ نکاح طے کرانے کا معاوضہ لینا

**سوال:** ﴿۸۹﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟
کمیشن کی آمدنی حلال ہے یا حرام؟ مثلاً ایک آدمی کا کام نکاح کے رشتے لگانا ہے اور رشتہ طے ہو جانے کے بعد وہ لڑکے اور لڑکی دونوں سے کمیشن لیتا ہے، یا کوئی ریل کا ٹکٹ ریل اسٹیشن سے بک کر کے لا دیتا ہے اور مسافر سے کمیشن لیتا ہے، کیا شریعت اسلام میں یہ کمائی حلال ہے؟
(۹/ ۷ / ۱۴۳۲ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**
رشتے طے کرانے میں آمد و رفت اور سعی کی اجرت اگر پہلے سے طے کر لی جائے تو معینہ اجرت کا لینا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ کسی قسم کی دھوکہ دہی نہ ہو، نہ اپنی وجاہت کا دباؤ ڈالا ہو (اگر ساعی باوجاہت شخص ہے) ایسی صورت میں جس سے اجرت لینے کا معاملہ پہلے سے طے کیا ہے اس سے متعینہ اجرت لینا جائز ہے، اگر دونوں سے طے کیا ہے تو دونوں سے لینا جائز ہے۔(۱)

---

(۱) ...... (الف) يُسْتَفَادُ مِمَّا في الدّرّ مع الرّدّ: إجارةُ السِّمْسَارِ والْمُنَادِي وَالْحَمَّامِيِّ والصَّكَّاكِ وَ مَا لاَ يُقَدَّرُ فيهِ الوقتُ ولاَ العَمَلُ ، تجوزُ لِمَا كانَ للنّاسِ به حَاجةٌ ، ويَطِيْبُ الأَجْرُ المَأْخُوْذُ لَوْ قُدِّرَ أَجْرُ المِثْلِ إلخ .
(ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۹/ ۶۴، باب الإجارة الفاسدة)
(ب) امداد الفتاویٰ: ۳/ ۳۹۳۔

اسی طرح ٹکٹ بک کرنے کی اجرت لینا جب کہ وہ طے شدہ ہو جائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۳/۱/۱۴۳۲ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام غفرلہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## ٹریول ایجنسی میں ملازمت کا حکم

**سوال:** ﴿۹۰﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

کیا ٹریول ایجنسی میں بہ حیثیت اکاؤنٹینٹ کام کرنا اسلام میں جائز ہے یا نہیں؟ براہ کرم جواب دیں۔ (۹۲۴/ د ۱۴۲۸ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللہ التّوفیق:**

ٹریول ایجنسی میں ہوائی جہاز، ٹرین کے سیٹوں کی بکنگ کرائی جاتی ہوگی یا لوگوں کی فرمائش پر بڑی چھوٹی گاڑیاں ان کے لیے بک کردی جاتی ہوں گی اور ایجنسی والے اپنا حق الخدمت مقررہ اجرت کے مطابق لیتے ہوں گے، اس طرح کی ایجنسی میں بہ حیثیت اکاؤنٹینٹ کام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے؛ جائز ہے۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴/۱۱/۱۴۲۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

مفتیان دارالعلوم دیوبند

(۱) استعان برجل في السّوق ليبيع متاعه فطلب منه أجرًا ، فالعبرة لعادتهم ، وكذا لو أدخل رجلًا في حانوته ليعمل له .

(الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۹/۵۷، كتاب الإجارة)

## انٹرنیٹ کے ذریعے اشتہارات پر کلک کر کے پیسے کمانے کا حکم

**سوال:** ﴿۹۱﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

سوال یہ ہے کہ آج کل (پی ٹی سی) قومی اور بین الاقوامی کمپنیاں اپنا اشتہار دیتی ہیں اور لوگوں کو فری اکاؤنٹ بنانے کا آفر کرتی ہیں پھر پی ٹی آئی (کلک کرنے پر پیسے ملیں گے) کے نام پر اشتہار دے کر لوگوں سے اپنے اشتہار پہ کلک کرواتی ہیں اور لوگوں کو اس کے بدلے میں پیسے دیتی ہیں کیا یہ رقم حلال ہے یا نہیں؟ براہ کرم، اس کا جواب دے کر میری مشکل کو حل فرمائیں، اللہ آپ کا اور ہمارا حامی اور ناصر ہو۔ (۱۴۱۳/د۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰه التّوفيق:**

صورتِ مسئولہ میں اگر اشتہارات ناجائز تجارتوں (مثلاً فلم انڈسٹری، انشورنس، شراب وغیرہ) سے متعلق ہوتے ہیں یا وہ اشتہارات حرام اور ناجائز چیزوں (مثلاً خواتین کی تصویر، ہیجان انگیز فلمی سین وغیرہ) پر مشتمل ہوتے ہیں، تو ان پر کلک کرنا اور پیسہ لینا ناجائز ہے؛ (۱) اس لیے کہ یہ تعاون علی الاثم میں داخل ہے، جس سے قرآن نے منع کیا: ﴿ **تَعَاوَنُوْا عَلٰی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلاَ تَعَاوَنُوْا عَلٰی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَان** ﴾ (۲) ہاں اگر مباح تجارات سے متعلق اشتہارات ہوں اور ان میں کوئی ناجائز چیز شامل نہ ہو تو چوں کہ ملنے والی رقم اپنا وقت صرف کر کے کلک کرنے کا معاوضہ بن سکتی ہے؛ اس لیے یہ شرعاً حلال ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۱۱/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

(۱) لا تصحّ الإجارة لعسب التيس ...... ولا لأجل المعاصي مثل الغناء والنّوح والمَلاَهي إلخ. (الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۹/۷۵)

(۲) المائدة: ۲۔

# بینک کی ملازمت اور سودی حساب سیکھنے کا حکم

**سوال:** ﴿۹۲﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

(۱) کہ بینک میں ملازمت کرنا کیسا ہے؟

(۲) اور بینک کا کورس کرنا محض بینک میں ملازمت کی وجہ سے یہ کیسا ہے؟

(۳) اور اگر کوئی شخص پہلے سے ہی بینک میں ملازمت کر رہا ہے اور جب اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ صحیح نہیں ہے تو کیا وہ شخص اس ملازمت کو چھوڑ دے گا یا نہیں؟ مکمل و مدلل بالتفصیل جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔　　　فقط والسلام

مستفتی: محمد طالب کٹیہار

(۲۹۲/د ۱۴۳۶ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق:**

(۱) بینک میں ایسی ملازمت جس میں سود کی لکھا پڑھی کرنی پڑے یا سودی دستاویز کی تصدیق یا منظوری دینی پڑے ناجائز ہے (۱) ایسے کام کی تنخواہ بھی ناجائز ہے (۲)

(۲) بینک کے کورس میں اگر فرضی سود کے حساب کی مشق کرائی جاتی ہے، تو اس طریقۂ حساب کے سیکھنے سکھانے کی گنجائش ہے (۳) اسے آدمی دوسری جگہ کام میں لاسکتا ہے؛ لہٰذا اس نیت سے نہ سیکھے کہ ہم بینک ہی میں ملازمت کریں گے، اور اگر کوئی مخصوص کورس ایسا ہے جو بینک ہی میں کام آتا ہے دوسرا کوئی استعمال یا فائدہ اس کورس کا نہیں ہے تو اس کا حکم مختلف ہوگا۔

---

(۱) عن جابر قال: لعن رسول اللّٰه – صلّى اللّٰه عليه وسلّم – آكل الرّبا ومؤكله، وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء. (أخرجه مسلم: ۲/ ۲۷، رقم: ۱۵۹۸، باب لعن آكل الرّبا ومؤكله)

(۲) لا تصحّ الإجارةُ لعسب التَّيْسِ وهو نزوه على الإناث ولا لأجل المعاصي .

(الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۹/ ۷۵)

(۳) مستفاد از امداد الفتاویٰ: ۴/ ۱۷۴، سوال: ۲۲۳۔

(۳) اگر سودی لین دین اور اس کا حساب و کتاب لکھنے کی ملازمت ہے، تو اسے چاہیے کہ دوسرا جائز ذریعہ معاش تلاش کرنے کی سعیٔ بلیغ کرے اور اللہ سے توبہ و استغفار بھی کرتا رہے، جیسے ہی دوسرا ذریعہ فراہم ہو جائے، تو اسے ترک کردے؛ کیوں کہ حدیث میں جس طرح سود لینے اور دینے والے پر لعنت بھیجی گئی ہے، اسی طرح اس کی لکھا پڑھی کرنے اور گواہ بننے والے پر بھی لعنت بھیجی گئی ہے، یہ حدیث **مشكاة المصابيح ، باب الرّبا** میں ہے۔

كتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۹/۳/۱۴۳۶ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## کرایہ دار کا مکان کسی اور کو کرایہ پر دینا

**سوال:** ﴿۹۳﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

زید نے ایک گھر خریدا اور میں نے اس سے اس گھر کو 2000 روپے کرایہ پر لیا، میں نے اس کو مالک سے پوچھے بغیر کسی اور کو 3000/روپئے کرایہ پر دے دیا، مالک کو پتا نہیں ہے، تو کیا یہ جائز ہے؟ مالک کو پتا لگے تو میری خیر نہیں ہے۔ (۱۵۱۲/د ۱۴۳۱ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و بالله التوفيق :**

جتنی مدت کے لیے آپ نے کرایہ پر لیا اس مدت کے اندر تک کسی کو کرایہ پر بھی دے سکتے ہیں، بہ شرطیکہ مالک کی اجازت ہو اور اسی کرایہ پر یا اس سے کم پر دیں، بدون اجازت کے نہیں۔ **قال في الشّامية : والمستأجر ليس له أن يؤجر لغيره مركوبًا كان أو ملبوسًا إلاّ بإذن.** (۱)

---

(۱) ردّ المحتار على الدّرّ المختار : ۸/ ۴۷۷، كتاب العارية .

و له السّكنٰى بنفسه و إسكان غيره بإجارة و غيرها ، و كذا كلّ ما لا يختلف بالمستعمل يبطل التّقييد لأنّه غير مفيد بخلاف ما يختلف به كما سيجيء ، ==

ہاں اگر خلافِ جنس کرایہ مقرر کریں یا آپ (کرایہ دار) نے مکان میں کچھ ٹھیک ٹھاک کرایا ہو تو زائد کرایہ پر بھی دے سکتے ہیں۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۹/ ۹/ ۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## اجیر اگر عمل کے دوران زخمی ہوجائے یا مرجائے تو مستأجر پر اس کا ضمان واجب نہیں

**سوال:** ﴿۹۴﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

میں ایک پرائیویٹ فیکٹری میں کام کرتا ہوں، اس میں ایک آدمی کا دایاں ہاتھ مشین میں آ گیا، جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ کی چار انگلیاں کٹ گئیں، اس کے علاج پر جو بھی خرچ آیا وہ کمپنی نے برداشت کیا، جو تقریباً ۱۳۵۰۰۰/ر تھا، اب جب کہ وہ آدمی صحیح ہوگیا ہے تو وہ کمپنی سے اپنا حق مانگ رہا ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ شریعت میں اس شخص کا کیا حق ہے؟ براہِ کرم احادیث کی روشنی میں بتائیں۔

(۶۰۹/ د ۱۴۳۱ھ)

== ولو آجر بأكثر تصدق بالفضل إلّا في مسألتين: إذا آجرها بخلاف الجنس، أو أصلح فيها شيئًا . (الدّرّ مع الرّدّ: ۹/ ۳۸)

(۱)......(الف) للمستأجر أن يؤجر الموجر أي ما ستأجره بمثل الأجرة الأولٰى أو بأنقص ، فلو بأكثر تصدق بالفضل إلّا في مسألتين . (ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۹/۱۲۵)

(ب) إذا اجرها بخلاف الجنس ، أو أصلح فيها شيئًا .

(ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۹/۳۸)

(ج) وفيما لا يختلف فيه بطل تقييده به كما لو شرط سكنى واحد له أن يسكن غيره لما مرّ أنّ التّقييد غير مفيد . (الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۹/۴۸)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

سوال سے یہ واضح نہیں ہے کہ یہ شخص کس قسم کا حق اور کس بنیاد پر مانگ رہا ہے؟ باقی بہ غرض علاج کمپنی نے جو روپئے دے دیئے وہ اس کا تبرع ہے، انگلیاں کٹنے کا کوئی ضمان کمپنی والوں پر واجب نہیں ہے: **جاء في الحديث والمعدن جبار**(۱) **وذكر في تكملة فتح الملهم نقلاً عن الحافظ فلو حفر معدنا في مِلكهٖ أوفي موات فوقع فيه شخص فمات فدمه هدر، وكذا لو استأجر أجيرًا يعمل لهٗ فانهار عليه فمات ، ويلتحق بالبئر و المعدن في ذلك كلّ أجير على عمل كمن استؤجر على صعود نخلة فسقط منها فمات.**(۲) عبارت مذکورہ سے صاف واضح ہے کہ کمپنی پر کوئی ضمان واجب نہیں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۱/۴/۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفر لہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

**(۱) أخرجه الإمام مسلم في صحيحهٖ: ۲/۷۳، رقم:۴۴۳۱، باب: جرح العجماء والمعدن والبئر جبار.**

**(۲) تكملة فتح الملهم:۸/۳۱۱، في نهاية كتاب الحدود ، ط: أشرفي ديوبند .**

# طب اور سائنس سے متعلق مسائل

## ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا حکم

**سوال:** ﴿۹۵﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

آج کل ڈاکٹروں نے بے اولاد جوڑوں کے لیے ایک طریقۂ علاج یہ نکالا کہ شوہر یا بیوی میں اگر اس طرح کی کوئی کمی ہے جس کی وجہ سے فطری طریقہ کے مطابق تولید نہ ہوسکتی ہو تو شوہر کی منی کو بہ ذریعہ مخصوص آلہ بیوی کے رحم میں پہنچا دیتے ہیں اور اس کی صورت عموماً یہ ہوتی ہے کہ شوہر کی منی اور عورت کا بیضۃ المنی حاصل کر کے ایک مخصوص ٹیوب میں متعینہ مدت تک بارآوری کی جاتی ہے، پھر اس آمیزہ کو بہ ذریعہ آلہ رحم میں پہنچا دیا جاتا ہے، اس کے بعد عورت امید سے ہوجاتی ہے، نیز بسا اوقات شوہر کی منی کو خارجی بارآوری کے بغیر عورت کے رحم میں پہنچا دیا جاتا ہے، اسی طرح اگر کسی عورت کے اندر یہ کمی ہو کہ اس کا بیضۃ المنی قابلِ تولید نہیں، البتہ رحم قابل تولید ہے تو شوہر کی دوسری بیوی کا بیضۃ المنی لے کر شوہر کی منی کے ساتھ آمیزش کر کے اس عورت کی رحم میں ڈال دیتے ہیں جس کا بیضۃ المنی نہیں ہے پھر وہ عورت باذن اللہ امید سے ہوجاتی ہے اور بعد میں فطری طریقے کے مطابق بچہ جنتی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے:

کہ مذکورالصدر دونوں طریقے شرعاً جائز ہیں یا نہیں؟

برصورتِ عدمِ جواز اگر کسی نے کرلیا تو بچہ ثابت النسب ہوگا یا نہیں؟

نیز ثانی الذکر صورت میں بچے کی ماں کون بنے گی؟ جس کے رحم سے بچہ پیدا ہوا وہ یا جس کا بیضۃ المنی لیا گیا؟

واضح رہے کہ آج کل مصنوعی بارآوری کے لیے یہ اور دوسرے بہت سے طریقے طبی اداروں میں رائج ہیں، اور لوگ انہیں اپنا رہے ہیں، اور بعض صورتوں کے بارے میں کچھ علماء نے (جواز کا) فتویٰ دیا ہے، اس لیے حضرات مفتیانِ کرام سے گزارش ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیلی جوابات سے نوازیں۔ (۴/۷/د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

سوال میں مذکور دونوں طریقے شرعًا جائز نہیں، ایک تو اس لیے کہ اس طریقہ کو اپنانے میں خاتون کا عورتِ غلیظہ یعنی ناف سے لے کر گھٹنے تک کا حصہ اجنبی ڈاکٹروں؛ بل کہ بسا اوقات ڈاکٹروں اور معاونین کی ایک ٹیم کے سامنے کھولنا تقریبًا لازمی ہے، جب کہ عورت کے لیے ستر کا یہ حصہ نہ مرد کے سامنے کھولنا جائز ہے اور نہ ہی عورت کے سامنے،(۱) ہاں عورت کسی جسمانی تکلیف یا مرض کی شکار ہو کہ علاج کے لیے ستر نہ کھولے جانے کی صورت میں سخت نقصان پہونچنے یا جان جانے کا خطرہ ہو تو بہ قدرِ ضرورت ستر غلیظہ بھی کھولنے کی گنجائش ہے؛ لیکن اس صورت میں بھی ابتداءً ضروری ہے کہ شوہر کسی خاتون ڈاکٹر سے رابطہ کرے یا کسی خاتون کو اس کا طریقہ سکھا دے وہ علاج کرے آخری درجہ یہ ہے کہ کوئی مرد اس کا علاج کرے۔(۲)

صورتِ مسئولہ میں ایسی کوئی جسمانی تکلیف درپیش نہیں ہے؛ بل کہ یہ محض جلبِ منفعت ہے، اگر عورت کے اندر کمی ہے تو مرد کے لیے دوسری شادی کر کے تحصیل اولاد کے خواہش کی تکمیل ممکن ہے۔

(۱) فتنظر المرأة من المرأة إلى سائر جسدها إلاّ ما بين السّرة والرّكبة .

(بدائع الصّنائع: ۲۹۹/۴، زكريا)

(۲) فإن لم توجد إمرأة تعلم المداوة ولا امرأة تتعلّم وخيف عليها الهلاك ، أو بلاء ، أو وجع لا تحمله يداويها الرّجل ؛ لكن لا يكشف منها إلاّ موضع الجرح ، ويغض بصره ما استطاع .

(بدائع الصّنائع : ۲۹۹/۴)

نیز عدمِ جواز کی دوسری بڑی وجہ اختلاطِ نسب ۔ جس کی شریعت نے بہت تاکید کی ہے ۔ کا اندیشہ ہے؛ اس لیے کہ ٹسٹ ٹیوب بے بی سے متعلق جانکاری رکھنے والوں کی تحریریں پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کا بیضۃ المنی اور مرد کی منی لے کر باہم ملانے کے بعد ایک ٹیوب میں آبیاری کرتے ہیں، جس کی مدت کم وبیش دو دن یا چار دن ہے، پھر عورت کے رحم میں مناسب جگہ پر اس کو پیوست کرتے ہیں اور یہ کام انتہائی مشکل ہوتا ہے؛ اس لیے کہ یہ لقیحہ (آمیزہ) رحم میں بہ آسانی چپکتا نہیں ہے؛ بلکہ بسا اوقات کئی کئی بار یہ کوشش ڈاکٹروں کو کرنی پڑتی ہے؛ اس لیے عموماً ڈاکٹروں کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ عورت سے حاصل کردہ بیضۃ المنی (جو بے شمار جراثیم پر مشتمل ہوتا ہے) کی مختلف ٹیوب میں آبیاری کرتے ہیں، اب اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ اگر یہ آمیزے بچ جائیں تو ڈاکٹر اسے ضائع کر دیں گے، جب کہ مخصوص آلہ کے ذریعے عورت کا بیضۃ المنی لینا پھر مرد کی منی کے ساتھ اس کا ''لقیحہ'' تیار کرنا انتہائی مشکل مرحلہ ہوتا ہے، چنانچہ **مجلّة مجمع الفقه الإسلامي** (عدد:۲،ص:۱۸۶) میں اس سے متعلق کافی تفصیل مذکور ہے۔

نیز ٹیسٹ ٹیوب بے بی (IVF) کا طریقہ ایجاد ہونے کے بعد ہسپتالوں میں باقاعدہ منی بینک کا انتظام ہوتا ہے، جس میں مختلف صلاحیتوں کے حامل مردوں (مثلاً فنکار، کھلاڑی، سیاست دان، کالے، گورے) کی منیاں محفوظ رکھی جاتی ہیں، اور حسبِ ضرورت عورتیں ان منیوں سے حاملہ ہوتی ہیں؛ بلکہ آج کل بہت سی کمپنیاں وجود میں آچکی ہیں جو طبی مراکز اور ہسپتالوں کے لیے منیاں، کرائے کی مائیں وغیرہ فراہم کرتی ہیں، جن ہسپتالوں میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی سہولیات فراہم ہوتی ہیں، اکثر جگہ وہاں منی بینک نیز کرائے کی کوکھ کا بھی ضرور انتظام ہوتا ہے، یہ ساری چیزیں انسانیت اور نسبِ انسانی کے ساتھ کیا سراسر مذاق نہیں ہے؟ کیا ان دین بیزار؛ بل کہ اسلامی اصول کے معاندین سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ مرد سے حاصل کردہ منی کو اس کی بیوی ہی کے رحم میں ڈالیں گے! یا اس سے بچے ہوئے حصے کو ضائع کر دیں گے؟ نیز کیا دین؛ بلکہ نسلِ انسانیت کو مذاق بنانے والے ڈاکٹروں سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے عمل میں منشأ شریعت کے مطابق اختلاط نسب سے بچانے کی احتیاط ملحوظ رکھیں گے؟ ہرگز نہیں؛ اس لیے کسی مسلمان کے لیے جو اللہ اور اسلامی اصولوں پر ایمان رکھتا ہے، ہرگز

جائز نہیں کہ اس طریقۂ تولید کو اپنائے، اگر چہ خاتون ڈاکٹر ہی سارا کام انجام دے، اکابر اربابِ افتاء میں سے حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ نے منتخبات نظام الفتاویٰ:(۳/۳۰۹-۳۱۱) میں حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ نے احسن الفتاوی (۸/۲۱۴، زکریا) میں اور حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ نے فتاویٰ رحیمیہ (۱۰/ ۱۷۹، زکریا) میں عدمِ جواز کا ہی فتویٰ دیا ہے، ہاں اگر شوہر اس لائن کا تجربہ رکھتا ہوں اور وہ خود احتیاط کے ساتھ یہ کام انجام دے، تو شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

بچے کا نسب بہر حال ثابت ہو جائے گا، غیر فطری طریقے پر بھی اگر شوہر کی منی کا ادخال رحمِ زوجہ میں ہوتا ہے، تب بھی نسب شوہر سے ثابت ہو جاتا ہے؛ چنانچہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: **الولد للفراش وللعاهر الحجر،** **مشكاة**، ص:۲۸۸، فتاویٰ ہندیہ میں ہے: **رجل عالج جارية في ما دون الفرج فأنزل فأخذت الجارية ماءه في شيء فاستدخلته في فرجها فعلقت عند أبي حنيفة أنّ الولد ولده وتصير الجارية أم ولد له**[(۱)] لہٰذا پہلی صورت میں تو جن دو میاں بیوی کا نطفہ لیا گیا، ان سے نسب ثابت ہوگا اور جہاں تک دوسری صورت کی بات ہے کہ بچہ کی ماں شرعاً کون بنے گی؟ جس کا بیضۃ المنی لیا گیا وہ یا جس نے حمل کی مشقت اٹھائی اور جنم دیا؟ تو صحیح بات یہ ہے کہ بچے کا نسب اس خاتون سے ثابت ہوگا، جس کے بطن سے وہ پیدا ہوا اور جس نے حمل و وضع حمل کی مشقت برداشت کی۔ قرآن کریم میں ہے: ''**اِنْ اُمَّهَاتُهُمْ اِلَّا الّٰٓئِیْ وَلَدْنَهُمْ**''[(۲)] ترجمہ: ان کی مائیں تو بس وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ماں انہیں کو قرار دیا جنہوں نے بچوں کو جنا، اور حصر کے ذریعے غیر سے ماں ہونے کی نفی کی ہے، نیز دوسری آیت میں ہے: ''**یَخْلُقُكُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ**''[(۳)] یہاں پر بھی موضعِ تخلیق ماؤں کے بطنوں کو بنایا، اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مائیں وہ ہوں گی جن کے بطن میں بچہ کی تخلیق ہوئی ہے، نیز آیت کریمہ: ''**حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا**''[(۴)]

---

(۱) ۴/۱۱۴، الفصل الأوّل في مراتب النّسب .
(۲) المجادلة ، الآية: ۲.
(۳) الزّمر ، الآية:۶.
(۴) الأحقاف ، الآية: ۱۵.

اور آیت کریمہ: ''وَوَصَّیْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ ''(۱) سے بھی مذکورہ بات کی تائید ہوتی ہے۔(۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/۱/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## حرام جانوروں کے پتّہ سے تیار شدہ ادویہ کا حکم

**سوال:** ﴿۹۶﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

ڈی جی پلیکس **Digiplex** یہ ایک دوا کا نام ہے جس میں سور سے بنایا گیا انزائیم استعمال ہوتا ہے۔ یہ سیال اور ٹیبلیٹ دونوں شکل میں ہوتا ہے۔ یہ دوا متبادل، اضافی اور وٹامن کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

لبلبہ (پینکر یاس: نظام ہضم کا ایک غدود جو ہضم انزائم اور انسولین خارج کرتی ہے) پتّا جو کہ سور کا ہوتا ہے، کو تحلیل ہونے والی اشیاء کے ساتھ ملایا جاتا ہے، پھر فلٹر ہونے کے بعد وہ پینکر یاٹک انزائم ہوتا ہے۔

پینکر یاٹک جو کہ عمل سے گذرنے کے بعد تین انزائم (خامروں) کا مرکب ہوتا ہے، پاؤڈر کی شکل میں ہوتا ہے اور اس کا استعمال ڈی جی پلیکس ٹیبلیٹ اور شربت میں ہوتا ہے۔

**انزائم یعنی خامرہ کیا ہے؟:**

خامرہ (انزائم) ایک ایسا حیاتی سالمہ (**Molecule**) ہوتا ہے، جو کیمیائی تعامل (**Reac-tionchemical**) کی شرح (**Rate**) کو تیز کرتا ہے۔

---

(۱) لقمان، الآیة: ۱۴۔

(۲) حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم اور بعض دیگر اہلِ علم اس بات کے قائل ہیں کہ ''ماں'' وہ عورت ہے جس کا بیضۃ المنی لیا گیا اور بعض حضرات نے یہ رائے اختیار کی کہ حرمتِ نکاح وغیرہ کے باب میں ان دونوں عورتوں کو بچے کے لیے حقیقی ماں کے حکم میں رکھا جائے اور نفقہ و میراث وغیرہ کے احکام میں اُس عورت کو ماں کا حکم دیا جائے جس نے حمل کی مشقت برداشت کی اور مولود کو جنا ہے۔

خامراتی تعامل(Rectione nzymatic) میں تعامل شروع ہونے سے پہلے سالمہ (Molecule) زیرخامرہ (Substrates) کہلاتا ہے جو کہ بعد میں کسی اور سالمے میں تبدیل ہوجاتا ہے، جسے نتیجہ(Product) کہتے ہیں۔خلیے (Cellbiological) کے تقریباً تمام کیمیائی تعامل کو زندگی برقرار رکھنے کے لیے مطلوبہ شرح (Rate) حاصل کرنے کے لیے خامرے کی ضرورت پڑتی ہے۔

خامرہ کی تعریف ڈاکٹر یحیٰ کی نظر میں:

خامرہ،خلیوں کے تمام ردّعمل کو چلاتے ہیں، اگر یہ کام کرنا چھوڑ دیں تو ان کو دوبارہ بیک وقت اور تیزی کے ساتھ چلانا بہت ہی مشکل ہے، فن طب میں موجودہ بے پناہ ترقی کے باوجود سائنسداں اس جیسا متبادل نظام بنانے میں ناکام ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ وہ اس جیسا ایک واحد نمونہ نہیں بنا سکے جو ردّعمل کے اس عمل کو اس تیزی کے ساتھ کر سکے، جیسے خامرہ کرتے ہیں، اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان تمام پروٹین کے لیے جو کہ جسم میں پائے جانے والے کیمیائی ردّ عمل کو چلاتے ہیں اور تیز کرتے ہیں اور بہت سارے جان بخش کاموں (جیسا کہ،دوبارہ پیدا کرنا، قابو کرنا،اور نقل کرنا وغیرہ) کی تکمیل کرتے ہیں، یہ ناممکن ہے کہ ایک نامعقول واقعہ کے نتیجے میں خود وجود میں آجائیں؛ چنانچہ یہ اس بات کی عکّاسی کرتا ہے کہ، اللہ- جو کہ تمام دنیا اور اس میں پائی جانے والی چیزوں کا خالق ہے - نے انسان کو اور اس کے جسم میں پائے جانے والے خامروں کو پیدا کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس دوا میں خود دوا بنانے والے کے مطابق سور کا انزائم استعمال ہوتا ہے، تو کیا اس کا استعمال مطلقاً درست ہوگا؟ یا اس میں کوئی تفصیل ہوگی؟

المستفتي: حلال کمیٹی
جمعیۃ علماء مہاراشٹر
(۳۸/د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

پِتّہ (اس کے اندر موجود سیال مادّہ) تو عام جانوروں کا بھی حلال نہیں (۱) پس خنزیر ـــــــ جو اپنے تمام اجزا کے ساتھ حرام ہے (۲)ـــــ کا کیسے حلال ہوسکتا ہے؟ اس کی حرمت میں تو بہت شدت ہوگی؛ اس لیے سور کے "انزائم" پر مشتمل دواؤں کا استعمال قطعًا جائز نہیں، ہاں اگر دیانت دار ماہر ڈاکٹروں کے مطابق مریض کو اس طرح کی دواؤں کی سخت ضرورت ہو اور کوئی دوسری دوا کارگر نہ ہو تو پھر "تداوي بالمحرّم" کے اصول کے مطابق ایسی دواؤں کو استعمال کرنے کی گنجائش ہے؛ (۳) البتہ اگر بالتحقیق یہ معلوم ہوجائے کہ "پتّہ" کے "انزائم" بننے کے بعد اس کی سابقہ حقیقت بدل جاتی ہے، یعنی استحالہ کے بعد اس کے سابقہ آثار وخواص باقی نہیں رہے، تو پھر عام حالات میں بھی اس پر مشتمل دواؤں کو استعمال کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ (۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

---

(۱) كره تحريمًا و قيل تنزيهًا ، و الأوّل أوجه من الشّاة سبع : الحياء ، و الخصية و الغدّة و المثانة و المرارة و الدّم المسفوح والذّكر .

(الدّرّ المختار مع ردّ المحتار :۱۰/۴۷۷-۴۷۸، مسائل شتّٰی)

(۲) وأمّا الخنزير فشعره وعظمه وجميع أجزائه نجسة .

(البحر الرّائق:۱/۱۹۱، كتاب الطّهارة)

(۳) ...... (الف) إدخال المرارة في الإصبع للتّداوي ، قال أبو حنيفةؒ لا يجوز ، وعند أبي يوسفؒ يجوز ، وعليه الفتوى . (خلاصة الفتاوٰی:۴/۳۶۵، كتاب الكراهية)

(ب) الاستشفاء بالحرام يجوز ، إذا علم أن فيه شفاء ولم يعلم دواء آخر .

(البحر الرّائق:۱/۲۰۴، كتاب الطّهارة)

(ج) وللمزيد راجع . (جواهر الفقه: ۱۰/۴۴۷، ط: تفسير القرآن)

(۴)......(الف) قال الشّامي:فعرفنا أن استحالة العين تستتبع زوال الوصف المرتب عليها إلخ

(ردّ المحتار على الدّرّ المختار:۱/۵۳۴، مسائل شتّٰی، كتاب الطّهارة)

(ب) للمزيد راجع : اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۱۳، مطبوعہ: فیصل دیوبند۔

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/۶/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## ہومیو پیتھک ادویہ سازی میں الکوحل کے استعمال کا حکم

درخواست برائے شرعی رہنمائی فتویٰ

محترم ایڈمنسٹریٹر دارالعلوم دیوبند

عنوان درخواست: ہومیو پیتھک ادویہ سازی میں الکوحل (Ethanol) کے استعمال سے ان ادویات کے استعمال پر فتویٰ و شرعی رہنمائی۔

جناب محترم!

**سوال:** ﴿۹۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

درخواست گذار کا تعلق ہومیو پیتھک ادویہ ساز انڈسٹری سے ہے، اور گزشتہ ۳ (تین) دہائیوں سے بی ایم (پرائیویٹ) لمیٹڈ کے نام سے دُکھی انسانیت کی خدمت میں اعلیٰ معیار کی ادویات بنا کر مصروف عمل ہے۔ یہ ادارہ ISO 9001 & 14001 سے تصدیق شدہ ہے، اور بین الاقوامی معیار کی بہترین ادویہ سازی یعنی Good Manufacturing Practices کے تمام تر مروّجہ قواعد وضوابط (Protocols) پر سختی سے کاربند ہے۔

مزید برآں پاکستان سمیت دُنیا بھر کے زیرِ استعمال فارما کوپیا (Pharmacopoeias) بہ شمول:

{۱} امیریکن ہومیو پیتھک فارما کوپیا

{۲} برٹش ہومیو پیتھک فارما کوپیا

{۳} یوروپین ہومیو پیتھک فارما کوپیا

{۴} جرمن ہومیو پیتھک فارما کوپیا

{۵} فرانسیسی ہومیو پیتھک فارما کوپیا

{۶} انڈین ہومیو پیتھک فارما کوپیا

{۷} پاکستانی ہومیو پیتھک فارما کوپیا

یہ ادارہ نہ صرف پاکستان؛ بلکہ دنیا کے 4 برِّ اعظموں میں اپنی معیاری ادویہ سازی کے باعث ایک نام اور مقام رکھتا ہے، اسے ہمیشہ دُنیائے ہومیوپیتھی میں انڈسٹری کی آواز یعنی (**Voice**) کے طور پر پذیرائی حاصل رہی ہے، اور اس ادارے نے ملکی **Range** انڈسٹری کو نئی جہتوں سے متعارف کروایا ہے، پورے ایشیا میں ہومیو پیتھک ادویات کی سب سے وسیع تر **Range** تیار کرنے کا شرف بھی اسی ادارے کو حاصل ہے۔

اس مختصر تعارف اور ساتھ لف کردہ معلومات برائے ادارہ کے ساتھ آپ کی علمی و تحقیقی خدمات کو سلام پیش کرتے ہوئے درخواست گزار نہ صرف اپنے ادارے؛ بلکہ پوری ہومیو پیتھک برادری کی طرف سے عموماً اور ہومیو پیتھک ادویہ ساز انڈسٹری کی طرف سے خصوصاً ایک مسئلہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہے، آپ کی جانب سے شرعی رہنمائی اور آپ کا فتویٰ ہم سب کو حلال وحرام میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے مالا مال کر دے گا، جو کہ آپ کا نہ صرف ہم سب پر؛ بلکہ اس دُکھی انسانیت پر بھی احسان عظیم ہوگا، جو اس سے مستفیض ہو رہی ہے، اور روز بہ روز ان افراد کی تعداد میں لاکھوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔

جناب عالی!

مروّجہ قاعدہ وقانون کے مطابق ہومیو پیتھک ادویات کی تیاری میں الکوحل یعنی **Ethanol** کو بہ طور **Carrier** استعمال کیا جاتا ہے۔ جو **Ethanol** استعمال ہوتی ہے اُسے گنے کی راب سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ہومیو پیتھک ادویات میں مندرجہ ذیل اقسام ہوتی ہیں:

(ا) مدر ٹنکچرز (**Mother Tinctures**) ان میں ایتھانول کا استعمال 50 تا 80 فیصد ہوتا ہے؛ لیکن تیاری کے مراحل سے گزرنے کے بعد جب مریض اس کو بہ طور دوائی پانی میں ڈال کر استعمال کرتا ہے تو اس میں ایتھانول کی مقدار انتہائی قلیل ہو کر تقریباً 0.59 فیصد رہ جاتی ہے۔ (یعنی اس دوا کے 10 قطرے جب دو گھونٹ پانی میں ڈالے جاتے ہیں تو یہ تناسب بنتا ہے)

(۲) پوٹینسیاں (Dilutions) اس کیٹیگری میں بننے والی ادویات میں Ethanol کی مقدار تقریباً 90 تا 95 فیصد ہوتی ہے، جسے قطروں کی صورت میں پانی میں ملا کر استعمال کیا جاتا ہے؛ لیکن جب مریض اسے بہ طور دوا استعمال کرتا ہے تو اس میں ایتھانول کی مقدار انتہائی قلیل ہو کر صرف تقریباً 0.49 فیصد رہ جاتی ہے۔ (یعنی اس دوا کے 5 قطرے جب دو گھونٹ پانی میں ڈالے جاتے ہیں تو یہ تناسب بنتا ہے)

(۳) بی ایم نمبرز اور خصوصی طور پر تیار ہونے والی بقیہ ہومیو پیتھک ادویات کو 40 تا 50 فیصد ایتھانول میں تیار کیا جاتا ہے؛ لیکن جب قطروں (Drops) کی شکل میں اسے مریض استعمال کرتا ہے تو اس میں الکوحل کی مقدار صرف تقریباً 0.39 فیصد رہ جاتی ہے۔ (یعنی اس دوا کے 10 قطرے جب دو گھونٹ پانی میں ڈالے جاتے ہیں تو یہ تناسب بنتا ہے)

جناب والا!

ان حقائق کی روشنی میں آپ سے فتویٰ درکار ہے کہ آیا یہ ادویہ سازی کا عمل جس کا مقصد دُکھی و بیمار انسانیت کی خدمت ہے اور غریب عوام کو سستا اور مؤثر علاج مہیا کرنا ہے، شرعی نقطۂ نظر سے حلال/حرام کی کیفیت جاننا ہے۔

آپ کی شرعی رہنمائی ہم سب کے لیے حجت کا درجہ رکھتی ہے۔ علماء حق اور فقۂ حنفی کے جیّد فقہاء کرام کی آراء جو کہ Internet پر موجود ہیں، اس کو بھی آپ کے مطالعہ کے لیے ساتھ کر دیا گیا ہے۔

مزید برآں اس ضمن میں کوئی معلومات اگر درکار رہوں گی تو درخواست گزار حاضر خدمت ہے۔

منجانب: صدر شعبہ تحقیق و ترقی بہ ذریعہ کنٹری و سارک ہیڈ

پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل تبسم علی

بی ایس سی (آنرز)، ایم ایس سی (آنرز)

ایم فل، ایم بی اے، پی جی ڈی، پی ایچ ڈی

(۱۵۸۳/ د۱۴۳۳ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

اگر استفتاء میں مذکور بیان صحیح ہے کہ آپ کی کمپنی میں ادویہ میں ڈالا جانے والا ''الکوحل'' گنے کی راب سے حاصل کیا جاتا ہے، تو دواؤں میں بہ قدرِ ضرورت اُسے ڈالنے کی گنجائش ہے(۱) نیز مریضوں کے لیے بہ طور علاج ضرورت کے وقت ان دواؤں کا استعمال بھی جائز ہے۔

بہشتی زیور میں ہے: ہر اسپرٹ اشربۂ اربعہ میں سے نہیں ہے، پس ایسی اسپرٹ کا شیخین کے نزدیک استعمال جائز ہے؛ لیکن فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر ہے، تاکہ عوام الناس کو جرأت نہ بڑھ جاوے، تو چوں کہ یہ فتویٰ سد باب فتنہ کے لیے ہے، اس لیے مبتلی کو گنجائش استعمال کی ہے(۲) **وما عدا ذلك**

---

**(۱)......(الف) وأمّا المِزْرُ والجعة والبتع وما يتّخذ من السّكر والتّين ونحو ذلك فيحلّ شربه عند أبي حنيفة – رضي اللّٰه عنه – قليلاً كان أو كثيرًا مطبوخًا كان أونيًّا ولا يحدّ شاربُه وإن سَكِرَ. (بدائع الصّنائع: ۴/۲۸۶)**

**(ب) وإن معظم الكحول الّتي تستعمل اليوم في الأدوية والعطور وغيرها لا تتّخذ من العنب أو التّمر؛ إنّما تتّخذ من الحبوب أو القشور أو البترول وغيره ............ وحينئذ هناك فسحة في الأخذ بقول أبي حنيفة عند عموم البلوى. (تكملة فتح الملهم: ۹/۳۴۳، كتاب الأشربة، حكم الكحول المسكرة، ط: أشرفي ديوبند)**

(۲) اختری بہشتی زیور، نواں حصہ، ص: ۱۰۲، جمادات کا بیان۔

لیکن اگر یہ الکوحل انگور، کشمش، کھجور، چھوہارے سے تیار کیا جاتا ہے یا اشربۂ محرمہ سے لیا جاتا ہے تو پھر وہ قطعی طور پر حرام و ناپاک ہے، اس کا ادنیٰ جز دواءً بھی استعمال کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ اضطراری کیفیت ہو اور کوئی حلال دوا کارگر نہ ہوتی ہو۔ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

اسپرٹ اگر عنب و زبیب، رطب و تمر سے حاصل نہ کی گئی ہو تو اس میں گنجائش ہے للاختلاف ورنہ گنجائش نہیں للاتفاق۔ (امداد الفتاویٰ: ۴/۲۰۹، ط: زکریا دیوبند)

لیکن اسپرٹ کے بارے میں اب تحقیق یہ ہے کہ وہ اشربہ اربعہ محرمہ سے حاصل نہیں کی جاتی؛ بلکہ دوسری حلال چیزوں مثلاً جَوْ، گیہوں، باجرہ، اناناس، پٹرول وغیرہ سے بنائی جاتی ہے؛ اس لیے یہ شراب نہیں ہے، دواؤں میں بہ قدر ضرورت اس کے استعمال کی گنجائش ہے۔　　==

(المسمّى بالخمر) مِن الأشربة فهي في حكم الثّلاثة الأخيرة (عصير العنب المسمّى بالطّلاء ونقيع الزّبيب ونقيع التّمر) في الحرمة والنّجاسة وعند أبي حنيفة وأبي يوسف يحرم منها القدر المسكر، وأمّا القدر الغير المسكر فحلال إلّا للّهو وكلّها طاهر ......... و ظاهر أنّ الأحوط قول محمّد ؛ فلذا أفتى المتأخّرون به سدًّا لباب الفتنة ؛ لكن في زماننا فقد عارضه عموم البلوىٰ في شراب يقال له "اسپریٹ" فالأحوط في زماننا عسى أن يؤدّي إلى الجرأة في الإثم إذ لم ير النّاس منه خلاصًا كما لا يخفى فالأولى أن لا يتعرّض للمبتلى به بشيء ، نعم من قدر على الاحتراز منه فليتحرّز ما شاء كما قال العلاّمة التّهانوي.(١) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہٰ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ٦/ ذی قعدہ/١٤٣٣ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

== کفایت المفتی میں ہے :

انگریزی دواؤں میں اسپرٹ میتھی لیٹیڈ (Sprit Methyleted) کی آمیزش ہوتی ہے، جو روغنوں اور رنگوں میں ڈال کر استعمال کی جاتی ہے، اور وہ شراب نہیں ہے؛ اس لیے اس کی آمیزش سے دواؤں کی بیع وشراء ناجائز نہیں ہوتی ۔ (کفایت المفتی :٩/ ١٤٩، ط: زکریا دیوبند)

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: والّذي ظهر لي أن معظم هٰذه الكحول لا تصنع من العنب ؛ بل تصنع من غيرها ، و راجعتُ له دائرة المعارف البريطانية المطبوعة: ١٩٥٠ م ٥٤٤/١، فوجدتُ فيها جدولاً للمواد الّتي تصنع منها هٰذه الكحول فذكر في جملتها العسل والدّبس والحب والشّعير .......... ولم يذكر فيها العنب والتّمر .

(تكملة فتح الملهم: ٣٤٩/٧، كتاب المساقاة والمزارعة ، باب تحريم بيع الخمر حكم الكحول المسكرة ، ط: أشرفي ديو بند)

(١) ہامش بہشتی زیور: ١٠١/٩، ط: اختری ۔

## کیڑے مکوڑے (Shellac) سے تیار شدہ اشیائے خوردنی کا حکم

**سوال:** ﴿۹۸﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

لاکھ، چپڑا، سریش، الکحل میں لاکھ ملانے سے تیار کیا وارنش، لاکھ کی پٹی یا ٹکلی (ایک طرح کی لکڑی)

شیلاک انڈیا اور تھائی لینڈ میں پائے جانے والے درخت کا ایک مادہ کیڑا، جس کو لاکھ بگ کہا جاتا ہے، یہ رال کی شکل میں پیدا ہوتا ہے، اس کو ایک عمل سے گزارے جانے کے بعد خشک پٹیوں (پھنکی) کی شکل میں بیچا جاتا ہے، پھر اس کو ایتھائل الکحل میں ملا دیا جاتا ہے تا کہ سیال شیلاک بنایا جا سکے، جس کا استعمال پھر غذا مثلاً سیب وغیرہ چمکانے اور پالش کرنے اور لکڑی کی فنیشنگ کے رنگنے میں استعمال کیا جاتا ہے، ویجیٹرین سوسائٹی کے مطابق شیلاک ٹھیک اسی طرح بنتا ہے جس طرح شہد بنتا ہے۔

یہ کیڑے شیلاک کس طرح بناتے ہیں:

شیلاک ایک چھوٹا لال کیڑا، جس کو (Lac Laccifer) سے بنایا جاتا ہے، جو اپنے ابتدائی مرحلے میں سیب کے بیج کی طرح ہوتا ہے۔ ان کیڑوں کو مخصوص درختوں پر کھانا دیا جاتا ہے، جس کو ہندوستان میں لاکھ درخت کہا جاتا ہے، سال کے کچھ موسم میں یہ چھوٹے لال رنگ کے کیڑے اس کثرت سے ہوتے ہیں کہ بعض اوقات پورا درخت سرخ اور گلابی لگنے لگتا ہے۔

جب یہ کیڑے شاخوں اور پتیوں پر بیٹھ جاتے ہیں تو اپنے سونڈ سے چھال میں گھس جاتے ہیں، رس چوستے ہیں اور اسے جذب کرنا شروع کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ وہ خود اپنے آپ کو بھی لقمہ بنا لیتے ہیں، اسی دوران اُن میں کا ہر مادہ مرنے سے پہلے ایک ہزار انڈے دیتا ہے۔

یہ رس کیڑے کے جسم میں کیمیائی تبدیلی سے گزارا جاتا ہے اور آخر کار یہ باہر آجاتا ہے۔

ہوا لگنے کی وجہ سے یہ ایک سخت خول کی طرح ہو جاتا ہے جو پورے کیڑے کو ڈھک دیتا ہے۔

اسی وقت یہ خول کیڑوں اور ٹہنی کے لیے ایک مرکب پرت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ان کیڑوں میں سے صرف پانچ فیصد نر ہوتے ہیں جو درخت پر ہوتے ہیں، گویا کہ مادہ ہی بنیادی طور پر شیلاک کی پیداوار کا ذریعہ ہے۔

فتاویٰ:

.......... جو کہ جنوبی افریقہ کی ایک حلال باڈی ہے، نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے، اور دلیل یہ دی ہے ان کی تحقیق کے مطابق اس کیڑے کے کچھ اجزاء اس میں بھی ہوتے ہیں۔

مفتی عبداللہ پاٹل نے اس کو جائز لکھا ہے، اور وہ اس کو شہد کی پیداوار کی طرح ایک قسم مانتے ہیں۔

سوال: یہ ہے کہ وہ غذائی اشیاء یا دوائیاں وغیرہ جس پر شیلاک کے ذریعہ پالش کی گئی ہو کیا اس کا کھانا جائز ہوگا؟

المستفتي: حلال کمیٹی
جمعیۃ علماء مہاراشٹر
(۳۸/د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التوفیق:**

''شیلاک'' اگر بالکل شہد کی طرح تیار ہوتا ہے، کیڑوں کے اجزاء اس میں شامل نہیں ہوتے، تو شہد پر قیاس کرتے ہوئے اسے داخلاً وخارجاً ہر طرح استعمال کرنا شرعاً درست ہوگا، بہشتی زیور میں ہے: کیڑوں کے لعاب سے بعض پیدا شدہ چیزیں جن سے استقذار یعنی گھن نہ ہو حلال ہیں، جیسے آبریشم، شکر تیغال وغیرہ **للنصّ علی حلّۃ العسل** (۱۰۴/۹، ط: اختری) اگر شہد کی طرح تیار نہ ہوتا ہو؛ بلکہ کیڑے کے اجزاء یا ان کا عرق بھی شامل ہو جاتا ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ: چوں کہ کیڑے مکوڑے شرعاً پاک ہوتے ہیں، مرنے سے بھی وہ نجس نہیں ہوتے؛ اس لیے کیڑے مکوڑوں کا یا اُن سے تیار شدہ اشیاء کا ہر طرح کا خارجی استعمال یا اُن کی خرید و فروخت جائز ہے۔(۱)

(۱) مستفاد: بہشتی زیور: ۱۰۳/۹-۱۰۴۔

اس لیے "شیلاک" (اگر چہ اسے شہد کی طرح تیار نہ کیا جاتا ہو) سے لکڑی کو رنگنا یا پالش کرنا یا کسی بھی طرح خارجی استعمال کی چیزوں میں اسے ملانا شرعًا درست ہے، اسی طرح چھیل کر کھائے جانے والے پھلوں کو پالش کرنے یا رنگنے سے اس کی حلت متاثر نہ ہوگی۔

ہاں بلا چھیلے کھائے جانے والے پھلوں کو رنگنا یا کسی اور شکل میں داخلاً (کھانے، پینے میں) اس کا استعمال کرنا درست نہ ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/۶/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## کیڑے مکوڑوں (Cochineal)

## سے تیار شدہ مختلف قسم کے رنگوں کا حکم

**سوال:** ﴿۹۹﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

کچنیلا، قرمز، ایک سرخ اور قرمزی رنگ جو خصوصًا کھانے کی چیزوں کو رنگنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

قرمزی رنگ کا مادّہ قرمزی کیڑے سے نکالا جاتا ہے، یہ کیڑا سرخ اور سنتری رنگ کو بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

کوچنیل (قرمز) کیڑے کو کچل کر حاصل کردہ سرخ رنگ جسے کارمک ایسڈ کہا جاتا ہے (اس کا ای نمبر: ۱۲۰ ہے)

اس کو بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کیڑوں کو گرم پانی میں ڈبو کر سورج کی روشنی، بھاپ یا اُون کی گرمی میں مار ڈالا جاتا ہے، اُن طریقوں میں سے ہر ایک مختلف رنگ دیتے ہیں، جو کہ رنگوں میں تنوع کا سبب ہوتے ہیں، کیڑوں کو خشک کرنا لازمی ہے، خشک ہونے کے بعد یہ کیڑے اپنے جسم کے

اصل وزن کے تیس فیصد تک پہونچ جاتے ہیں، اور اس کو سڑنے سے پہلے اس کو جمع کر لیا جاتا ہے۔

قرمزی کیڑوں سے ایک رطل رنگ حاصل کرنے کے لیے ستر ہزار کیڑوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

قرمزی کیڑوں سے حاصل ہونے والے رنگوں کی دو بنیادی قسمیں ہیں:

پہلی قسم: قرمزی کیڑوں کا خلاصہ: یہ ایک رنگ والا مادّہ ہوتا ہے، جو خام، خشک اور پیسے ہوئے کیڑوں سے بنایا جاتا ہے۔

دوسری قسم: ''کارمین''(Carmine) ہوتی ہے، یہ رنگ والا مادّہ ہوتا ہے اور کیڑوں سے نکالا جاتا ہے اور یہ زیادہ صاف ہوتا ہے۔

کارمین کو تیار کرنے کے لیے کیڑے کے جسم کے پاؤڈر کو امونیا میں یا سوڈیم کاربونیٹ کے لوشن میں اُبالا جاتا ہے، قابلِ تحلیل مادّے کو فلٹر کر کے نکال دیا جاتا ہے، پھر فٹکری کو کاربونک ایسڈ صاف نمک میں ملا دیا جاتا ہے تاکہ لال المونیوم نمک کو زائل کیا جا سکے، اب یہ ایک آئرن کی عدم موجودگی کے سبب صاف ہوتا ہے۔

اس کا استعمال:

پہلے زمانے میں اس کا استعمال کپڑوں کے رنگنے کے لیے ہوتا تھا، اسی طرح یہ رنگ بادشاہ، شرفاء، اور عیسائی مذہبی پیشواؤں کے کپڑوں کے رنگنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

موجودہ زمانے میں یہ رنگ کپڑوں، حسن افروز اشیاء (Cosmetics) اور قدرتی غذاؤں کے رنگ کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور پینٹر آج کل اس کلر کو استعمال نہیں کرتے ہیں؛ بلکہ اس کی جگہ وہ سرخ رنگ کا استعمال کرتے ہیں۔

سوال:

مذکورہ کیڑے سے بنائے ہوئے رنگ کا استعمال مطلقاً جائز ہوگا یا اس میں تفصیل ہوگی؟ برائے کرم تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتي: حلال کمیٹی
جمعیۃ علماء مہاراشٹر
(۷/۳۸د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے بہشتی زیور میں لکھا ہے کہ: کیڑے مکوڑے اور خشکی کے جملہ وہ جانور جن میں دمِ سائل نہ ہو پاک ہیں، جیسے: اکثر حشرات الارض: بچھو، تیتے، چھوٹی چھپکلی جس میں دمِ سائل نہ ہو، چھوٹا سانپ، جس میں دمِ سائل نہ ہو، خارجًا ان کا استعمال ہر طرح درست ہے اور داخلاً (کھانے پینے میں) سب حرام ہیں ......... جملہ حشرات الارض غیر ذی دم چوں کہ مرنے کے بعد بھی نجس نہیں، اس واسطے ان کی بیع وشریٰ خشک شدہ کی بھی درست ہے، اور خارجًا استعمال درست ہے۔(بہشتی زیور: ۹/۱۰۴، ط: اختری)

اس سے پتہ چلا کہ کیڑے مکوڑے شرعًا پاک ہوتے ہیں، مرنے کے بعد بھی وہ نجس نہیں ہوتے اور اُن سے خارجی استعمال (یعنی صرف کھانے پینے کے علاوہ) میں ہر طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؛ لہٰذا ''قرمزی'' کیڑے سے تیار شدہ رنگ سے کپڑوں یا چھیل کر کھائے جانے والے پھلوں یا اس جیسی دوسری چیزوں کو رنگنا یا حسن افروز اشیاء میں ملانا شرعًا مباح ہے؛ البتہ ان کا یا ان پر مشتمل اشیاء کا کھانا، پینا درست نہیں ہوگا؛ اس لیے کہ کیڑے مکوڑے آیت کریمہ: ﴿وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ﴾(۱) کے تحت داخل ہونے کی وجہ سے اُن کا کھانا حرام ہے، ہاں اگر بالتحقیق یہ معلوم ہوجائے کہ رنگ بننے کے بعد کیڑوں کی حقیقت پوری بدل جاتی ہے، تو پھر کھانا پینا بھی جائز ہوسکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/۶/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

(۱) سورۂ اَعراف، آیت: ۱۵۷۔

# حلال آگہی اور تحقیقاتی کونسل کی طرف سے مرسلہ انقلاب ماہیت سے متعلق تفصیلی سوال کا جواب

بخدمت جناب مفتی صاحب

**سوال:** ﴿۱۰۰﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

درج ذیل مسئلے میں شرعی رہنمائی درکار ہے:

فقہ کا ایک اہم اصول ہے کہ تبدیلِ ماہیت سے احکام حلت وحرمت میں فرق پڑ جاتا ہے۔

مثلاً شراب کا سرکہ بن گیا، یا گدھا نمک بن گیا تو حلال، یا کوئی حرام چیز جل کر راکھ ہوگئی تو حلال، اسی طرح کی مثالیں بہ کثرت موجود ہیں۔

تبدیلِ ماہیت چوں کہ موجودہ کیمیائی دور میں ایک بہت بڑا مسئلہ بن کر سامنے آیا ہے، جس میں ابتلاء عام ہے، اس لیے اس کے حوالے سے چند سوالات کے جوابات درکار ہیں۔

سوالات:

سوال نمبر:۱- شریعتِ اسلامی میں استحالہ یا تبدیلِ ماہیت (State Change) کا مدار کس چیز پر ہے؟

یعنی کسی بھی چیز میں جب کوئی تبدیلی یا تبدیلیاں واقع ہوں تو ان تبدیلیوں کے کچھ درجات ہوتے ہیں، تو ان میں کس مرحلے اور کس درجے پر شریعت یہ کہے گی کہ اس چیز کی ماہیت تبدیل ہوگئی؟

مثلاً:

(۱) آیا اس کا مدار عرف میں اس کے نام کے تبدیل ہوجانے پر ہے؟

(۲) یا اس کے اثرات وخواص کی تبدیلی پر ہے؟

(۳) یا اس میں کیمیائی تبدیلی پر ہے؟

(۴) یا اثرات وخواص اور کیمیائی تبدیلی دونوں کے مجموعے پر ہے؟

(۵) یا اس کے حرام اجزاء کے ختم ہوجانے پر ہے؟

اس کی تھوڑی سی وضاحت:

شراب سے سرکہ بن گیا تو اس کو ماہیت کی تبدیلی کہتے ہیں؛ جب کہ کیمیائی تحقیق کے مطابق سرکہ بننے کے باوجود اس میں قلیل مقدار (0.2%) شراب باقی رہتی ہے، مکمل طور پر کبھی ختم نہیں ہوتی، اس کے باوجود اس کو تبدیلی ماہیت کی بناء پر حلال کہتے ہیں۔

تو اسی طرح اگر کوئی حرام چیز کیمیائی طور پر تبدیل ہو جائے کہ جس کے اندر قلیل تعداد میں اصل حرام جزو باقی رہے تو کیا وہ اس کے باوجود حلال ہو جائے گی؟

سوال نمبر:۲-

اس سلسلے میں خریدار کی ذمہ داری کس حد تک ہے؟

۱- (مثلاً صابن) میں حرام جانور کی چربی استعمال کی گئی ہے، صارف کو نہیں پتہ ہوتا کہ اس کی ماہیت تبدیل ہو گئی یا نہیں؟ تو اس کے لیے ایسی چیز کو خریدنے، کھانے، پینے، یا استعمال کرنے کا کیا حکم ہوگا؟

۲- ہڈی اور کھال سے جلیٹن بنتی ہے، صارف کو نہیں پتہ کہ اس جلیٹن میں حرام جانور کے اجزاء استعمال ہوئے ہیں یا حلال جانور کے؟ نیز اس میں تبدیلِ ماہیت ہوئی ہے یا نہیں؟ تو اس کے لیے وہ جلیٹن خریدنا یا اس جلیٹن سے بنی ہوئی دیگر اشیاء خریدنا (مثلاً: جیلی، دوائی وغیرہ) کیا حکم رکھے گا؟

سوال نمبر:۳-

اگر ظاہراً ایک چیز کے اندر تبدیلی آجائے؛ لیکن کیمیائی ٹیسٹ کے اندر اس میں اس کے اصل ماخذ حرام چیز کے اثرات پائے جاتے ہوں، مثلاً گدھا نمک کی کان میں نمک بن گیا تو ظاہراً تو تبدیلی آگئی؛ لیکن اگر اس کا لیبارٹری ٹیسٹ کیا جائے تو اس میں پتہ چل جائے گا کہ یہ نمک گدھے سے بنا ہے۔

تو آیا ان اثرات کا پایا جانا تبدیلِ ماہیت کے حکم پر اثر انداز ہوگا یا نہیں؟ یا اسی طرح دودھ کو دہی بنا دیا جاتا ہے تو اس کے اثرات وخواص تبدیل ہو جاتے ہیں؛ لیکن کیمیائی ٹیسٹ میں پتہ چل جائے گا کہ یہ دودھ سے بنی ہے۔

یا MSG (چائنیز سالٹ) اگر خنزیر کے اجزاء سے بنایا جائے تو وہ ظاہراً تو بالکل نمک ہوگا؛ لیکن کیمیائی ٹیسٹ سے پتہ چل جائے گا کہ اس کا حصول خنزیر کے اجزاء سے ہوا ہے۔

تو اب اس کو تبدیلِ ماہیت کی وجہ سے حلال قرار دیا جائے گا یا نہیں؟ یا اگر اس میں کچھ تفصیل ہے تو وہ بیان فرما دیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم　　والسلام

اظفر اقبال رشید

مذکورہ بالا کیمیائی معلومات درست ہیں۔

دستخط: فصیح اللہ خان جامعہ کراچی
سیکریٹری، حلال آگہی وتحقیقاتی کونسل
(۴۶۴/ د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق:**

(۱) فقہائے کرام نے بہت سی مثالیں ذکر کی ہیں جن میں "انقلابِ ماہیت" کی وجہ سے تبدیلیٔ حکم کا تحقق ہوا، مثلاً:

(الف) شراب خود بہ خود یا کسی دوسری چیز کی آمیزش کی وجہ سے سرکہ بن جائے۔

(ب) گدھا یا خنزیر نمک کے کان میں گر کر نمک بن جائے۔

(ج) گندگی (پاخانہ، گوبر) جل کر راکھ ہو جائے۔

(د) ناپاک چربی سے صابون تیار کیا جائے۔

(ھ) پاخانہ کنوئیں میں گر کر کیچڑ بن جائے۔ **في ردّ المختار: تخليل الخمر بإلقاء شيء فيها وهو كالتّخلّل بنفسها وهما داخلان في انقلاب العين** (۱) **ولا يكون نجسًا رماد قذر، (المراد به العذرة والرّوث) ولا ملح كان حمارًا أو خنزيرًا ولا قذر وقع في بئر فصار حمأة لانقلاب العين به يفتي(۱/۵۳۴)**

---

(۱)الدّرّ المختار مع ردّ المحتار :۱/ ۵۱۸ .

**و یطهر زیت تنجس بجعله صابونًا به یفتی للبلوی : ۱/ ۵۱۹**،ان مثالوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک جگہ ایک ہی طرح کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی؛ بلکہ تبدیلی کی مختلف صورتوں کو ''انقلابِ ماہیت'' مانا گیا، مثلاً: بعض میں تو شئ اوّل اپنے تمام اجزاء اور اوصاف کے ساتھ تبدیل ہوگئی، مثلاً: گدھا خنزیر نمک کے کان میں گر کر نمک بن گیا، اور بعض میں تو پہلی چیز کے تمام اجزاء باقی ہیں؛ البتہ اس کا بنیادی وصف ختم ہوگیا، مثلاً: شراب سرکہ بن گیا، تو ایسی صورت میں اجزاء تو پہلے والے ہی ہوتے ہیں؛ البتہ اس کے اندر موجود وصفِ ''سکر'' ختم ہو جاتا ہے اور کچھ میں تو شئ اوّل کے اجزاء کے ساتھ ساتھ اس کا وصف بھی کسی قدر باقی رہتا ہے، مثلاً: ناپاک چربی سے صابون تیار کیا جائے تو صابون تیار ہونے کے بعد وصفِ ''دسومت'' کسی نہ کسی درجے میں باقی رہتا ہے؛ اس لیے ان فقہی جزئیات کی روشنی میں ''انقلابِ ماہیت'' کی درج ذیل تعریف ہوسکتی ہے:

شئ کے اندر خود بہ خود یا کیمیائی عمل یا کسی دوسری شئ کی آمیزش کی وجہ سے اتنی تبدیلی آجائے کہ اس کے خواص اور بنیادی وصف جو مدارِ حکم ہے ختم ہو جائیں یا ختم ہونے کے قریب ہو جائیں، شئ اوّل کے اجزاء یا اوصاف غیر مختصہ وضمنیہ کا باقی رہنا انقلابِ ماہیت کے تحقق کے لیے مانع نہ بنے گا، اور خواص واوصاف میں کس قدر تبدیلی آئی اس کے سلسلے میں حواس سلیمہ کے ادراک پر اکتفا کیا جائے گا، طبی تحقیقات اور لیبار یٹری ٹسٹ معاون تو ہوں گی؛ لیکن حکم کا مدار ان پر نہ ہوگا۔(۱)

لہٰذا شراب کے سرکہ بن جانے کے بعد بھی طبی ٹسٹ کی رو سے دو، چار فیصد سکر اگر باقی رہ جائے تب بھی حکم میں کوئی اثر نہیں پڑے گا، فتح القدیر کی درج ذیل عبارت سے مذکور الصدر تعریف کی تائید ہوتی ہے:

**وكثيرٌ من المشايخِ اخْتارُوْا قولَ مُحمّدٍ ، وهوالمختارُ؛ لأنّ الشّرْعَ رَتّبَ وَصْفَ النَّجاسَةِ علٰى تِلكَ الحقيقةِ ، وتَنْتَفِي بانتفاء بعض أجزاء مفهومها ، فكيف بالكلّ فإنّ الملحَ غيرُ العظْمِ واللّحمِ ، فإذا صارَ مِلحًا تَرَتّبَ حُكمُ المِلحِ ونظيرُهُ في الشّرْعِ: النُّطْفَة نجِسَةٌ وتَصيرُ عَلَقةً وهي نجِسةٌ وتصيرُ مُضْغَةً فتَطْهُرُ ، والعَصيرُ طاهرٌ فتصيرُ**

(۱) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار :۱/۵۳۴۔

خمرًا فینْجَسُ ، و یَصِیرُ خلًّا فیَطْهُرُ ، فعَرَفْنَا أنّ استِحالةَ العینِ تَسْتَتْبِعُ زوالَ الوصفِ المُتَرتّبِ علیهَا.(۱)

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں: یہ بات ابھی تک قابلِ تحقیق ہے کہ انقلابِ حقیقت سے مراد کیا ہے؟ تو واضح ہو کہ ''انقلابِ حقیقت'' سے مراد یہ ہے کہ وہ شئ فی نفسہٖ اپنی حقیقت چھوڑ کر کسی دوسری حقیقت میں متبدل ہو جائے، جیسے: شراب سرکہ ہو جائے یا خون مشک بن جائے یا نطفہ گوشت کا لوتھڑا وغیرہ وغیرہ کہ ان صورتوں میں شراب نے فی نفسہٖ اپنی حقیقتِ خمریہ اور خون نے اپنی حقیقتِ دمویہ اور نطفہ نے اپنی حقیقتِ منویہ چھوڑ دی اور دوسری حقیقتوں میں متبدل ہو گئے، حقیقت بدل جانے کا حکم اسی وقت دیا جا سکتا ہے کہ حقیقتِ اولیٰ منقلبہ کے آثار مختصہ اس میں باقی نہ رہیں، جیسا کہ امثلۂ مذکورہ میں پایا جاتا ہے کہ سرکہ بن جانے کے بعد شراب کے آثار بالکل زائل ہو جاتے ہیں۔

بعض آثار کا زائل ہو جانا یا بہ وجہ قلت آثار کا محسوس نہ ہونا موجبِ انقلاب نہیں، جیسا کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر آٹے میں کچھ شراب ملا کر گوندھ لیا جائے اور وہ روٹی پکا لی جائے تو وہ روٹی ناپاک ہے، یا گھڑے دو گھڑے پانی میں تولہ دو تولہ پیشاب ملا دیا جائے تو وہ پانی ناپاک ہے؛ حالاں کہ روٹی یا پانی میں اس قلیل المقدار شراب کا کوئی اثر محسوس نہ ہوگا؛ لیکن چوں کہ شراب نے ان صورتوں میں فی نفسہٖ اپنی حقیقت نہیں چھوڑی ہے؛ اس لیے ناپاکی کا حکم باقی ہے ............ اسی طرح حقیقتِ منقلبہ کی بعض کیفیات غیر مختصہ کا باقی رہنا مانع انقلاب نہیں، جیسے: شراب سرکہ بن جانے کے بعد بھی اس کی رقت باقی رہتی ہے، یا صابون میں قدرے دسومت روغن نجس کی باقی رہتی ہے(۲)

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ''انقلابِ ماہیت'' سے ملتی جلتی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ چند چیزوں کو مشین یا کسی اور طریقے سے باہم اس طرح ملا دیا جاتا ہے کہ کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا؛ لیکن ہر چیز کی علیحدہ خاصیتیں مل کر مرکب کا ایک نیا مزاج پیدا ہوتا ہے، یہ ''انقلابِ ماہیت'' نہیں؛ بلکہ

(۱) فتح القدیر: ۱/۲۰۲، باب الأنجاس وتطهیرها، ط: زکریا، دیوبند.

(۲) کفایت المفتي: ۲/۳۳۳، ط: زکریا، دیوبند.

''خلط'' ہے، اور ''خلط'' مطہر نہیں دواؤں یا بہت سی اشیاء خوردنی میں جو مختلف قسم کی چیزیں ملائی جاتی ہیں ان کا معاملہ ایسا ہی ہے، یعنی اس میں انقلابِ ماہیت عموماً نہیں پایا جاتا؛ بلکہ جملہ اجزاء اپنے بنیادی عناصر وا کثر خواص کے ساتھ مطلوب ومقصود ہوتے ہیں؛ لہٰذا اگر کوئی جزء بھی ناپاک شامل ہوگا، تو اس مرکب کا کھانا جائز نہ ہوگا؛ چنانچہ فتاویٰ رشیدیہ میں ہے :

**سوال:** اکثر ادویات انگریزی مثل عرق وغیرہ جو تیار ہوکر آتا ہے بہ ظاہر اس میں اختلاط شراب جو بہ وجہ سرعت نفوذ تاثیر کے باوصف قلت مقدار جو خصائص شراب سے ہے اور بعض واقف لوگوں سے بعض عرق و بسکٹ وغیرہ میں اختلاط شراب معلوم ہوا بھی ہے، ایسی حالت میں استعمال اس کا منع ہے یا نہیں؟

**جواب:** جس میں خلط شراب یا نجس شئ کا ہے اس کا استعمال باوجود علم کے حرام ہے، اور لاعلمی میں معذور ہے۔ (۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت مفتی محمود صاحبؒ گنگوہی جیسے اربابِ افتاء کے ان فتاویٰ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جن میں بسکٹ اور مختلف یونانی دواؤں کو اس وجہ سے ناجائز کہا گیا ہے کہ ان میں حرام اشیاء کی آمیزش ہوئی ہے۔ (۲)

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ''انقلابِ ماہیت'' سببِ طہارت ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں ائمۂ احناف کے درمیان اختلاف ہے، امام ابویوسفؒ کے نزدیک مطہر نہیں ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک مطہر ہے۔ درمختار میں ہے: **ويطهر زيت تنجّس بجعله صابونًا، به يفتى للبلوىٰ، وفي شرحه: ثمّ هذه المسئلة قد فرّعوها على قول محمّد بالطّهارة بانقلابِ العين الّذي عليه الفتوىٰ، واختاره أكثر المشايخ خلافًا لأبي يوسف** (۳)

البتہ فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر ہے، اور اس قول کو اختیار کرنے کی وجہ عمومِ بلویٰ ہے کہ لوگوں

(۱) فتاویٰ رشیدیہ، ص: ۵۷۵، ط: گلستاں کتاب گھر دیوبند۔

(۲) ملاحظہ ہو: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۱/۳۰۲، فتاویٰ محمودیہ: ۱۸/۱۸۷، مطبوعہ: ڈابھیل )

(۳) **الدّرّ مع الرّدّ: ۱/۵۱۹، ط: زكريا ديو بند.**

کے لیے باعثِ تنگی نہ بنے، چنانچہ شامی میں ہے: **ثمّ اعلم أنّ العلّة عند محمّد هي التّغيّر وانقلاب الحقيقة وأنّه يفتي به للبلوٰى كما علم ممّا مرّ ، و مقتضاه عدم اختصاص ذلك الحكم بالصّابون ، فيدخل فيه كلّ ما كان فيه تغيّر و انقلاب حقيقة و كان فيه بلوٰى عامّة (۱)**

نیز قلبِ ماہیت کی اعتباری حیثیت میں ''عموم بلویٰ'' کا بڑا دخل ہے، اور عمومِ بلویٰ کے زیادہ تر مسائل کا مدار تساہل وچشم پوشی پر ہے، ان میں عام لوگوں کو دقتوں سے بچانے کے لیے کئی طرح کے احتمالات کے باوجود اُن سے چشم پوشی کی جاتی ہے، چنانچہ شامی وغیرہ سے مختلف مقامات پر مردار کی چربی پر مشتمل صابون کو پاک قرار دیا، جب کہ صابون میں تیار ہونے کے بعد بھی چربی کے اثرات خصوصًا دسومت پوری طرح ختم نہیں ہوتی، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ صابون میں عمومِ بلویٰ ہے؛ اسی لیے جہاں بھی حکم صابون کا بیان ہوا وہاں عمومِ بلویٰ کا ضرور حوالہ ذکر کیا، اس طرح حضرت تھانویؒ نے بھی بہت سے مسائل میں عمومِ بلویٰ کے پیشِ نظر توسع اختیار کیا، چناں چہ حضرتؒ نے بہشتی زیور (۱۰۲/۹، اختری) میں اسپرٹ پر مشتمل دواؤں کے استعمال کی گنجائش دی ہے، اور اس کی وجہ ''عموم بلویٰ'' ہی ہے، چناں چہ محشّی نے وجہِ جواز بیان کرتے ہوئے لکھا: **و ما عدى ذلك (المسمّى بالخمر) من الأشربة فهي في حكم الثّلاثة الأخيرة (عصير العنب المسمّى بالطّلاء و نقيع الزّبيب ونقيع التّمر ) عند محمّد في الحرمة والنّجاسة ، وعند أبي حنيفة و أبي يوسف يحرم منها القدر المسكر، وأمّا القدر الغير المسكر فحلال إلاّ للّهو، وكلّها طاهر قليلاً كان أو كثيرًا ......... وظاهر أنّ الأحوط قول محمّد ؛ فلذا أفتى المتأخّرون به سدّا لباب الفتنة ؛ لكن في زماننا فقد عارضه عموم البلوى في شراب يقال له ''اسپريت''، فالأحوط في زماننا عسى أن يودّي إلى الجرأة في الإثم إذا لم يرالنّاس خلاصا كما لايخفى، فالأولٰى أن لايتعرض للمبتلى بشيء إلخ (۲)**

---

(۱) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۵۱۹/۱۔

(۲) بہشتی زیور: ۱۰۱/۹۔

یعنی شراب خواہ کسی بھی چیز سے بنی ہو، امام محمدؒ کے نزدیک قلیل و کثیر سب حرام ہے، اور یہی مفتیٰ بہٖ قول ہے، جس میں احتیاط ہے؛ لیکن آج کل ''اسپرٹ'' (جو ہر شراب) کے استعمال میں عموم بلویٰ ہے، اگر مفتی بہٖ قول کے مطابق اس کے ناجائز اور حرام ہونے کا فتویٰ دیا جائے گا تو لوگوں کو تنگی پیش آجائے گی، اور لوگ امر حرام کے ارتکاب میں لگ جائیں گے؛ اس لیے لوگوں کو گناہ سے بچانے کے لیے ''اسپرٹ'' پر مشتمل دواؤں کو عمومِ بلویٰ کی وجہ سے استعمال کرنے کی گنجائش ہوگی۔

الغرض صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورالصدر تعریف کے مطابق انقلابِ ماہیت کا تحقق ہوجاتا ہے، نیز اس چیز کے استعمال میں لوگوں کا ابتلائے عام بھی ہو تو شئ اوّل کا حکم بدل جائے گا، اگر مذکورہ بالا تعریف صادق نہ آئے؛ بلکہ صرف خلط و آمیزش ہو تو حکم نہ بدلے گا؛ البتہ کسی چیز کے خواص کی تشخیص اور مدارِ حکم کی تعیین کرکے انقلابِ ماہیت کا فیصلہ کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے، اس میں معتبر علمائے کرام کی طرف سے کامل تدبر کی نیز بسا اوقات خواصِ اشیاء کے ماہرین کی بھی رائے لینی پڑسکتی ہے۔

(۲) جہاں تک اس حوالے سے ''صارف'' کی ذمے داری کی بات ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ عوام کے درمیان شہرت یا افواہ پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے، صرف اس وجہ سے کسی چیز کی حرمت کا فیصلہ نہیں ہوسکتا؛ بلکہ شرعاً وہ چیز مباح الاستعمال ہی ہوگی؛ اس لیے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے؛ ہاں اگر بالیقین یا گمان غالب کے ساتھ کسی چیز میں حرام شئ کی آمیزش کا علم ہوجائے، تو اس شخص کے لیے بلا ضرورتِ شدیدہ اس چیز کا استعمال جائز نہ ہوگا؛ ہاں اگر علماء اور مفتیانِ کرام تحقیق کے بعد انقلابِ ماہیت یا ضرورت کی بناء پر جوازِ استعمال کا فتویٰ دیں تو پھر ان کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں، جیسے صابون، نمک اور راکھ وغیرہ کے بارے میں فقہاء نے انقلابِ ماہیت کا فتویٰ دیا، نیز جلاٹین کی تفصیلات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں بھی انقلابِ ماہیت ہوجاتا ہے۔

(۳) ناپاک چربی سے صابون بننے اور پاخانہ وغیرہ کے راکھ بننے کے بعد بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ اصل میں کیا چیز تھی؛ بلکہ شئ اوّل کے کچھ نہ کچھ اثرات بھی باقی رہتے ہیں، پھر بھی فقہاء نے ان جیسی چیزوں میں انقلابِ ماہیت تسلیم کیا؛ اس لیے اس جیسی مثالوں میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر کسی ذریعے سے اصل کا پتہ چل جائے تو یہ انقلابِ ماہیت کے تحقق کے لیے مانع نہ بنے گا؛

بلکہ صاحبینؒ کے نزدیک تو شراب کے سرکہ بن کر پاک وحلال بننے کے لیے سرکہ کا مکمل وصف پایا جانا ضروری نہیں؛ بلکہ اگر کسی قدر حموضت (کھٹّا پن) پیدا ہوگئی تو بھی انقلابِ ماہیت کا حکم لگے گا، بدائع الصّنائع میں ہے: **إنّما يُعْرَفُ التخلّل بالتّغيّر من المرارة إلى الحموضة بحيث لا يبقى فيها مرارة أصلاً عند أبي حنيفة – رضي الله عنه – حتّى لو بقي فيها بعض المرارة لايحلّ، و عند أبي يوسف و محمّد تصير خلًّا بظهور قليل الحموضة فيها**(۱)

اور یہ بات محقق ہے کہ اختلافِ ائمہ باعثِ تخفیف ہے؛ اس لیے اگر طبی ٹسٹ سے اصل کا پتہ چل جائے یا دو، چار فیصد شئ اوّل کے اوصاف میں سے باقی رہ جانے کا علم ہو جائے پھر بھی تبدیلئ ماہیت کا حکم لگے گا، خصوصًا جب کہ عمومِ بلویٰ ہو یا خارجی استعمال کی چیز ہو، اس تقریر سے سوال نمبر:۳ کے تحت ذکر کردہ تمام جزئیات کا حکم نکل آیا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۷/۳/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## ایل سیسٹائن (ایک خاص) دوا کا حکم

**سوال:** ﴿۱۰۱﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

ایل – سیسٹائن کیا ہے؟

گندھک ایمائینی ترشہ جو انسانی غذا کے ضروری عنصر میں سے ہے اور کئی طرح کے خامروں میں شامل ہوتی ہے۔

ہاضمے کے دوران پروٹین ٹوٹنے سے بننے والا امائنو ایسڈ جو سلفر پر مشتمل ہوتا ہے۔

ایل-سیسٹائن: ایک امینو ایسڈ (چربیلے نامیاتی مرکبات) ہے، جو کیمیکل فارمولہ **HO2CCH (NH2)CH2SH** سے بنایا جاتا ہے، یہ بہت سے پروٹین میں اہم ساختی کردار ادا کرتا ہے، جب کہ یہ کھانے میں اضافی شئ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

---

(۱) **بدائع الصّنائع**: ۴/ ۲۷۸، بیروت۔

سیسٹائن سب سے زیادہ اعلیٰ پروٹین والے کھانے کی اشیاء میں پایا جاتا ہے۔
جانوروں کے ذرائع: سور کا گوشت، سانچوں کا قیمہ، چکن، بطخ، انڈا، دودھ، پنیر وغیرہ۔
نباتات ذرائع: سرخ مرچ، لہسن، پیاز وغیرہ۔

استعمال:

سیسٹائن بنیادی طور پر L-enantiomer خوراک، دوائیاں اور ذاتی نگہداشت کی صنعت میں زیادہ استعمال ہوتا ہے، اس کا سب سے بڑا استعمال ذائقوں (Flavors) میں ہوتا ہے، مثال کے طور پر شوگر کے ساتھ سیسٹائن کا ردّعمل، میلارڈ ردّعمل میں میٹ فلیور پیدا کرتا ہے، اسے ایل- سیسٹائن بیکری مصنوعات بنانے میں معاون کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

سوال:

ایل- سیسٹائن پر مشتمل دوائیاں اور کھانے کے استعمال کا کیا حکم ہوگا؟ اس میں کوئی تفصیل ہوگی، مطلقاً ایسے اشیاء کو کھانا جائز ہوگا؟

المستفتي :
حلال کمیٹی
جمعیۃ علماء مہاراشٹر
(۳۸/ ۷/ د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب و باللّٰہ التّوفیق :

حلال جانوروں کے انڈے، دودھ، پنیر ہر قسم کے نباتات سے تیار شدہ ''ایل-سیسٹائن'' پر مشتمل اشیاء خوردنی اور دواؤں کو کھانے پینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، (۱) اسی طرح چکن، بطخ یا اسی

(۱)......(الف): البيضة إذا خرجت من دجاجة ميتة أكلت . (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۳۹)
(ب): لبن المأكول حلال. (ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۱۰/ ۳۸، كتاب الأشربة)
(ج): وكذا (الطّاهر) كلّ ما لا تحلّه الحياة حتّى الأنفحة واللّبن على الرّاجح .
(الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ۱/ ۳۶۰)

طرح کے دیگر حلال جانوروں سے تیار شدہ ایل-سیسٹائن پر مشتمل اشیاء کا حکم ہے، بہ شرطے کہ ذبحِ شرعی کے بعد ان سے ''مادّہ'' لیا گیا ہو،(۱) خنزیر یا اسی طرح دیگر حرام جانوروں یا غیر مذبوحہ حلال جانوروں سے تیار شدہ ''ایل-سیسٹائن'' پر مشتمل اشیاء خوردنی کا استعمال قطعًا جائز نہیں،(۲) جہاں تک داؤوں کی بات ہے تو اگر مریض کو اس کی سخت ضرورت ہو اور کوئی حلال متبادل موجود نہ ہو تو اسے استعمال کرنے کی گنجائش ہوگی (۳) ورنہ دواؤں کا استعمال بھی اشیاء خوردنی کی طرح ناجائز ہی رہے گا۔ **في الدّرّ مع الرّدّ: اختلف في التّداوي بالمحرّم، ففي النّهاية عن الذّخيرة: يجوز إن علم فيه شفاء ولم يعلم دواء آخر.** (۱/ ۳۶۵) ہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ''ایل-سیسٹائن'' بننے کے بعد تبدیلیٔ ماہیت کا تحقق ہو جاتا ہے، اصل چیز کے خواص و آثار تیار شدہ چیز میں باقی نہیں رہتے، تو پھر علی الاطلاق استعمال کرنے کی گنجائش ہو جائے گی،(۴) **في الدّرّ: ويطهر زيت تنجّس بجعله صابونًا به يفتى للبلوى...........ثمّ العلّة عند محمّد هي التّغيّر وانقلاب الحقيقة، و أنّه يفتى به للبلوى كما علم ممّا مرّ، ومقتضاه عدم اختصاص ذلك الحكم بالصّابون إلخ. (الدّرّ مع الرّدّ: ۱/ ۵۱۹)** فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/۶/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

(۱) وأمّا بيان شرط حلّ الأكل في الحيوان المأكول فشرط حلّ الأكل في الحيوان المأكول البرّيّ هو الزّكاة فلا يحلّ أكله بدونها. (بدائع الصّنائع: ۴/ ۱۵۵، كتاب الذّبائح)

(۲) قال الشّامي: لأنّه (الخنزير) نجس العين بمعنى أنّ ذاته بجميع أجزائه نجسة حيًّا وميّتًا. (ردّ المحتار على الدّرّالمختار: ۱/ ۳۵۷، مطلب في أحكام الدّباغة)

(۳) يجوز للعليل شرب الدّم و البول و أكل الميتة للتّداوي إذا أخبره طبيب مسلم أنّ شفاءه فيه ولم يجد من المباح مايقوم مقامه. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۵۵)

(۴) قال والاستحالة تطهر الأعيان النّجسة كالميتة إذا صارت ملحًا والعذرة ترابًا إلخ.
(الطّحطاوي مع المراقي، ص: ۱۶۱، ط: دارالكتاب، ديوبند)

## جلاٹین میں انقلاب ماہیت ہوتا ہے یا نہیں؟

**سوال:** ﴿۱۰۲﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں :

آج کل بہت سی دواؤں (مثلاً: کیپسول، سیرپ اور آپریشن کے بعد دی جانے والی خوراک) اور بے شمار اشیاء خوردنی اور غذائی مرکبات (مثلاً: جیلی، آئس کریم، چوکلیٹ، پھلوں اور ذائقہ دار دہی، کیک اور مٹھائیوں) میں ''جلاٹین'' نامی ایک مادّہ کی آمیزش ہوتی ہے اور فی زماننا اس کی حیثیت تقریباً جزو لازم کی ہے، جلاٹین عموماً کھالوں اور ہڈیوں سے تیار کی جاتی ہے، جن میں مذبوحہ، غیر مذبوحہ ماٴکول اللحم وغیر ماٴکول اللحم حتی کہ خنزیر کی کھالیں اور ہڈیاں بھی ہوتی ہیں، اور ''جلاٹین'' کی تیاری کا مرحلہ ایک طویل مرحلہ ہے، اس سے متعلق کچھ تفصیلات سہولت کے لیے لفِ استفتاء کی جارہی ہیں(۱) دریافت طلب امر یہ ہے کہ جلاٹین پر مشتمل دواؤں اور غذائی مرکبات کا استعمال شرعاً کیسا ہے؟ واضح رہے کہ بعض مفتیان نے انقلابِ ماہیت مان کر ان کے کھانے کے جواز کی بات کہی ہے، ہم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان اشیاء کے استعمال کی گنجائش ہے یا نہیں؟ امید کہ بالتفصیل مع الدلائل جواب دے کر مشکور وممنون فرمائیں گے۔

والسلام

حافظ حسن احمد

جمیرا، دبئی، امارات

(۶۶۷/د ۱۴۳۴ھ)

---

(۱)

جلاٹین اور اس کے حصول کے ذرائع :　　ڈاکٹر اصغر علی

جلاٹین مختلف چیزوں سے حاصل کیا ہوا ایک Product ہے جو کہ جانوروں کی آنتوں، ہڈیوں اور کھالوں کو ایک خاص شکل میں دینے کے بعد حاصل ہوتا ہے، جو کہ کبھی بھی اپنی اصلی حالت میں واپس نہیں ہوتا۔

جلاٹین حاصل ہونے کے ذرائع عام طور سے جانوروں کی ہڈیاں اور کھالیں ہیں، جس میں خنزیر کی کھال بھی شامل ہے، جس سے عام طور پر Hard Capsule بنتے ہیں۔　　==

باسمہٖ تعالیٰ

## الجواب و باللہ التّوفیق :

استفتاء کے ساتھ منسلکہ تفصیلات نیز اس موضوع سے متعلق دیگر تحریروں میں جلاٹین بنانے کے جو طریقے بیان کیے گئے ہیں، اُن کا حاصل یہ ہے کہ ہڈیوں اور کھالوں کو صاف کرنے اور دباغت دینے کے بعد تیزاب میں ایک لمبی مدت تک بھگائے رکھتے ہیں، پھر چونے میں چار یا آٹھ گھنٹے رکھتے ہیں، بعد میں گرم پانی میں رکھتے ہیں، پھر ٹھنڈا کرنے کے بعد پیس کر سفوف یا لیس دار مادّے

---

==

جلاٹین بنانے کے مختلف طریقے:

(۱) سوکھی ہوئی ہڈی یا کھال کو صاف کرنے کے بعد اس کو 5%Hd (ایک طرح کے تیزاب) میں دس سے پندرہ دن تک رکھتے ہیں، جو ایک کیمیکل کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جسے Dicalcium Phosphate کہتے ہیں، پھر اس کیمیکل کو 10%Lim (چونا) میں چار سے آٹھ گھنٹے تک رکھتے ہیں، اس کے بعد چونے سے نکال کر اس کو گرم پانی میں ڈالتے ہیں، پھر اس کو ٹھنڈا کر کے خشک کرتے ہیں اور اس کی نمی کو اڑانے کے بعد پیس کر جلاٹین بناتے ہیں۔

(۲) بچھڑے کی کھال کو دھو کر 10%Lim چونا میں چھ سے بارہ گھنٹے تک رکھتے ہیں، چونے سے نکال کر اس کو گرم پانی میں ڈال دیتے ہیں، پھر مندرجہ بالا پہلے طریقہ کے مطابق جلاٹین بنا لیتے ہیں۔

(۳) خنزیر کی کھال کو صاف کر کے دھو کر 1.5%Hcl (تیزاب) میں دس سے تیس گھنٹے رکھتے ہیں، پھر تیزاب سے نکال کر گرم پانی میں ڈال دیتے ہیں، پھر مندرجہ بالا طریقہ سے جلاٹین حاصل کرتے ہیں۔

میڈیکل :

میڈیکل میں جلاٹین عام طور پر کیپسول بنانے میں استعمال ہوتا ہے، اس سے نرم اور گرم دونوں قسم کے کیپسول بنائے جاتے ہیں، اس کے علاوہ یہ پیسٹ، Passted Coffee کے بنانے میں بھی استعمال ہوتا ہے، نیز مصنوعی جوس میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

تیار کرتے ہیں، نیز ان تحریرات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ''کولاجین''(۱)

(۱)　　　　　کولاجین اور جلاٹین پروٹین کا حصہ ہیں

(خلاصہ از مقالہ: ڈاکٹر محمد اسلم پرویز)

(پرنسپل ذاکر حسین کالج نئی دہلی)

پروٹین (لحمیات):

یہ ہر جاندار کے جسم کو بنانے کے لیے نہایت ضروری ہیں، ہر ذی حیات جاندار کا جسم اس سے بنا ہوا ہے، یعنی اس کے جسم میں سب سے زیادہ مقدار پروٹین کی پائی جاتی ہے۔

پروٹین (لحمیات) کا بڑا حصہ گوشت اور دال وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

پروٹین دو قسم کے ہوتے ہیں:

(الف) جو ہمارے جسم میں خامرے بناتے ہیں جس کو انگریزی میں اینزائمس (Enzymes) کہا جاتا ہے، یہ ہمارے جسم میں ہر طرح کا کیمیائی عمل کرتے ہیں جس میں ہاضمے کا نظام بھی شامل ہے۔

(ب) وہ پروٹین جو ساخت بناتے ہیں یہ ریشے والے پروٹین ہوتے ہیں یہ ہمارے پٹھوں میں پائے جاتے ہیں اور ہمارے جسم کی ساخت اور بناوٹ میں شامل ہیں۔

ریشے والے پروٹین دو قسم کے ہوتے ہیں:

{۱} کولاجین - ریشے والے پروٹین کے زمرہ میں آتا ہے، یہ فطری طور پر پروٹین حاصل کرنے کا ایک مجموعہ ہے، پروٹین لیس دار ہوتے ہیں، پانی میں نہیں گھلتے اور ناقابل ہضم ہوتے ہیں، جن چیزوں سے گوشت ہڈی سے جڑا ہوتا ہے، وہ سفید لیس دار مادہ جو بہت سخت ہوتا ہے، یہی وہ مادّہ ہے جسے ''کولاجین'' کہا جاتا ہے ............ جانور کے جسم میں سب سے زیادہ مقدار اسی پروٹین کولاجین کی ہوگی۔ ریڑھ دار جانور کے کل پروٹین کا ایک تہائی کولاجین ہوتا ہے، کولاجین کھال کے ریشوں میں، خون کی نسوں میں، ہڈی میں اور نرم ہڈی (جسے کرکری ہڈی) کہتے ہیں جس میں سختی کم ہوتی ہے (جس سے ہمارے کان اور ناک بنے ہیں) میں پایا جاتا ہے۔

{۲} الاسٹین - ریشے دار پروٹین کی دوسری قسم جو نسبتاً کم سخت ہوتی ہے اور یہ کھال کا جز ہوتی ہے، الاسٹین کہلاتا ہے جو کھال اور خون کی نسوں میں پایا جاتا ہے، اس میں نسبتاً کھنچاؤ ہے اور سختی کم ہے۔　==

== کولاجین کو تحلیل کر کے جلاٹین بنائی جاتی ہے، اس تحلیل کو ہائیڈرو لائسس کہتے ہیں، یعنی تحلیل کا وہ خاص عمل جس میں پانی کا استعمال کیا جاتا ہے؛ کیوں کہ لائسس کا مطلب ہے توڑنا اور ہائیڈرو کا مطلب ہے پانی، یعنی پانی کی رو سے کسی چیز کو تحلیل کرنا، یہ عمل تیزاب اور الکلی دونوں کی مدد سے کیا جا سکتا ہے، دونوں طریقے استعمال کیے جاتے ہیں، کولاجین کو گلا کر اور تحلیل کر کے جلاٹین بنانے کے لیے جانور کی ہڈیاں یا کھال وغیرہ ایک بڑے برتن میں تیزاب میں ایک مخصوص مدت کے لیے ڈال دی جاتی ہیں، یہ مخصوص مدت کمپنیوں کا ایک تجارتی راز ہے، اس کو ٹریڈ سکریٹ کہا جاتا ہے؛ کیوں کہ جتنا یہ استحالہ سے گذریں گی اتنی ہی تحلیل ہوں گی، اتنے ہی کوالٹی میں فرق پڑتا ہے، الکلی عمل وہی پرانا اور روایتی طریقہ ہے جس میں باقاعدہ ایک طرح سے چونے کی کنڈیاں بنائی جاتی ہیں، گڈھے اور بڑے بڑے ناند بھی استعمال ہوتے ہیں، اس میں چونے کے پانی میں ہڈیوں کو ساٹھ دن کے لیے ڈال دیا جاتا ہے، کھال کو سوڈا کاسٹک کے سولوشن میں کم مدت کے لیے رکھا جاتا ہے، بعد ازاں ان کو دھو کر الکلی کے اثر کو زائل کیا جاتا ہے، یہ عمل دونوں میں کیا جاتا ہے کہ ان دونوں چیزوں کو یعنی کھال اور ہڈی کو تیزاب سے گلائیں یا الکلی سے گلائیں، گلانے کا عمل مکمل ہونے کے بعد ان کو دھویا جاتا ہے، تا کہ تیزابیت اور الکلی کا اثر زائل ہو جائے، اس کے بعد تیزاب یا الکلی کے مراحل سے گذرتے ہوئے ان اجزاء سے گرم پانی کی مدد سے جلاٹین کا محلول یا گھول تیار کیا جاتا ہے، جس میں چار سے سات فیصد جلاٹین ہوتی ہے، یعنی بہت ہی ڈائیلیوٹ یا کم قوت کا محلول یا سلوشن ہمیں جلاٹین کا ملتا ہے، اس کو چھان کر صاف کر کے خالص کیا جاتا ہے، جس میں پھر ۲۵ سے ۳۰ فیصد تک جلاٹین ہوتی ہے، اس کو خشک کر کے پاوڈر کی شکل میں تیار کر لیا جاتا ہے۔

پہلا نقطہ یہ ہے کہ جلاٹین کی ظاہری ساخت، شکل، رنگت، ذائقہ، بو ہر چیز کولاجین سے مختلف ہوتی ہے؛ کیوں کہ کیمیائی عمل سے گذرنے کے بعد اور تحلیل ہونے کے بعد ایک نئی چیز وجود میں آتی ہے۔

دوسرا نقطہ یہ ہے کہ جلاٹین ایک الگ قسم کا کیمیائی مادّہ اور پروٹین ہے جو کولاجین سے مختلف ہے، یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ جلاٹین کا مادّہ اور جلاٹین بالکل الگ چیز ہے، کولاجین کے مقابلہ میں اور اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ جلاٹین کتنی نرم ہوتی ہے اس کا اندازہ ان لوگوں کو ہوگا جنھوں نے وہ آئس کریم کھائی ہو، جس کو کون میں رکھ کر دیا جاتا ہے، جس کو سافٹی کہا جاتا ہے، وہ اتنی نرم ہوتی ہے کہ اس میں ہونٹ یا زبان لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، سیدھے اندر چلی جاتی ہے، اس میں یہ پھولا پن جس کو فلافیلس کہتے ہیں، وہ جلاٹین کی وجہ سے آتا ہے، کہاں یہ مادّہ اور کہاں وہ کولاجین کہ جو نہ گلتا ہے اور نہ پانی میں ہضم ہو سکتا ہے، جب کہ یہاں اس کی ساخت بالکل بدل گئی ایک دوسری چیز وجود میں آ گئی، کہ وہ کولاجین تھا یہ جلاٹین ہے۔ ==

(ہڈیوں اور کھالوں سے حاصل کردہ اصل مادّہ جس سے جلاٹین بنتی ہے) اور تیار شدہ جلاٹین کے خواص میں کوئی اتحاد نہیں ہوتا؛ بل کہ جلاٹین کے خواص، اس کی ظاہری ساخت، شکل، رنگت، ذائقہ، بو، ہر چیز ''کولاجین'' سے مختلف ہوتی ہے، اگر یہ تفصیلات واقع کے مطابق اور سچ ہیں تو شرعًا اس پر انقلاب ماہیت کی تعریف صادق آتی ہے اور اس پر مشتمل دواؤں یا غذائی مرکبات کا استعمال جائز ہے، اس سلسلے میں فقہ حنفی کی کتابوں میں مذکور درج ذیل مثالوں اور عبارتوں سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔

(۱) شامی میں ہے: وَيَطْهُرُ زَيْتٌ تَنَجَّسَ بِجَعْلِهِ صَابُوْنًابِهٖ يُفْتٰى لِلْبَلْوٰى (۱) یعنی اگر

== تیسرا نقطہ یہ ہے کہ کولاجین میں پائے جانے والا کوئی بھی مخصوص مادّہ جلاٹین میں نہیں ہے، یعنی اس کی ہائیڈروکسی پرولین یا پرولین یا ان کی مقداریں زیادہ ہونا، گلائسین اور الینین کی جو خصوصیت تھی وہ جلاٹین میں نہیں پائی جاتی؛ کیوں کہ یہ سائنسی اصول ہے کہ تبدیلیاں کائنات میں دو طرح کی ہوتی ہیں: ایک کو ہم ظاہری تبدیلی کہتے ہیں، یعنی فزیکل چینج، جس میں چیز اپنی ظاہری شکل بدلتی ہے؛ لیکن اس کی کیمیائی شکل، ساخت، تاثیر، خواص، خاصیت وہی کی وہی رہتی ہے، مثال کے طور پر پانی کا جم کر برف بن جانا، برف کا پگھل کے پھر پانی بن جانا، پانی کا بھاپ بننا، بھاپ کا تبخیر کے عمل سے واپس پانی بن جانا، یہ طبعی تبدیلیاں ہیں، اس تبدیلی سے گذرا ہوا مادّہ اپنی خاصیت قطعًا نہیں بدلتا، اس کے برخلاف دوسری تبدیلی کیمیائی تبدیلی ہے، اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ اس تبدیلی کے لیے جو خام مال استعمال کیا جاتا ہے، تبدیلی کے بعد اس کی خاصیت، بناوٹ، ہر چیز خام مال سے بالکل الگ ہوتی ہے، مثال کے طور پر ہرے پودوں میں قدرتًا جو ضیائی تالیف کا عمل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہرے رنگ میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ شکر سازی کرتا ہے، اور گلوکوز بناتا ہے، یہ گلوکوز کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی کے ملنے سے بنتا ہے، کاربن ڈائی آکسائیڈ اس وقت ہوا میں موجود ہے، پانی بھی موجود ہے؛ لیکن یہاں وہ میکنزم نہیں ہے؛ اس لیے یہاں کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی مل کر گلوکوز نہیں بنے گا، تو پانی اور کاربن ڈائی آکسائیڈ مل کر گلوکوز بننا ایک کیمیائی عمل ہے؛ کیوں کہ گلوکوز میں نہ کوئی خاصیت کاربن ڈائی آکسائیڈ کی ہے نہ پانی کی، یہ ایک الگ کیمیائی مادّہ ہے، تو کیمیائی تبدیلی وہ تبدیلی ہے جس کے نتیجہ میں بننے والی چیز اس چیز سے یکسر مختلف ہوتی ہے، جس سے وہ بنی ہے، اسی طرح جلاٹین سازی ایک کیمیائی عمل ہے، لہٰذا جلاٹین کولاجین سے یکسر مختلف چیز ہے۔

(۱) شامي: ۵۱۹/۱۔

ناپاک تیل سے صابن تیار کیا جائے تو پاک مانا جائے گا، اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ صابن بننے کے بعد ''انقلاب ماہیت'' ہوگیا اور انقلاب ماہیت سبب طہارت ہے امام محمدؒ کے نزدیک اور اسی پر فتویٰ ہے، شامی میں ہے: **ثُمّ هٰذِهِ الْمَسْئَلَةُ قَدْ فَرَّعُوْهَا عَلٰى قَوْلِ مُحَمَّدٍ بِالطَّهَارَةِ بِانْقِلَابِ الْعَيْنِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْفَتْوٰى** (۱) اور اس کی تفریع کے طور پر بیان کیا گیا کہ اگر انسان یا کتّا صابون کے دیگ میں گر کر صابون بن جائے، تو پاک ہوجائے گا۔ **وَعَلَيْهِ يَتَفَرَّعُ مَا لَوْ وَقَعَ إِنْسَانٌ أَوْ كَلْبٌ فِيْ قِدْرِ الصَّابُوْنِ، فَصَارَ صَابُوْنًا، يَكُوْنُ طَاهِرًا لِتَبَدُّلِ الْحَقِيْقَةِ** (۲) تو یہاں فقہاء نے نجس تیل سے صابون بننے یا کتّا یا انسان کے صابون کے دیگ میں پک جانے کو انقلاب ماہیت قرار دیا اور اس کی وجہ سے تیار شدہ چیز کو پاک گردانا، اگر ''جلاٹین'' تیار کرنے کے مرحلے کو دیکھیں تو اس میں صابون کے دیگ میں پکنے سے زائد تبدیلیٔ ماہیت اور تغیرات کے ذرائع استعمال کیے جارہے ہیں، صابون میں گلانے، ملانے اور پکانے کا عمل تو زیادہ سے زیادہ ایک دو دن ہوتا ہوگا اور صابون بننے کے بعد چربی کے اثرات کا باقی رہنا تو بالکل بدیہی ہے، اور جلاٹین بنانے کے لیے تو ہڈیوں اور کھالوں کو دس پندرہ دن تیزاب میں رکھا جاتا ہے، پھر چونے اور گرم پانی میں رکھا جاتا ہے، نیز تیار ہونے کے بعد ''جلاٹین'' میں اصل مادہ ''کولاجین'' کا کوئی اثر بھی باقی نہیں رہتا؛ اس لیے یہاں بہ درجۂ اولیٰ انقلاب ماہیت کا تحقق ہوگا۔

(۲) بدائع الصّنائع میں ہے: **إِذَا تَخَلَّلَتْ (الْخَمْرُ) بِنَفْسِهَا، يَحِلُّ شُرْبُ الْخَلِّ بِلَا خِلَافٍ...... فَأَمَّا إِذَا خَلَّلَهَا صَاحِبُهَا بِعِلَاجٍ مِنْ خَلٍّ؛ أَوْمِلْحٍ، أَوْ غَيْرِهِمَا، فَالتَّخْلِيْلُ جَائِزٌ وَالْخَلُّ حَلَالٌ عِنْدَنَا** (۳) یعنی شراب خود بہ خود یا نمک وغیرہ ڈالنے کی وجہ سے سرکہ بن جائے تو ایسا کرنا نیز اس کے نتیجے میں تیار شدہ سرکہ کا پینا شرعًا جائز ہے۔ اگر جلاٹین سازی کے طریقۂ کار کو دیکھا جائے تو یہاں نمک سے زیادہ متبدل کرنے والی چیز مثلاً تیزاب، چونا، کیمیکل،

---

(۱) شامي: ۱/۵۱۹۔
(۲) الدّرّ مع الرّدّ: ۱/۵۱۹۔
(۳) بدائع الصّنائع: ۴/۲۷۹۔

وغیرہ استعمال ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اصل کا کوئی وصف باقی نہیں رہ جاتا، جب کہ شراب میں صرف مرارت یعنی ترشی کی جگہ حموضت آجاتی ہے اور شراب کے منقلب الماہیۃ ہونے میں اتنی تبدیلی کو ہی معیار بنایا گیا۔ وَ إنّمَا يُعْرَفُ التَّخَلُّلُ بِالتّغيُّرِ مِنَ الْمَرَارَةِ إلَى الْحُمُوْضَةِ(۱) اور باقی اوصاف نیز اصل مادّہ بعینہٖ باقی رہتا ہے، جلاٹین میں اصل کا کوئی وصف باقی نہیں رہتا اور نہ ہی اس کی شکل وصورت، بو، مزہ وغیرہ باقی رہتی ہے؛ اس لیے اس چیز کے پیشِ نظر بھی انقلابِ ماہیت کا تحقق یہاں یعنی جلاٹین میں ہو جاتا ہے۔

(۳) تبیین الحقائق میں ہے: لَوْ أُحْرِقَتِ الْعَذِرَةُ، وَ صَارَتْ رَمَادًا طَهُرَتْ لِلاِسْتِحَالَةِ(۲) یعنی پاخانہ اور گوبر جیسی ناپاک چیز جل کر راکھ ہو جائے تو یہ بھی انقلاب ماہیت ہے، اس کی وجہ سے سابقہ حکم بدل جائے گا، تو یہاں ''رمادا'' میں صرف آگ کے ذریعے جلا کر راکھ بنانے کا عمل ہے، اور جلاٹین بنانے میں تیزاب، چونا اور کیمیکل کے ذریعے جلانے اور پگھلانے کا کام لیا جاتا ہے، پھر پیسنے کا عمل ہوتا ہے، نتیجۃً راکھ کی طرح ایک نئی چیز وجود میں آتی ہے، جس کی شکل وصورت، بو مزہ سب اوّل سے مختلف ہے؛ لہٰذا اس اعتبار سے بھی یہاں (جلاٹین سازی میں) انقلابِ ماہیت صادق آتی ہے۔

(۴) انقلابِ ماہیت کے سببِ طہارت ہونے میں عموم بلوی کا بھی بڑا دخل ہے، عموم بلویٰ ہی کی وجہ سے طہارت کا قول جو امام محمدؒ کا مسلک ہے لیا گیا، چنانچہ شامی نے جہاں کہیں نجس چربی کے صابون بننے کے بعد پاک ہونے کا ذکر کیا، خصوصیت کے ساتھ عموم بلوی کا بھی ذکر کیا، نیز عموم بلوی خود حکم کے اندر تخفیف کا باعث ہے، فقہ کا مشہور ضابطہ ہے ''إذا عَمَّتْ بليته هانَتْ قضيته'' اور ''جلاٹین'' کا استعمال خصوصًا دواؤں اور معالجات کے باب میں اتنا عام ہو گیا کہ اس سے بچنا مشکل ہے؛ اس لیے مذکورہ بالا جزئیات کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ جلاٹین میں انقلابِ ماہیت کا تحقق ہو جاتا ہے اور اس پر مشتمل دواؤں اور غذائی مرکبات کا استعمال جائز ہے؛ لیکن بہر حال مسئلہ چوں کہ مجتہد فیہ ہے؛

(۱) بدائع الصّنائع: ۲۷۸/۴۔

(۲) تبیین الحقائق: ۲۲۰/۸۔

اس لیے حتی الامکان خصوصًا داخلی استعمال سے بچنا چاہیے؛ نیز مسلمانوں خصوصًا وہ لوگ جن کا اشیاء خوردنی کی تیاری یا جلاٹین یا دوا سازی سے تعلق ہے ان پر ضروری ہے کہ جلاٹین سازی کے لیے حلال متبادل کی تلاش کریں، مردار یا خنزیر کے اجزاء کے استعمال سے پرہیز کریں، مغرب کی طرف سے آنے والی ہر چیز کو آنکھ بند کر کے قبول نہ کریں؛ بلکہ دین و شریعت کی روشنی میں جو چیز حلال و جائز کے دائرے میں آئے، اس کو اپنانا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/۴/۳۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

جواب ماشاء اللہ محقق ہے؛ لیکن چوں کہ یہ مسئلہ جدید نوعیت کا ہے، اور بہت باریک ہے، نیز جلاٹین سازی کے کارخانے کا بہ ذات خود مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے سارے گوشے مکمل طور پر واضح نہیں معلوم ہو رہے ہیں؛ اس لیے حتمی طور پر تبدیلِ ماہیت کی بات کہنے میں احقر کو ہنوز توقف ہے۔

فخر الاسلام نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

## جلاٹین اور اس پر مشتمل ادویہ اور اشیاء خوردنی کا حکم

**سوال:** ﴿۱۰۳﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں:

قبل اس کے ہم جلاٹین کو سمجھیں ہم کولاجن کی تعریف اور اس کی مختصر تفصیل پیش کرتے ہیں؛ اس لیے کہ کولاجن کے ذریعہ ہی جلاٹین بنایا جاتا ہے۔

کولاجن کیا ہے؟

کولاجن فطری طور سے پروٹین حاصل کرنے کا ایک مجموعہ ہے، جو جانوروں میں خاص طور سے گوشت میں اور ریڑھ کی ہڈی کے جوڑنے والے انسجوں میں ہوتا ہے، یہ جوڑنے والے انسجوں کا سب سے اہم جزء ہے، اور ستنداریوں یعنی پستانیا جانوروں (Mamrna ls) میں سب سے

زیادہ پروٹین ہوتا ہے، اس میں پورے جسم کا تقریباً پچیس فیصد سے لے کر پینتیس فیصد تک پروٹین ہوتا ہے۔ کولاجن مطول ریشوں کی شکل میں زیادہ تر ریشہ دار انسجوں میں پایا جاتا ہے، جیسے پٹھا (عضلہ) رباط (عضو یا جوڑ کو سہارا دینے کے لیے نسیج کی مضبوط پٹی) اور چمڑا، اسی طرح یہ قرنیہ (آنکھ کے ڈھیلے کا بیرونی پردہ) کرکری ہڈی (چبنے والی ہڈی) ہڈی، خون کی نالی، آنت، ریڑھ کی ہڈیوں کے مہروں کے درمیان کی ٹکیا میں کثرت سے ہوتا ہے۔ لیفی نہوض (کولاجن تیار کرنے والا خلیہ) سب سے زیادہ عام خلیہ ہے جو کولاجن پیدا کرتا ہے۔

کولاجن کا کام کیا ہے؟

کولاجن جسم کے مختلف ڈھانچوں کو طاقت دینے، جراثیمی ماڈے، ماحولیاتی سم (زہر) اور حیاتیات اور کینسر کے چھوٹے خلیات کو جذب کرنے اور پھیلنے سے روکنے کے ذریعہ چمڑے جیسے ڈھانچوں کی حفاظت کرتا ہے، کولاجن پروٹین ایک سمینٹ ہے جو ہر جزء کو جوڑ کر رکھتا ہے۔

اسی طرح کولاجن تمام چیکنی عضلات، انسجوں، خون کی نالیوں، ہضمی نالیوں، صفراوی تھیلی، دل گردے اور مثانے جیسے عضو میں پایا جاتا ہے، اور یہ خلیوں اور انسجوں کو جوڑے رکھتے ہیں، کولاجن بال اور ناخن کا بڑا جزء ہے۔

## جلاٹین:

جلاٹین نیم شفاف، بیرنگ، آسانی سے ٹوٹنے والی (جب خشک ہوجائے) اور بے مزہ ٹھوس ماڈہ ہوتا ہے، جو اس کولاجن سے نکالا جاتا ہے، جو مختلف جانوروں کے بائی ورڈک (ذیلی پیداوار) سے نکالا جاتا ہے۔

یہ عام طور پر غذاء دواسازی، فوٹوگرافی، اور کاسمیٹک (نمائشی) کی تیاری میں جیلنگ ایجنٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

جلاٹین، کولاجن کی ایک ناقابل واپسی ہائڈرولائزڈ شکل ہے، اور اس کی کھانے کے اشیاء کے طور پر درجہ بندی کی گئی ہے۔

اسی طرح بعض جلاٹین زرعی پیداوار یعنی نباتات کے ذریعے بھی بنائی جاتی ہے۔

سوال:

جلاٹین آج کل بہت کثرت سے استعمال ہوتا ہے، عام طور سے دواؤں کے جتنے کیپسول ہوتے ہیں وہ جلاٹین سے ہی بنے ہوتے ہیں، جیلی اور آئس کریم وغیرہ میں بھی استعمال ہوتا ہے؛ بلکہ بہت ساری چاکلیٹوں اور ٹافیاں وغیرہ اور دوسری بہت سی کھانوں کی اشیاء میں استعمال ہوتا ہے۔

جلاٹین جیسا کہ اوپر اس کی تفصیل میں گذرا کہ یہ جانوروں کے ذیلی پیداوار جیسے کھال، ہڈی وغیرہ سے اور کبھی نباتات سے بنائی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا جلاٹین سے بنی اشیاء کا استعمال مطلقاً درست ہوگا یا اس میں یہ حکم مقید ہوگا؟ بعض لوگوں کی رائے میں اس میں ماہیت تبدیل ہوتی ہے اور بعض کے نزدیک اس کے اجزاء کسی حد تک باقی رہتے ہیں۔　　　　(۳۸/د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التّوفیق

استفتاء میں ''کولاجن'' ''جلاٹین'' اور ان کے مآخذ کا ذکر وتعارف تو موجود ہے؛ لیکن یہ مذکور نہیں ہے کہ ''جلاٹین'' کس طرح بنتا ہے؟ جانوروں کی کھالوں، ہڈیوں وغیرہ کو کن کن مرحلوں سے گزارا جاتا ہے؟ ان میں کس طرح کا کیمیائی عمل کیا جاتا ہے؟ جلاٹین بننے کے بعد سابقہ خواص باقی رہتے ہیں یا نہیں؟ بہرحال تحقیق کے بعد ہمیں اس سلسلے میں جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ ہیں کہ ہڈیوں، کھالوں وغیرہ کو صاف کرنے اور دباغت دینے کے بعد، تیزاب میں ایک مدت تک بھگائے رکھتے ہیں، پھر چونے میں چار یا آٹھ گھنٹے رکھتے ہیں، بعد میں گرم پانی میں رکھتے ہیں، پھر ٹھنڈا کرنے کے بعد پیس کر سفوف یا لیس دار مادّہ تیار کرتے ہیں، نیز متعلقہ تحریروں کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلا کہ ''کولاجین'' اور تیار شدہ جلاٹین کے خواص میں کوئی اتحاد نہیں ہوتا؛ بلکہ جلاٹین کے خواص اس کی ظاہری ساخت، شکل، رنگت، ذائقہ، بو ہر چیز ''کولاجین'' سے مختلف ہوتی ہے۔(۱)

اگر مذکورہ بالا معلومات واقع کے مطابق اور سچ ہیں تو شرعاً اس پر انقلابِ ماہیت (انقلابِ عین

(۱) ملاحظہ کریں: ڈاکٹر محمد اسلم پرویز صاحب کے مقالے کا خلاصہ، ص: ۳۲۶ پر۔

جس میں استحالہ کے نتیجہ میں وصف واثر زائل ہوجایا کرتا ہے ) کی تعریف صادق معلوم ہوتی ہے ؛(۱) اس لیے ''جلاٹین'' پر مشتمل دواؤں اور غذائی مرکبات کا استعمال شرعاً مباح ہے؛ لیکن بہر حال چوں کہ یہ ایک نیا اور مجتہد فیہ مسئلہ ہے؛ اس لیے مردار یا حرام جانوروں کے اجزاء سے تیار شدہ ''جلاٹین'' کے داخلی استعمال سے حتی الامکان بچنا چاہیے،(۲)

نیز مسلمانوں -خصوصًا وہ لوگ جن کا اشیائے خوردنی کی تیاری یا ''جلاٹین'' یا دواسازی سے تعلق ہے- پر ضروری ہے کہ جلاٹین سازی کے لیے حلال متبادل کی تلاش کریں ، مردار یا خنزیر کے اجزاء کے استعمال سے پرہیز کریں، نیز حلال کمیٹیوں کو چاہیے کہ اس سلسلے میں بیداری پیدا کریں اور مناسب کوشش کریں۔

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/ ۶/ ۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح :حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری ، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

(۱) يستفاد من النّصوص الفقهيّة التّالية :

(الف) : والاستحالة تُطَهِّرُ الأعْيَانَ النّجسة كالميتةِ إِذَا صَارَتْ ملحًا وَالعَذِرَةُ تُرَابًا إلخ .

(حاشية الطّحطاوي على المراقي،ص:۱۶۱)

(ب) إنّ النّجاسةَ لمّا استحالتْ ، و تبدّلَتْ أوصافُها ومعانيهَا خرَجتْ عن كونها نجاسةً ؛ لأنّها اسمٌ لِذاتٍ مَوصُوفةٍ ، فَتَنْعَدِمُ بانْعِدَامِ الوصفِ ، وصارتْ كَالخَمْرِ إِذَا تَخَلّلتْ .

(بدائع الصّنائع:۱/۲۴۳، كتاب الطّهارة ، الدّباغة)

(ج) ثُمّ هٰذه المسئلة قد فرعوها على قول محمّد بالطّهارة بانقلاب العين الّذي عليه الفتوٰى . (ردّ المحتار على الدّرّ المختار:۱/۵۱۹، باب الأنجاس)

(د) في كفاية المفتي:۲/ ۳۲۸-۳۳۴، بحث أنيق . بشأن هذهِ المسئلة .

(۲) لما قال النّبيّ صلّى اللّه عليه وسلّم – دَعْ مَا يُرِيْبُكَ إِلىٰ مَا لَا يُرِيْبُكَ .

(أخرجه التّرمذيّ ، رقم: ۲۵۱۸، باب بلا عنوان)

# ''اسٹیم سیل خلیہ''(Stem cell) سے دوا تیار کرنے کا حکم

**سوال:** ﴿۱۰۴﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

''اسٹیم سیل خلیہ''(Stem cell) جو کہ عورت کے بچہ دانی سے بچہ کی ناف تک جڑی نالی میں پایا جاتا ہے، جسے بچہ کے پیدا ہوتے ہی کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے، اِسی اسٹیم خلیہ سے آج بہت سے علاج کئے جا رہے ہیں، مثلاً: بالوں کے جھڑ جانے کو روکنا، گرے ہوئے دانتوں کو قدرتی طور سے پھر سے اُگانا، ہارٹ (دل) کی مری ہوئی رگوں کو پھر سے تندرست کرنا، ہڈیوں کے جوڑوں کو صحت یاب کرنا، جلی ہوئی جلد کو پھر سے اُگانا، ناقص ہوئے گردوں کو پھر سے کام کرنے والا بنانا وغیرہ، اُسی نالی کو کہ نجس اورنا پاک قرار دے کر پھینک دیا جاتا ہے۔

اِس معاملے میں شرعی طور سے جائز و ناجائز پر روشنی ڈالیں، اِس سے بہت سے اہلِ ایمان مستفید ہوسکیں گے۔

مستفتی: غلام احمد کھنگھٹے، انوشکتی نگر ممبئی

(۲۶۲/ د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالٰی

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق :**

انسان اشرف المخلوقات ہے اور یہ جمیع اجزاء قابلِ احترام ہے، اوراجزاء انسانی کو دواؤں میں استعمال کرنا تکریمِ انسانی کے منافی اوراس کی توہین ہے، اگر کوئی جزء ناکارہ ہے تو احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اسے دفن کردیا جائے۔ **الآدمي مکرّم شرعًا وإن کان کافرًا إلخ** (۱) **ولا یجوز بیع شعور الإنسان ولا الانتفاع بها ؛ لأنّ الآدمي مکرّم لا مبتذل فلا یجوز أن یکون شيء من أجزائه مهانًا و مبتذلاً** (۲)؛ لہٰذا استفتاء میں مذکور ''نالی'' یا اس سے حاصل شدہ خلیوں کا

(۱) فتح القدیر: ۳۹۰/۶، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، ط: زکریا دیوبند .

(۲) الهدایة : ۵۵/۳، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، ط: أشرفي .

دواؤں میں استعمال کرنا شرعاً درست نہیں ہے؛ ہاں اگر کوئی شخص بہت سخت پریشانی اور حالتِ اضطرار میں ہو اور مارکیٹ میں ''اسٹیم سیل'' سے تیار شدہ دواؤں کے علاوہ کوئی دوا بہ طور متبادل موجود نہ ہو تو اس صورت میں ایسی دواؤں سے علاج کرنے کی گنجائش ہے۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۳/ ۷/ ۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفر لہٗ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## جینیٹک انجینئر نگ کی مدد سے پیدا شدہ جانوروں کا حکم

**سوال:** ﴿۱۰۵﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

جی ایم او ایسے نباتات اور جانور جو بایوٹیکنالوجی کے ذریعہ پیدا کیے جاتے ہیں، جس کو حیاتیاتی انجینئر نگ ٹیکنالوجی بھی کہا جاتا ہے، یہ تجرباتی ٹیکنالوجی مختلف پر جاتیوں سے ڈی این اے ضم کرتی ہے اور نباتات، جانور، بیکٹیریا اور وائرل تولیدی کا ایک ایسا غیر مستحکم مجموعہ پیدا کرتے ہیں جو قدرتی اور روایتی طور پر نہیں ہو سکتا تھا۔

Genetically modified organisms ایک نامیاتی ہے، جس کے خلقی مادے کو حیاتیاتی انجینئر نگ ٹیکنالوجی کا استعمال کر کے تبدیل کر دیا جاتا ہے، نامیاتی جسم جن کی جینیاتی طور پر نظر ثانی کی گئی ہے، میں مائیکرو حیاتیات شامل ہیں، جیسے بیکٹیریا، خمیر، کیڑے، پودے، مچھلی وغیرہ۔

جی ایم او خلقی طور پر نظر ثانی شدہ کھانوں کا ذریعہ ہیں، اور اس کا سائنٹیفک ریسرچ میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے، اور اس سے کھانے کے علاوہ اشیاء بھی پیدا کی جاتی ہیں۔

سوال:

آج کل پیداوار کے بڑھانے اور اشیاء کی کمی کے باعث ایک شئ کا تولیدی مادہ نکالا جاتا ہے،

(۱) مستفاد از: فتاویٰ رحیمیہ: ۵/ ۴۶۳-۴۶۴، کتاب الحظر و الإباحة، بہ عنوان: ''پلاسٹک سرجری کرانا، اور نومولود بچہ کی نال سے بنے ہوئے مرہم کو استعمال کرنا''۔ ط: مکتبہ الاحسان دیوبند۔

جیسا کہ آج کل اسی عمل کے ذریعہ چوہے کو بھی بنایا جاتا ہے، اور اس ٹیکنالوجی کے ذریعہ آج کل چکن کو ایسا بڑھا دیا جاتا ہے، کہ وہ فطری چکن سے دوگنا ترقی کرتے ہیں، تو کیا اس طرح کے اشیاء کا کھانا جائز ہوگا؟　　(۴۳۸/ د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

سوال بہت مجمل ہے، اور حیاتیاتی انجینئرنگ ایک انتہائی نازک پُر اسرار اور جدید موضوع ہے، اس سے متعلق لٹریچر خصوصًا اردو میں بہت کم دستیاب ہے، بہرحال استفتاء اور اس سے متعلق عربی اور اردو کی کچھ تحریروں کے مطالعے سے جو خلاصہ سامنے آیا وہ یہ ہے کہ مختلف الانواع حیوانات کے ''DNA'' (اجزائے جسم سے حاصل کردہ ایک خاص مادّہ) کو ضم کر کے کسی ''مادّہ حیوان'' کے اندر موجود قدرتی رحم موضع تخلیق میں آلات کے ذریعے ڈال دیا جاتا ہے، بعد میں فطری طریقے پر انڈہ بچہ پیدا ہوتا ہے، اس پیدا شدہ کے اندر بہت سی وہ خصوصیات آجاتی ہیں، جو درحقیقت ان جانوروں کی ہوتی ہیں، جن کا ''DNA'' لیا گیا، یا اختلاط کی وجہ سے کوئی نئی ''پرجاتی'' جنم لیتی ہے۔(۱)

قطعِ نظر اس غیر فطری طریقہ کی خرابیوں اور خوبیوں سے، اس عمل سے پیدا شدہ پرجاتی جانور کا حکم شرعی یہ ہے کہ: اس طریقۂ تولید میں بھی ''مادہ'' کی بہرحال ضرورت پڑتی ہے، اور فقہائے کرام نے تصریح کی ہے کہ جانوروں کی حلت وحرمت میں ''مادہ'' کو دیکھا جائے گا، اگر ''مادہ'' حلال جانوروں میں سے ہے، تو اس سے پیدا شدہ بچہ بھی حلال ہوگا۔(۲) فتاویٰ عالم گیری میں ہے: **فإن کان متولّدًا من الوحشي و الأنسي فالعبرة للأمّ ؛ فإن کانت أهلیة تجوز وإلاّ فلا ...... وقیل: إذا نزاظبي علي شاه أهلیة، فإن ولدت شاة تجوز التّضحیّة ، وإن ولدت ظبیًا لا تجوز**(۳)

(۱) الموسوعة العلمیة ، مجلّات المجمع الفقهي الإسلامي ، بجدّة .

(۲) لأنّ المعتبر في الحلّ والحرمة الأمّ فیما تولد من مأکول وغیر مأکول .

(الدّرّ مع الرّدّ: ۹/۴۴۲، کتاب الذّبائح )

(۳) الفتاوی الهندیة: ۵/ ۲۹۷، کتاب الأضحیّة ، الباب الخامس .

اور جب کوئی جانور حلال ہوتا ہے تو بہ جمیع انواعہ حلال ہوتا ہے، اگر چہ اوصاف میں کسی قدر اختلاف بھی پایا جاتا ہو؛ لہٰذا حیاتیاتی انجینئرنگ سے پیدا شدہ جانور: چوپائے، پرندے، مچھلیاں وغیرہ کی مادہ اگر حلال ہے تو اس کا کھانا حلال ہوگا، اگر چہ اوصاف مثلاً نشوونما، ذائقہ، رنگت میں کسی قدر اختلاف بھی ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/۶/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## مرنے کے بعد آنکھوں کی وصیت کرنا

**سوال:** ﴿۱۰۶﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

(۱) انسان کا اپنی کسی چیز کی، کسی ضرورت مند کے لیے وصیت کرنا درست ہے یا نہیں؟ مثلاً: یہ کہنا کہ میری آنکھیں فلاں کو لگا دینا؟ جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

(۲۰/د۱۴۳۶ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق:**

(۱) ''وصیت'' ایک تبرّع ہے، اور انسان اس چیز کا تبرّع کر سکتا ہے جس کا وہ مالک ہے،(۱) جسم اور اس کے اعضاء مثلاً: آنکھ، کان، دل، گردہ وغیرہ کا انسان مالک نہیں ہے؛ اسی لیے حدیث میں خودکشی پر سخت وعید آئی ہے (۲) اور حافظ ابن حجرؒ نے ممانعت کی علت یہی ذکر فرمائی کہ آدمی اپنی

(۱) ومن شرائط الوصيّة أن يكون الرّجل مالكًا وكون الشّيء قابلاً للتّمليك.

(البحر الرّائق: ۸/۴۰۵)

(۲) عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله – صلّى الله عليه وسلّم – مَنْ قتلَ نفسَهُ بِحَديدةٍ، فَحَدِيْدَتُهُ فِيْ يدهِ يتوجّأ بِها فِي بَطْنِهِ فِيْ نارِ جَهنّمَ خَالدًا مُخلَّدًا فيهَا أبدًا، ==

جان کا مالک نہیں ہے(۱) نیز اس طرح کی وصیت کی تنفیذ کی صورت میں آنکھ وغیرہ نکالتے وقت ''میت'' کا ''مثلہ'' بنانا یعنی اعضائے جسم کی قطع وبرید لازم آئے گی، جس سے حدیث میں سختی سے منع کیا گیا ہے،(۲) اُن کے علاوہ اور بہت سی خرابیاں ہیں؛ اس لیے انسان کے لیے اپنے جسم یا کسی عضو کی وصیت کرنا درست نہیں ہے، اور نہ ہی ورثاء کے لیے ''میت'' کا کوئی عضو کسی کو دینا درست ہے۔(۳)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۸/۲/ ۱۴۳۵ھ مطابق یکم جنوری ۲۰۱۴ء

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

# اعضاء کا عطیہ اور ان کی پیوند کاری کا حکم

**سوال:** ﴿۱۰۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

== ومَنْ تردّى مِن جَبَلٍ فَقَتَلَ نفسَهٗ ، فهو يَتردّى فِي نارِ جهنّمَ خَالدًا مُخلَّدًا فِيهَا أبدًا .

(الصّحيح لمسلم:۱/۷۲، رقم:۱۷۵، باب غلظ تحريم قتل الإنسان نفسه)

(۱) حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں خودکشی کی ممانعت پر حدیث ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ويؤخذ منه أن جناية الإنسان على نفسه كجنايته على غيره في الإثم ؛ لأنّ نفسه ليست ملكًا له مطلقًا ؛ بل هي للّٰه تعالى ،فلا يتصرّف إلاّ بما أذن له فيه. (فتح الباري: ۱۱/۵۳۹، باب من حلف بملّة سوى الإسلام ، ط: دارالمعرفة ، بيروت)

(۲) كان رسول اللّٰه – صلّى اللّٰه عليه وسلّم – يحثنا على الصّدقة ، وينهانا عن المُثلة .

(أبوداؤد ، رقم:۲۶۶۷، باب النّهي عن المثلة)

(۳)......(الف): وإن قال له آخر: اقطع يدي وُكلها لا يحلّ ؛ لأنّ لحم الإنسان لا يباح في الإضطرار لكرامته . (الشّامي:۹/۴۸۸)

(ب): ولأنّه يحرم الانتفاع بشعر الآدمي وسائر أجزائه لكرامته ؛ بل يدفن شعره وظفره وسائر أجزائه . (شرح النّووي على مسلم: ۱۴/۱۰۳، باب تحريم فعل الواصلة والمستوصلة والواشمة ، ط: دار إحياء التّراث العربي ، بيروت)

وادیٔ کشمیر کی ''یونیورسٹی'' میں اعضاء کی پیوند کاری کے سلسلے میں ایک سیمینار منعقد کیا گیا، سیمینار کے بعد اخبارات کے ذریعے اعضاء کی پیوند کاری اور عطیہ کرنے کے حوالے سے جواز کی بات کہی گئی۔

آپ سے گذارش ہے کہ ان دونوں مسئلوں: اعضاء کی پیوند کاری اور اُن کے عطیہ کے سلسلے میں آپ کی جو تحقیقات ہوں اور اکابرین کی رائے ہوا سے تحریر فرما کر عنداللہ ماجور ہوں؛ تاکہ امت مسلمہ کو اس سلسلے میں صحیح مسئلہ بیان کیا جا سکے۔　　(۸۲۶/ د ۱۴۳۵ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰه التّوفیق :**

انسان اپنے اعضاء و جوارح کا نہ تو اپنی زندگی میں مالک ہوتا ہے اور نہ مرنے کے بعد؛ لہٰذا کسی شخص کے لیے اپنا کوئی عضو دوسرے کو دینا جائز نہیں ہے، خواہ قیمت لے کر دے یا بلا قیمت، **فَفِي الخَانِيَةِ: مُضْطَرٌّ لَمْ يَجِدْ مَيْتَةً وخافَ الْهلاكَ ، فَقالَ لهُ رجلٌ: اقْطَعْ يَدِي ، وَكُلْهَا، أو قَالَ: اقْطَعْ مِنّيْ قِطْعَةً فكُلْها، لاَ يَسَعُهُ أنْ يفعلَ ذٰلكَ ، ولاَ يَصِحُّ أمرُهُ به ، كمَا لاَ يَسَعُ لِلْمُضْطَرِّ أن يَقْطَعَ قِطْعَةً مِنْ لحمِ نَفْسِهٖ فَيأْكُلَ(۱)**

اسی طرح مرنے کے بعد اپنے اعضاء کسی دوسرے شخص کو دینے کی وصیت کرنا بھی شرعًا درست نہیں ہے، اور نہ یہ وصیت قابلِ نفاذ ہے؛ کیوں کہ فقہائے کرام کی صراحت کے مطابق وصیت کے صحیح ہونے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ شئ موصٰی بہٖ (جس چیز کے دینے کی وصیت کی جا رہی ہے) شرعًا مال ہو اور قابلِ تملیک ہو(۲) اور ظاہر ہے کہ اعضائے انسانی شریعت کی نظر میں مال ہی نہیں ہیں۔ **ففي البحر: وأمّا شرائطها (الوصيّة) فكون الموصي أهلاً للتّبرّع...... وكون الموصٰى بهٖ شيئًا قابلاً للتّمليك من الغير بعقد من العقود حال حياة الموصي(۳)**

---

**(۱) خانية بر هندية: ۳/۴۰۴۔**

**(۲) وشرطها كون الموصي أهلاً للتّمليك ، والموصٰى له أهلا للتّملّك والموصي بهٖ بعد الموصي ما لا قابلاً للتّمليك . (الفتاوىٰ الهندية:۶/۹۰)**

**(۳) البحر الرّائق: ۹/۲۱۲۔**

اب جہاں تک مسئلہ ہے اعضاء کی پیوند کاری کا، تو اگر جمادات وحیوانات کے اجزاء سے یہ پیوند کاری کی جائے تو بعض صورتوں میں بلا شبہ اس کی گنجائش ہے(۱) اسی طرح اگر آدمی کے اپنے ہی جسم کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں کھال یا رگ وغیرہ کاٹ کر لگائی جائے، تو بہ وقت ضرورت شدیدہ شرعًا اس کی بھی گنجائش ہے؛(۲) لیکن پیوند کاری کے لیے کسی دوسرے زندہ یا مردہ شخص کا کوئی عضو استعمال کرنا کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے۔ یہ ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ (۳) کے خلاف ہے۔

**ففي شرح السّير الكبير: فكما يحرم التّداوي بشيءٍ من الآدمي الحيّ إكرامًا له، فكذلك لا يجوز التّداوي بعظم الميّت، قال صلّى الله عليه وسلّم: كسر عظم الميّت ككسر عظم الحيّ (۴)**

حاصل کلام یہ ہے کہ پیوند کاری کے لیے کسی دوسرے شخص کو کوئی عضو دینا، یا مرنے کے بعد دینے کی وصیت کرنا، اسی طرح اُس دوسرے شخص کا یہ عضو استعمال کرنا، یہ سب چیزیں شرعًا ناجائز و حرام ہیں، قرآن وحدیث، فقہائے کرام کی تصریحات نیز اکابرین کی تحقیقات سے یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ تفصیل کے لیے ''جواہر الفقہ''، ''فتاویٰ محمودیہ''، ''منتخبات نظام الفتاویٰ'' وغیرہ کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۳/۷/ ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۳/۵/۲۰۱۴ء

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

**(۱) إذا سَقَطَتْ ثَنِيَّةُ رَجُلٍ فإنّ أبا حنيفة يكره أن يُعيدَها، ويَشُدَّهَا ............ ويقول هي كَسِنِّ مَيْتَةٍ؛ ولكن يَأْخُذُ سِنَّ شَاةٍ ذَكِيَّةٍ يَشُدُّ مَكَانَهَا.**

**(ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۹/۵۲۱، كتاب الحظر والإباحة)**

**(۲)............ وإعادَةُ جُزْءٍ مُنْفَصِلٍ إلٰى مَكَانِهِ لِيَلْتَئِمَ جائزٌ، كمَا إذَا قُطِعَ شيءٌ مِنْ عُضْوِهِ فَأعَادَه إلٰى مَكَانِهِ ........ ولَا إهانَةَ في استعمالِ جُزْءِ نَفسهِ في الإعادةِ إلٰى مَكانِهِ.**

**(بدائع الصّنائع: ۴/۳۱۶، في آخر كتاب الاستحسان)**

(۳) سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۷۰۔

**(۴) شرح السّير الكبير: ۱/۱۲۸، ط: الشّركة الشّرقية للإعلانات.**

# متفرقات

## ڈاڑھی کی مقدار سے متعلق مفصل فتویٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرات مفتیانِ کرام دارالعلوم دیوبند

سلام مسنون!

**سوال:** ﴿۱۰۸﴾ درج ذیل مسئلہ سے متعلق حکم شرعی بتلا کر ممنون ومشکور فرمائیں:

ڈاڑھی رکھنا کیسا ہے؟ سنت ہے یا واجب؟ اس کی مقدار کتنی ہے؟ اس بارے میں حنفیہ، نیز دیگر ائمہ کیا کہتے ہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حدیث میں مطلقاً ڈاڑھی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے؛ لہٰذا یکمشت سے کم بھی رکھی جا سکتی ہے، کسی مقدار کے ساتھ مقید کرنا صحیح نہیں، یہ کہاں تک درست ہے؟ ایک مشت سے زائد حصے کو کٹوا دینا سنت ہے یا بالکل چھوڑ دینا چاہیے کہ جتنی بڑھ سکے بڑھ جائے؟ ازراہِ کرم حدیثی وفقہی دلائل کی روشنی میں مدلل ومفصل جواب سے نوازیں، کرم ہوگا۔

مستفتی: حبیب اللہ، انڈس اکیڈمی، جاگیروڈ

(۶۴۶/د۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللہ التوفیق:**

ڈاڑھی رکھنا واجب ہے، اس کی کم از کم مقدار یکمشت ہے، یہ حکم صرف احناف کے یہاں نہیں؛

بلکہ شوافع، مالکیہ، اور حنابلہ سب کے نزدیک کم از کم ایک مشت ڈاڑھی رکھنا واجب ہے، ڈاڑھی بالکل نہ رکھنا یا یکمشت سے پہلے کٹوانا ناجائز اور حرام ہے، اگر یکمشت سے زائد ہوجائے تو زائد حصے کو کٹوا دینا جائز؛ بلکہ اولیٰ اور بہتر ہے؛ البتہ اگر کسی نے ابتداءً ڈاڑھی بڑھنے کے زمانے میں ایک مشت سے زائد کو کسی وجہ سے نہیں کٹوایا، یہاں تک کہ لمبی ہوگئی تو اب اس کو نہیں کٹوانا چاہیے؛ البتہ اگر اتنی لمبی ہوجائے کہ لوگ مذاق بنائیں، یا غیر مقلدین (جنہوں نے ڈاڑھی بہت طویل رکھنے اور بالکل نہ چھوڑنے کو اپنا شعار بنالیا ہے) کے ساتھ مشابہت ہو تو پھر تھوڑا تھوڑا کر کے چھٹوا دینا چاہیے، ذیل کی سطروں میں اس سلسلے میں کچھ تفصیل لکھی جاتی ہے:

استفتاء میں بنیادی طور پر درج ذیل تین باتیں دریافت کی گئی ہیں:

(۱) فی نفسہٖ ڈاڑھی رکھنے کا حکم کیا ہے؟

(۲) کتنی مقدار ڈاڑھی رکھنی چاہیے؟ کیا یکمشت سے کم بھی رکھی جاسکتی ہے؟

(۳) ڈاڑھی بالکل نہ تراشنا جسے ''اسبال'' کہتے ہیں، کیسا ہے؟

جہاں تک ڈاڑھی رکھنے کے نفس حکم کی بات ہے تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ ڈاڑھی سے متعلق بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً:

**(۱) عن ابن عمر – رضي الله عنهما – قال قال رسول الله – صلّى الله عليه وسلّم – أنهكوا الشّوارب، و أعفوا اللّحى (۱)**

**(۲) عن أبي هريرةؓ مرفوعًا جزوا الشّوارب، وأرخوا اللّحى، خالفوا المجوس (۲)**

**(۳) عن ابن عمر – رضي الله عنهما – أنّ النّبيّ – صلّى الله عليه وسلّم – أمرنا باحفاء الشّوارب وإعفاء اللّحى، هذا حديث حسن صحيح (۳)**

ان احادیث میں نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو ڈاڑھی رکھنے کا صراحۃً حکم دیا، اور متفقہ

(۱) البخاري، رقم: ۵۸۹۳، باب إعفاء اللّحى.

(۲) مسلم، باب خصال الفطرة، رقم: ۲٦۰.

(۳) التّرمذي، رقم: ۲۷٦٤، باب ما جاء في إعفاء اللّحى.

اصول ہے کہ ''امر'' وجوب کے لیے ہوتا ہے، نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈاڑھی مسلمانوں کا قومی شعار ہے، تاکہ مسلمان ـــــ جو اللہ کے تابعدار ہیں ـــــ اس ڈاڑھی کی وجہ سے اللہ کے سرکشوں اور دشمنوں سے متمیز نیز باغیانِ بارگاہ الوہیت سے ممتاز ہو جائیں اور یہ بدیہی بات ہے کہ قومی شعار کا تحفظ اور لحاظ ضروری ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ حضور ﷺ اور صحابۂ کرام نے بالمواظبت ڈاڑھی رکھی، پورے ذخیرۂ احادیث میں ایک روایت بھی نہیں ملتی کہ حضور ﷺ نے یا کسی صحابی نے ڈاڑھی منڈوائی ہو یا یکمشت سے پہلے کٹوائی ہو، حضور ﷺ اور صحابۂ کرام کا بالمواظبت کوئی کام کرنا، کبھی بھی ترک نہ کرنا ایک مستقل دلیل وجوب ہے، فقہائے کرام نے اس کی صراحت کی ہے۔(۱)

الغرض ڈاڑھی بڑھانے کے لیے حضور ﷺ کا صراحۃً حکم فرمانے، اسے ''قومی شعار'' قرار دینے نیز حضور اور صحابۂ کرام کے دائمی مواظبت کی وجہ سے ڈاڑھی بڑھانا ہر مکلّف امتی پر واجب ہے، جو عملاً فرض کے درجے میں ہے۔(۲) اور ڈاڑھی منڈوانا ناجائز اور حرام ہے، بہ شمول حنفیہ، تمام مذاہب فقہیہ کے نزدیک یہی حکم ہے، ان کی کتابوں میں اس سے متعلق تصریحات موجود ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

(۱) حنفیہ کی مشہور کتاب ''الدرّ المحتار '' میں ہے: ............ **ولذا يحرم على الرّجل قطع لحيته.**(۳)

(۲) حضرت امام شافعیؒ نے بھی ''**كتاب الأم** '' میں اس کی تصریح کی ہے، چنانچہ شوافع کی مشہور کتاب ''**تحفة المحتاج في شرح المنهاج**'' میں ہے:...... **انّ الشّافعي – رضي اللّٰه عنه –**

---

(۱) **فما كان فعلهٔ أولٰى من تركه مع منع التّرك ، إن ثبت بدليل قطعيّ ففرض ، أو بظنّيّ فواجب . (ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۱/۲۱۸، كتاب الطّهارة ، سنن الغسل)**

(۲) ...... **الواجب فرض في حقّ العمل دون الاعتقاد .**

**(تبيين الحقائق شرح كنز الدّقائق: ۱/۱۶۹، باب الوتر)**

(۳) ۹/۵۸۳۔

نصّ في الأمّ على التّحريم ......... وقال الأذرعيّ : الصّواب تحريم حلقها جملة لغير علّة بها كما يفعله القلندريّة انتهٰى.(۱)

(۳) فقہ مالکی کی معروف کتاب مختصر الخلیل کی شرح میں ہے: ويحرم على الرّجل حلق اللّحية.(۲)

(۴) فقہ حنبلی کی کتاب "المبدع في شرح المقنع" میں ہے: يحرم حلقها ذكره الشّيخ تقي الدّين إلخ (۳)

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوا کہ چاروں ائمۂ فقہ کے نزدیک ڈاڑھی رکھنا واجب ہے، اور چاروں اماموں کا کسی حکم پر اتفاق کرنا اجماع کے درجہ میں ہے(۴) اس لیے اس کے خلاف کہنا یا کرنا قطعًا جائز نہیں۔

نیز یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ڈاڑھی کی کم از کم مقدار ایک مشت ہے، یہ بھی سب کے درمیان متفقہ مسئلہ ہے، یکمشت سے پہلے ڈاڑھی کٹوانا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے، علامہ ابن الہمامؒ نے فتح القدیر میں لکھا: ويحرم على الرّجل قطع لحيته ، وأمّا الأخذ منها وهي ما دون القبضة كما يفعله بعض المغاربة فلم يبحه أحد .(۵) اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے فرمایا: أمّا تقصير اللّحية بحيث تصير قصيرة من القبضة ، فغير جائز في

(۱) ۳۷٦/۹، ط: المكتبة التّجاريّة ، مصر .

(۲) منح الجليل شرح مختصر خليل : ۸۲/۱، فرائض الوضوء .

(۳) ۸۵/۱، فضل السّواك ، ط: بيروت .

(۴) قال العلّامة الطّحطاويّ : ...... فعليكم معاشر المؤمنين باتّباع الفرقة النّاجية المسمّاة بأهل السّنّة والجماعة ........... وهٰذه الطّائفة النّاجية قد اجتمعت اليوم في مذاهب أربعة ، وهم الحنفيون والمالكيون والشّافعيون والحنبليون رحمهم اللّٰه.

(حاشية الطّحطاوي على الدّرّ المختار: ٤/ ١٥٣، كتاب الذّبائح)

(۵) ۳٤۸/۲، باب ما يوجب القضاء والكفّارة ،ط: دار الفكر .

المذاهب الأربعة.(۱)

ایک مشت ڈاڑھی کی مقدار حدیث سے ثابت ہے، اور یہ کہنا کہ حدیث میں مطلقاً ڈاڑھی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے؛ لہٰذا جتنی بھی ڈاڑھی رکھی جائے -- خواہ یکمشت سے کم ہو یا زیادہ --- کافی ہے، قطعاً صحیح نہیں ہے؛ اس لیے کہ ڈاڑھی رکھنے سے متعلق بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں، ان میں عام طور پر پانچ الفاظ استعمال کیے گئے:

(۱) أعفوا. (۲) أحفوا. (۳) وفروا (۴) أرخوا . (۵) أرجئوا. اور اعفاء، احفاء، توفیر، ارخاء، اور إرجاء سب کے معنی ایک ہیں، یعنی ڈاڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دینا، چنانچہ علامہ نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا: ومعناها كلّها تركها على حالها(۲) اور علامہ حافظ ابن حجرؒ نے ''وفروا'' کا معنی اتركوها وافرة لکھا، یعنی ڈاڑھی چھوڑ و اس طور پر کہ وہ وافر ہو، ''أوفوا'' کے معنی ''اتركوها وافية''، اور أرخوا اور أرجوا کا معنی أطيلوها بیان کیا(۳)

احادیث نبویہ میں وارد یہ تمام الفاظ نیز محدثین اور شراح حدیث کی تشریحات سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ منشأ نبوی محض ڈاڑھی رکھنا نہیں؛ بلکہ ڈاڑھی بڑھانا اور دراز کرنا بھی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ڈاڑھی کتنی بڑھانی ہے، اس کے لیے صاحبِ شریعت کا عمل ہمارے سامنے ہے، اس سے مقدار کی تعیین کی جائے گی؛ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جن افعال کا تعلق...... امور عادیہ سے نہیں ہے (جیسا کہ ڈاڑھی؛ اس لیے کہ ڈاڑھی کو کسی بھی فقیہ و محدث نے افعالِ عادیہ میں سے شمار نہیں کیا) وہ افعال اوامر قرآن کی تشریح کے ساتھ ساتھ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر کی بھی تبیین و تشریح کرتے ہیں، اور اس قسم کے افعال کا حکم وہی ہوتا ہے، جو ان اوامر کا جن کی تبیین، ان افعال سے ہوئی، یعنی ان افعال کی حیثیت اوامر کے بیان و تشریح کی ہوتی ہے، اگر مُبَیَّنْ (وہ امر جس کی توضیح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ہوئی، واجب ہے تو بیان (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بھی

(۱) العرف الشّذي: ۱۶۲/٤، باب ما جاء في تقليم الأظفار، ط: دار التّراث العربي .
(۲) شرح النّووي، على صحيح مسلم:۱۵۱/۳، باب الاستطابة، ط: بيروت .
(۳) فتح الباري: ۳۵۰/۱۰، ط: دار المعرفة، بيروت .

واجب الاتباع ہوگا، اوراس بات کا سب کواعتراف ہے کہ آپ ﷺ کی ریشِ مبارک یکمشت سے کم کبھی بھی نہ تھی، سیر وشمائل کی کتابوں میں آپ کو"کثیر اللّحیة" " عظیم اللّحیة "(یعنی بڑی ڈاڑھی والے )اور"کث اللّحیة"(یعنی گھنی ڈاڑھی والے )جیسے الفاظ سے متصف کیا گیا۔(۱)

پس احادیثِ نبویہ نیز حضور ﷺ کے عملِ مبارک سے اتنی بات بالیقین ثابت ہوگئی کہ کم ازکم اتنی ڈاڑھی رکھنا امتِ محمدیہ کے ہرفرد پر لازم ہے، جس پر"کثیر"(زیادہ)"عظیم"(بڑی) "کث"(گھنی) کا اطلاق ہوسکے، اورظاہر سی بات ہے کہ یکمشت سے کم ڈاڑھی رکھنے والے کوکوئی بھی"عظیم اللّحیة"یعنی بڑی ڈاڑھی والا، یا"کث اللّحیة "یعنی گھنی ڈاڑھی والانہیں کہتا، لہٰذا کم ازکم یکمشت ڈاڑھی رکھنا واجب ہوا۔

صحابۂ کرام کے عمل سے اس بات کی مزید تائید ہوتی ہے، ابوداؤد (رقم:۴۲۰۱) میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: كنّا نعفي السّبال إلاّ في حجّ أو عمرة (۲) یعنی ہم لوگ ڈاڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں کو حج اورعمرہ کے موقع پر ہی کٹواتے تھے، اور بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل مروی ہے: وكان ابن عمر إذا حجّ أو اعتمر قبض على لحيته فما فضل

(۱)......(الف): عن الحسن بن عليّ قال سألت خالي هند بن أبي هالة وكان وصّافًا عن حلية النّبيّ – صلّى اللّه عليه وسلّم – وأنا أشتهي أن يصف لي منها شيئًا أتعلّق به، فقال: كان رسول اللّه صلّى اللّه عليه وسلّم – فخما مفخما ........... يحسبه من لم يتأمّلهُ أشم، كث اللّحية، سهل الخدين، إلى آخر الحديث. (شمائل ترمذي: ص: ٦٢١، باب ما جاء في خلق رسول اللّه – صلّى اللّه عليه وسلّم – ط: شيخ الإسلام، ديوبند)

(ب): عن نافع بن جبير قال: وصف لنا علي النّبيّ – صلّى اللّه عليه وسلّم – فقال: كان ضخم الهامة عظيم اللّحية. (دلائل النّبوّة للبيهقي: ٢١٦/١، باب رأس رسول اللّه – صلّى اللّه عليه وسلّم – وصفة لحيته، ط: دارالكتب العلميّة، بيروت)

(۲) قال الحافظ بن حجرؒ في فتح الباري: فإنّ السّبال بكسر المهملة و تخفيف الموحّدة – جمع سَبَلَةٍ – بفتحتين – وهي ما طال من شعر اللّحية. فأشار جابر إلى أنّهم يقصرون منها في النّسك. (٣٥/١٠، باب في تقليم الأظفار، ط: دارالمعرفة، بيروت)

أخـذه ، یعنی حضرت عبداللہ بن عمر جب حج وعمرہ کی ادائیگی سے فارغ ہوتے اپنی ڈاڑھی کے یکمشت سے زائد حصے کو کٹوا دیتے تھے(۱) نیز حافظ ابن حجرؒ نے طبریؒ کے حوالے سے حضرت ابو ہریرہ، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی یکمشت سے زائد حصے کوکٹوانے کی بات نقل کی(۲)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام بھی آپ ﷺ کے ارشاد: أعفوا اللّحی وغیرہ الفاظ سے یہی مفہوم سمجھتے تھے کہ کم از کم یکمشت ڈاڑھی بڑھانا ضروری ہے؛اسی لیے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یکمشت سے زائد حصے ہی کو کٹواتے تھے،اس سے پہلے کٹوانا کسی بھی روایت میں ثابت نہیں۔

نیز ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ منشأ نبوی ''اسبال'' (یعنی بالکل ڈاڑھی نہ کٹوانا؛اور جتنی چاہے بڑھنے دینا) نہیں ہے، ورنہ صحابۂ کرام خصوصًا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما- جو اتباع رسول ﷺ کے بہت زیادہ شیدائی تھے- اپنی ڈاڑھی بالکل نہ کٹواتے، نیز حج یا عمرے کے موقع پر صحابۂ کرام کا ڈاڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں کو کٹوانے کا معمول نہ ہوتا،ترمذی کی ایک روایت میں خود نبی اکرم ﷺ سے بھی ڈاڑھی کے طول وعرض سے بڑھے ہوئے بالوں کو کٹوا دینا مروی ہے، چنانچہ ترمذی میں ہے: کان رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم – یأخذ من لحیتہ من عرضھا وطولھا (۳)اس روایت میں کسی قدر ضعف ضرور ہے؛لیکن صحابۂ کرام کے تعامل سے اس کا ضعف رفع ہوجاتا ہے، حضور ﷺ اور صحابۂ کرام کے تعامل کی بنیاد پر تقریبًا تمام فقہائے کرام اور محدثین کا مسلک یہی ہے، کہ ڈاڑھی کو بالکل اپنے حال پر چھوڑ دینا کہ جتنی بڑھ سکے بڑھے پسندیدہ نہیں ہے(۴)اس سلسلے میں امام نووی شافعیؒ کا نام آتا ہے کہ وہ بالکل اسبال کے قائل ہیں؛لیکن علامہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں امام نووی کا مسلک ذکر کرنے کے بعد لکھا کہ ان کی مراد یہ ہے کہ حج یا عمرہ کے علاوہ کسی اور وقت ڈاڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں کو تراشنا جائز نہیں،یعنی حج یا عمرہ کے موقع پر ان

(۱) بخاری:رقم: ۵۸۹۲، باب تقلیم الأظفار .

(۲) فتح الباري: ۱۰/ ۳۵۰، ط: دار المعرفة بیروت .

(۳) باب ما جاء في الأخذ من اللّحیة ، رقم: ۲۷٦۲ .

(۴) مستفاد از فتح الباري: ۱۰/ ۳۵۰، ط: دار المعرفة .

کے نزدیک بھی جائز ہے۔ قال النّووي: والمختار تركها على حالها وأن لا يتعرّض لها بتقصير ولا غيره وكأن مراده بذلك في غير النّسك ؛ لأنّ الشّافعيّ نصّ على استحبابه فيه.(۱)

خلاصہ یہ ہے کہ تمام علماء وفقہاء کے نزدیک ڈاڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں کو طول وعرض سے لینا کسی نہ کسی صورت میں جائز ہے، ہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ جواز ڈاڑھی کے کس حد تک بڑھنے کے بعد ہے، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جب ڈاڑھی طویل فاحش (بہت زیادہ لمبی) ہو جائے تب کٹوانا جائز ہے، بعض کہتے ہیں کہ صرف حج یا عمرہ کے موقع پر طول وعرض سے بڑھے ہوئے بالوں کو تراشنا جائز ہے۔(۲)

ائمۂ احناف اور حنابلہ کے نزدیک جب ڈاڑھی یکمشت سے زیادہ ہو جائے تو کٹوانا جائز ہے، الموسوعة الفقهية میں ہے: وذهب آخرون منهم الحنفيّة والحنابلة إلى أنّه إذا زاد طول اللّحية عن القبضة يجوز أخذ الزّائد (۳)

اور کتاب الآثار میں امام محمدؒ نے ذکر کیا ہے:

قال محمّد: أخبرنا أبو حنيفة عن الهيثم عن ابن عمر أنّه كان يقبض على لحيته، ثمّ يقصّ ما تحت القبضة قال محمّدؒ : وبه نأخذ ، وهو قول أبي حنيفة (۴)

بل کہ حنفیہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر کے معمول (کہ وہ ایک مشت سے زائد حصے کو حج یا عمرے کے موقع پر کٹوا دیا کرتے تھے) کی وجہ سے ایک مشت سے زائد حصے کو کٹوانے کو سنت و مستحب لکھا ہے؛ چنانچہ عالم گیری میں ہے: لا بأس إذا طالت لحيته أن يأخذ من أطرافها ولا بأس

---

(۱) فتح الباري: ۳۵۰/۱۰، ط: دار المعرفة ، بيروت .

(۲) ملخّص فتح الباري: ۳۵۰/۱۰، باب تقليم الأظفار .

(۳) الموسوعة الفقهية: ۳۵-۲۲۵، ط: الكويت .

(۴) ۸۵۷/۲، رقم: ۹۱۰، ط: دار السّلام للطّباعة والنّشر .

أن يقبض على لحيته فإن زاد على قبضته منها شيء جزّه............و القصّ سنّة فيها (۱)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ نے اپنی معروف کتاب ''ڈاڑھی کا وجوب'' میں بھی مستحب لکھا۔(ص:۱۳)

البتہ عالم گیری میں یہ تصریح بھی ہے کہ اگر ابتداءً ڈاڑھی بڑھنے کے زمانے میں یکمشت دراز ہونے پر زائد حصے کو نہیں کٹوایا یہاں تک کہ زیادہ لمبی ہوگئی، تو اب نہ کٹوانا ہی بہتر ہے۔ وإن كان ما زاد طويلة تركه كذا في الملتقط (۲)

اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جواہر الفقہ میں لکھا: اگر کسی شخص نے ابتداءً ڈاڑھی بڑھنے کے زمانہ میں ایک مشت سے زائد کو کسی وجہ سے قطع نہ کیا، یہاں تک کہ زیادہ طویل ہوگئی، تو اب اس کو قطع نہ کرانا چاہیے، جیسا کہ عالم گیری میں اس کی تصریح ہے، جن بزرگوں کی ڈاڑھی ایک مشت سے زائد رہی ہے یا اب ہے وہ اسی صورت میں محمول ہے؛ (۳) البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ آج کل ایک گمراہ فرقہ غیر مقلدین نے ڈاڑھی بہت زیادہ رکھنے کو اپنا شعار بنا لیا ہے؛ لہٰذا ان کی مشابہت سے بچنا بھی ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک مشت سے پہلے ڈاڑھی کٹوانا یا ڈاڑھی بالکل نہ رکھنا حرام اور ناجائز ہے، تمام فقہاء اور محدثین کا اس پر اجماع ہے، اگر ایک مشت سے اتنی زائد ہوجائے کہ بھدی معلوم ہونے لگے تو اکثر فقہاء کے نزدیک بڑھے ہوئے بالوں کو کٹوا دینا چاہیے، اور حنابلہ کے نزدیک ایک مشت سے زائد حصے کو کٹوا دینا مباح ہے، اور احناف کے نزدیک مستحب و پسندیدہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۳/۵/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

(۱) الفتاوى الهندية: ۳۵۸/۵ .

(۲) الفتاوى الهندية: ۳۵۸/۵، دارالفكر .

(۳) جواهر الفقه: ۱٦٤/۷–۱٦٥، ط: مكتبه، زكريا ديوبند .

# ذبح شرعی کے ارکان، واجبات اور آداب

محترم حضرات مفتیانِ کرام　زیدت معالیکم

السّلام علیکم ورحمة الله وبرکاتهٗ

**سوال:** ﴿۱۰۹﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

درج ذیل امور سے متعلق شرعی رہنمائی فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں، کرم ہوگا۔

(۱) ذبح شرعی کے ارکان وشرائط کیا کیا ہیں؟ جن کی رعایت کیے بغیر ذبیحہ حلال نہ ہوگا؟

(۲) اس کے سنن وآداب کیا کیا ہیں؟ نیز مکروہات بھی بیان فرمائیں۔

مستفتی: نجم الاسلام

سلاٹر ہاؤس، علی گڑھ، یوپی

(۸۶/ ۱۴۳۱ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وبالله التّوفيق :**

ذبیحہ کے حلال ہونے کے لیے درج ذیل امور کی رعایت ضروری ہے، جن میں سے بعض کا تعلق ذابح سے، بعض کا ذبیحہ اور کچھ کا آلۂ ذبح سے تعلق ہے :

(۱) ذبح کرنے والا مسلمان یا کتابی ہو، نیز اگر کوئی شخص اصل ذابح کے ساتھ ذبح میں شریک ہے، اس کا بھی مسلمان ہونا ضروری ہے؛ البتہ پکڑنے والوں کا مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ **شرط كون الذّابح مسلمًا ............ أو كتابيًا.** (۱)

(۲) ذبح کرنے والا عاقل ہو۔ **ولو الذّابح مجنونًا أو امرأةً أو صبيًّا يعقل التّسمية قال الشّامي : يعني يعقل لفظ التّسمية ، وقال أيضًا وزاد في الهداية: ويضبط ...... أي يعلم شرائط الذّبح من فرى الأوداج والحلقوم.** (۲)

---

(۱-۲)......(الف) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار :۹/ ۴۲۷ - ۴۳۰ .

(ب) فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۱۵/ ۳۹۷، ط: مکتبة دارالعلوم دیوبند .

(۳) ذبح میں حلقوم (نرخرہ) مری (وہ رگ جس سے دانہ پانی جاتا ہے) اور وَدْجَیْن (دوشہ رگیں) ان چار رگوں میں سے کم از کم تین کا کٹنا ضروری ہے۔ **والعروق الّتي تقطع في الذّكاة أربعة: الحلقوم والمري والودجان ........... وعندنا إن قطعها حلّ الأكل، وإن قطع أكثرها فكذٰلك عند أبي حنيفة.** (۱)

(۴) تسمیہ یعنی بہ وقتِ ذبح ذابح کا اللہ اکبر یا کوئی ذکر خالص زبان سے پڑھنا، نیز اگر ذبح کرنے میں ذابح کے ساتھ کوئی دوسرا شخص بھی شریک ہو، تو اس پر بھی تسمیہ ضروری ہے۔ بدائع الصنائع میں ہے: **وأمّا الذّي يرجع إلى محلّ الذّكاة فمنها تعيين المحلّ بالتّسمية.** (۲)

(۵) ''بسم اللہ اللہ اکبر'' پڑھنے میں درج ذیل امور کی رعایت ضروری ہے، ورنہ اُسے شرعی تسمیہ نہیں کہا جائے گا، جو حلتِ ذبیحہ کے لیے ضروری ہے۔

(الف): تسمیہ ذابح کی زبان سے ہو؛ لہٰذا اگر دوسرا شخص یا ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کے ذریعے تسمیہ ہو، تو جانور حلال نہ ہوگا۔ **أن تكون التّسمية من الذّابح حتّى لو سمّى غيره والذّابح ساكت وهو ذاكرٌ غير نَاسٍ لا يَحلُّ.** (۳)

(ب): تسمیہ کے ذریعے جانور پر تسمیہ پڑھنا مقصود ہو؛ لہٰذا اگر کسی اور مقصد سے پڑھا، تو یہ تسمیہ علی الذبح نہیں مانا جائے گا۔ **منها أن يريدَ بها التّسمية على الذّبيحة.** (۴)

(ج): تسمیہ کے الفاظ محض تعظیم خداوندی پر دال ہوں، کسی اور معنی مثلاً دعاء پر مشتمل نہ ہو۔ **منها أن يقصد بذكر اسم اللّٰه تعالىٰ تعظيمه على الخلوص ولا يشوبه معنى الدّعاء.** (۵)

(۶) آلۂ ذبح انسان کے بدن پر لگے ہوئے ناخن یا دانت نہ ہوں، **أمّا الآلة الّتي تفسخ فالظّفر القائم والسّنّ القائم، ولا يجوز الذّبح بهما بالإجماع.** (۶)

---

(۱) الهداية: ٤/٤٣٧، كتاب الذّبائح، ط: أشرفي، ديوبند.

(۲) بدائع الصّنائع: ٤/١٧٣، كتاب الذّبائح.

(۳-تا-۵) المصدر السّابق: ٤/١٧٠.

(۶) المصدر السّابق: ٤/١٥٩.

(۷) جانور حرم کا غیر پالتو (وحشی) جانور نہ ہو۔ **أن لا یکون صیدًا حرمیًّا.**(۱)

(۸) جانور غیر اللہ کے لیے ذبح نہ کیا جارہا ہو، مثلاً: (الف) بہ وقتِ ذبح اللہ کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام بہ طور تعظیم ذکر کردیا جائے جیسے: ''بسم اللہ واسم الرسول'' یا کسی بزرگ کا نام ذکر کیا جائے۔ (ب) ذبح کے ذریعے غیر اللہ کا تقرب مقصود ہو، جیسے کسی پیر یا بادشاہ کی آمد پر بہ طور تقرب جانور ذبح کیا جائے، اگر غیر اللہ کے لیے جانور ذبح کیا جائے گا، تو تمام شرائط کے پائے جانے کے باوجود ذبیحہ حلال نہ ہوگا۔ **الشّرط الخامس أن لا یهلّ لغیر اللّٰه بالذّبح (مثلاً) ذکر اسم غیر اللّٰه علی وجه التّعظیم (و) قصد الذّابح التّقرّب لغیر اللّٰه بالذّبح وإنْ ذکر اسم اللّٰه وحده إلخ .**(۲)

ذبح کے سنن ومستحبات درج ذیل ہیں:

(۱) مذبح کی طرف نرمی کے ساتھ لے جانا۔ (۲) ذبح سے پہلے جانور کو پانی پیش کرنا۔ (۳) جانور کو لٹانے سے پہلے چھری تیز کرنا۔ (۴) بائیں کروٹ لٹانا۔

(۵) لٹانے کے فوراً بعد ذبح کرنا بلا وجہ تاخیر نہ کرنا۔ (۶) دائیں ہاتھ سے ذبح کرنا۔

(۷) تیز دھاردار آلہ سے ذبح کرنا۔ (۸) کاٹنے میں جلدی کرنا۔

(۹) ذبح کرنے والے کا قبلہ رخ ہونا۔ (۱۰) جانور کا قبلہ رخ ہونا، یعنی اس کی جائے ذبح کا قبلہ رخ ہونا، چہرے کا قبلہ رخ ہونا ضروری نہیں ہے۔

(۱۱) ذبح دن میں ہو، رات میں نہیں؛ (البتہ رات میں اگر روشنی کا معقول انتظام ہو تو کراہت نہ رہے گی)۔

(۱۲) ذبح حلقوم کی طرف سے ہو، گدّی کی طرف سے نہ ہو۔ (۱۳) صرف رگیں کاٹنے پر اکتفاء کرنا کہ حرام مغز تک نہ پہنچے۔(۳)

---

**(۱-۲) الموسوعة الفقهيّة: ۱۷۹/۲۲-۱۹۵، ط: کویت .**

**(۳) یستفاد من النّصوص الفقهیّة التّالیة : (الف) ........... أنّ المستحبّ أن یکون الذّبح بالنّهار، ویکره باللّیل............أن یکون ذلك بآلة حادّة من الحدید کالسّکین والسّیف ==**

جہاں تک مکروہات کی بات ہے تو سنن و مستحبات کے ضمن میں ذکر کردہ کسی بھی بات کی خلاف ورزی باعثِ کراہت ہے اور بعض ( مثلاً: ترکِ توجہ الی القبلہ ) میں تو کراہتِ شدیدہ ہے، اس کے علاوہ درج ذیل امور مکروہ ہیں :

(۱) ٹھنڈا ہونے سے پہلے ہی کھال اتارنا شروع کردینا یا گردن مروڑ دینا۔ (۲) ایک جانور کے سامنے دوسرا جانور ذبح کرنا۔ (۳) جانور کے سامنے چھری تیز کرنا۔ (۴) ذبح کرنے سے پہلے جانور کو سوئی، ہتھوڑا، یا نشہ آور چیز کے ذریعے بے ہوش کرنا۔ (۵) بلا ضرورت ''معہود تکلیف'' سے زیادہ تکلیف پہنچانا۔ **في البناية : (يكره) أن تنخع الشّاة قبل أن تبرد، وفيه : إذا أراد الرّجل أن يذبح الذّبيحة كره له أن يجرها برجلها إلى المذبح ......... ويكره أن يذبح شاة والأخرى تنظر إليها (بناية: ۱۰/ ۶۷۵-۶۷۷، بيروت) وفي الهداية: ۴۳۹/۴) ويكره أن يضعها ثمّ يحدّ الشفرة، وفي شرحہ "البناية'': أنّ ما فيه زيادة إيلام لا يحتاج إليه في الذّكاة مكروه . (بناية: ۶۷۸/۱۰، دارالفكر، بيروت ) والرّابع من المكروهات مذكور في إمداد الفتاوى. (۳/۲۰۶-۲۰۷، كتاب الصّيد والذّبائح)**

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۵/ ۷/ ۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح : وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

---

**== ويكره بغير الحديد وبالكليل من الحديد ......... الاكتفاء بقطع الأوداج ، ولا يبلغ به النّخاع ......... أن يكون الذّابح مستقبل القبلة والذّبيحة موجّهة إلى القبلة إلخ .**

**(بدائع الصّنائع: ٤/ ١٨٨ – ١٨٩ ، كتاب الذّبائح ، ما يستحبّ في الذّكاة)**

**(ب) أن يكون الذّابح مستقبل القبلة ، والذّبيحة موجهة إلى القبلة بمذبحها لابوجهها. (الموسوعة الفقهية: ٢٢/ ١٩٩ )**

**(ج) يستحبّ أن يحدّ الذّابح شفرته . (الهداية: ٤/ ٤٣٨ ، ط: أشرفي، ديوبند)**

**(د) راجع : فتاوى دارالعلوم ديوبند: ١٥/ ٣٩٧.**

**وفتاوى رحيمية: ١٠/ ٦٨، ط: زكريا ديوبند وغيره .**

# بڑے جانور میں شرکت میں مضحی کی تعداد

# کا اعتبار ہے یا مذبوح عنہ کی تعداد کا

**سوال:** ﴿۱۱۰﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

(۱) کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جانور کوئی خریدتا ہے، اور اس پر قربانی کسی دوسرے کے نام سے کرتا ہے، یعنی جانور کا خریدار (مالک) اور جس کے نام سے قربانی کی جائے، کبھی دونوں ایک ہی شخص ہوتا ہے، اور کبھی دونوں الگ الگ ہوتے ہیں، اس میں اصل بات جو معلوم کرنا ہے وہ یہ ہے کہ بڑے جانوروں میں جو سات لوگوں کی شرکت کو جائز قرار دیا گیا ہے یہ سات کی تعداد مذکورہ دونوں لوگوں میں سے کس کی تعداد کا اعتبار ہے؟ آیا خریدنے والے مالکان کی تعداد کا اعتبار ہے یا جن کے نام سے قربانی کی جائے اُن کی تعداد کا اعتبار ہے؟ اگر خریدنے والے مالکان کی تعداد کا اعتبار ہے تو پھر سات لوگوں کا خرید کر سات سے زائد لوگوں کی جانب سے قربانی کرنا جائز ہونا چاہیے، جیسے کہ آپ ﷺ نے ایک مینڈھے کی قربانی پوری امت کی جانب سے کی تھی، اور اگر خریدنے والے مالکان کی تعداد کا اعتبار نہیں؛ بلکہ جن کے نام سے قربانی کی جائے ان کی تعداد کا اعتبار ہے، تو پھر بھینس جیسے بڑے جانور کو سات سے زائد لوگوں کا خرید کر سات یا اس سے کم کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہونا چاہیے، جیسا کہ درمختار کی اس عبارت ''**وإن مات أحد السّبعة المشتركين في البدنةِ وقال الورثة: اذبحوا عنه وعنكم صحَّ عن الكلّ إلخ**'' سے معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ اس ساتویں حصہ کے ورثہ مالک ہو گئے ہیں، اس عبارت کے حوالہ سے صاحبِ فتاویٰ رحیمیہ نے (۹۰/۲) اسی طرح کے مسئلہ کو جائز قرار دیا ہے، الغرض خریدنے والے مالکان کی تعداد کا اعتبار ہے یا جن کے نام سے قربانی کی جائے ان کی تعداد کا اعتبار ہے، رفعِ تعارض کے ساتھ مدلل تحریر فرما دیجیے۔

(۲) قربانی کے جانور کا کان یا دُم کٹ جائے تو اس کے تعلق سے شامی کی اس عبارت **ذُكِرَ في الجامع الصّغير إن كان كثيرًا يمنع وإن يسيرا لايمنع ، واختلف أصحابنا في**

**الفاصل بين القليل والكثير، فعن أبي حنيفة أربع روايات، روى محمّد عنه في الأصل والجامع الصّغير أنّ المانع ذهاب أكثر من الثّلث، وعنه أنّه الثّلث، وعنه أنّه الرّبع، وعنه أن يكون الذّاهب أقلّ من الباقي أو مثله (۲۰۶/۵)** میں چار روایات مذکور ہیں، ان میں پہلی روایت کو صاحبِ فتاویٰ قاضی خان نے ترجیح دی ہے، نیز یہ ظاہر الروایہ ہے اور دوسری روایت کو ترجیح دے کر بہشتی زیور میں مسئلہ لکھا گیا ہے، جب کہ اس دوسری روایت کو کسی عربی فتاویٰ میں ترجیح نہیں دی گئی ہے اور چوتھی روایت کو درمختار، شامی اور بزازیہ وغیرہ میں ترجیح دی گئی ہے، نیز صاحبِ احسن الفتاویٰ نے اسی روایت پر فتویٰ دیا ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ ان میں سے کون سی روایت مفتیٰ بہ ہے اور وجہ ترجیح کیا ہے باحوالہ تحریر فرمادیجئے۔

آنخضور والا سے نہایت مؤدبانہ گزارش ہے کہ احقر کو ان دونوں سوالات کے جوابات سے ممنون فرمائیں۔　　فقط والسلام

(۳۰/ د ۱۴۳۶ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفيق :**

(۱) بڑے جانور میں شرکت کے سلسلے میں اصل اعتبار مالکان کی تعداد کا ہے، چنانچہ سات افراد سے زیادہ کی شرکت جائز نہیں ہے۔(۱) ہاں اگر شرکاء یا اُن میں سے کوئی ایک اپنی طرف سے نفلی قربانی کر کے کئی لوگوں کو خواہ زندہ ہوں یا مردہ صرف ثواب میں شریک کرنا چاہیں، تو یہ بلاشبہ جائز ہے، ''امداد الاحکام'' میں ہے: صورتِ مسئولہ میں جس شخص نے ایک حصہ بقرہ میں سب امتِ محمدیہ کو شریک کیا ہے، اگر اس کی نیت محض ثواب پہنچانے کی نہ تھی؛ بل کہ سب کو اس حصہ میں شریک کرنا مقصود تھا، تو یہ قربانی صحیح نہ ہوئی (۲) اور سوال میں ذکر کردہ حدیث کہ ''آپ ﷺ نے پوری امت

**(۱) ولا يجوز بعير واحد ولا بقرة واحدة عن أكثر من سبعة، ويجوز ذلك عن سبعة أو أقلّ من ذلك، وهذا قول عامّة العلماء . (بدائع الصّنائع: ۲۰۶/٤-۲۰۷)**

**(۲) امداد الأحكام:** ۲۵۶/۴، ط: دارالاشاعت، کراچی، پاکستان۔

کی طرف سے ایک مینڈھے کی قربانی کی تھی''(۱) اس میں بھی پوری امت کو صرف ثواب میں شریک کرنا مقصود تھا، چنانچہ صاحبِ بدائع فرماتے ہیں: **فالجواب أنه صلّى الله عليه وسلّم إنّما فعل ذلك لأجل الثّواب ...... لا للإجزاء وسقوط التّعبّد عنهم** (۲) صاحبِ بذل المجہود فرماتے ہیں: **ثمّ المشاركة إمّا محمولة على الثّواب ، وإمّا على الحقيقة ، فيكون من خصوصية ذلك الجناب** (۳) **وهكذا في إعلاء السّنن** (۴) اور رہا درّ مختار وغیرہ کی عبارت ''**وإن مات أحدالسّبعة المشتركين في البدنة إلخ**''(۵) سے یہ استدلال کہ متعدد لوگ مشترکہ طور پر ایک بکری، یا ایک حصہ مرحوم کی طرف سے کر سکتے ہیں، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اس جزئیہ سے مذکورہ استدلال صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ ورثاء کا نہیں؛ بل کہ میت کا تصرف ہوتا ہے؛ چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیعؒ صاحب فرماتے ہیں: یہ ایک بین بین صورت ہے، نہ تو ملک میت ہے اور نہ ہنوز ملک ورثاء اس میں مکمل ہے، آگے لکھتے ہیں: خلاصہ یہ کہ حصہ اضحیہ اگر چہ اجازت ورثاء پر موقوف ہے، وہ اجازت نہ دیں تو ترکہ میں شامل ہو جائے گا؛ لیکن جب وہ اجازت دے دیں، تو یہ تصرف میت ہی کا نافذ ہوگا اور یہ عمل اسی کی طرف منسوب ہوگا، مثل وصیت زائد علی الثلث کہ بعد اجازت ورثاء میت کا ہی تصرف ہو کر وصیت ہی کی حیثیت سے نافذ ہوتی ہے، ورثاء کا صدقہ یا ہبہ نہیں کہلاتی اور اس صورت میں سبع بقرہ کا تجزیہ نہ ہوا۔(۶)

**(۱) عن أبي هريرة و عن عائشة – رضي الله عنها – أنّ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم كان إذا أراد أن يضحّي اشترى كبشين عظيمين ، سمينين أقرنين أملحين ، موجوءين ، فذبح أحدهما عن أمته لمن شهد بالله بالتّوحيد و شهد له بالبلاغ ، وذبح الآخر عن محمّد ، وعن آل محمّد صلّى الله عليه وسلّم . (ابن ماجة ، رقم: ٣٢٤١، باب أضاحي رسول الله صلّى الله عليه وسلّم)**

**(۲) بدائع الصّنائع: ٢٠٦/٤ .**

**(۳) بذل المجهود: ٧١/٤، باب ما يستحبّ من الضّحايا .**

**(۴) إعلاء السّنن: ٢٠٩/١٧، ط: أشرفي ديوبند .**

**(۵) الدّرّ المختار مع ردّ المحتار: ٤٧١/٩، كتاب الأضحيّة .**

**(٦) امداد المفتين، ص: ٧٩٦، ط: زكريا ديوبند .**

(۲) کسی مسئلے میں ایک سے زائد اقوال مفتیٰ بہ ہو سکتے ہیں؛ چنانچہ زیر بحث مسئلے میں ''اکثر من الثلث'' کی روایت کو صاحبِ فتاویٰ قاضی خان نے ترجیح دی ہے۔(۱) اور ''ثلث'' والی روایت کو حضرت تھانویؒ اور حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ نے اختیار کیا ہے۔(۲) جب کہ چوتھی روایت کو بزازیہ وغیرہ میں مختار بتلایا گیا ہے؛(۳) لیکن چوں کہ ثلث والی روایت پر عمل کرنے میں احتیاط زیادہ ہے، نیز حدیث وصیت ''والثلث کثیر''(۴) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے؛ اس لیے احتیاطاً اس روایت پر عمل کرنا راجح ہے، جب کہ بوقت ضرورت دوسری روایات پر بھی عمل کی گنجائش ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

---

(۱) قال في الخانية : والصّحيح أنّ الثّلث وما دونه قليل ، ومازاد عليه كثير ، وعليه الفتوىٰ

(فتاوى قاضى خان: ۳/ ۲٤۹، ط: اتّحاد ديوبند)

(۲) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے: تہائی سے کم کان کٹے ہوئے جانور کی قربانی درست ہے۔

(فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۱۵/ ۵۳۰، سوال نمبر: ۱۱۸)

بہشتی زیور میں ہے: ............ یا ایک کان تہائی یا تہائی سے زیادہ کٹ گیا یا تہائی دُم یا تہائی سے زیادہ کٹ گئی، تو اس جانور کی قربانی درست نہیں۔　　(اختری بہشتی زیور، ص: ۴۰، تیسرا حصہ، قربانی کا بیان)

(۳)......(الف): وما كان دون النّصف فهو قليل عندهما، وظاهرمذهبهما أنّ النّصف كثير.

(بزّازية: ۳/ ۱۵۹، الفصل الخامس في عيوبها ، ط: اتّحاد ديوبند)

(ب): وفي ''ملتقى الأبحر'': ولا مقطوعة اليد أو الرِّجل وذاهبة أكثر العين أو الأذن أو أكثر الذّنب أو الألية وفي ذهاب النّصف روايتان .

(ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر: ٤/ ۱۷۱-۱۷۲، ط: فقيه الأمّت ديوبند)

(۴) عن عامر بن سعد بن أبي وقّاص عن أبيه قال مرضتُ عام الفتح مرضًا أشفيت منه على الموت ، فأتاني رسول صلّى اللّٰه عليه وسلّم يعودني ، فقلت: يا رسول اللّٰه! إنّ لي ما لا كثيرًا وليس يرثني إلاّ ابنتي ، فأوصي بمالي كلّه ؟ قال لا قلت: فثلثي ما لي ؟ قال لا، قال: فالشّطر؟ قال لا ، قلت: فالثّلث ؟ قال: الثّلث ، والثّلث كثير إلخ .

(أخرجه التّرمذي ، رقم: ۲۱۱٦، باب ما جاء في الوصية بالثّلث)

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲/۱/ ۱۴۳۶ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام عفی عنہ
مفتیان دارالعلوم دیوبند

## تصویر کھنچوانے پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا اظہارِ افسوس

**سوال:** ﴿۱۱۱﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

صوبہ مہاراشٹر کے ضلع تھانے کے دیہاتوں کے مسلمانوں کی دینی، تعلیمی، معاشی، معاشرتی غرضیکہ ہمہ جہتی ضروریات میں آپسی طور پر امداد واعانت کے لیے ۱۹۸۴ء میں ''تھانے ضلع دینی مسلم فلاحی تنظیم'' کا قیام عمل میں آیا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اراکین وکارکنان تنظیم مسلمانوں کے ہمہ جہتی خدمات کی انجام دہی میں مصروف ہیں، اہل جود وسخا کی جانب سے موصول شدہ قومی عطیات (جنرل فنڈ) اور زکاۃ کی رقومات سے ہر سال کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔

اس سال کچھ ممبران کے اصرار پر ایک نئی مد خرچ کی نظر آئی، وہ یہ کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تصویر خوش نما فریم کی مبلغ گیارہ ہزار روپے جنرل فنڈ سے خرچ کر کے اس کو دیوار میں آویزاں کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔

مگر تنظیم کے قیام سے اب تک اس قسم کا لایعنی خرچ کبھی نہیں کیا گیا ہے، یہ پہلی مرتبہ بدعت نظر آئی، مجھے نہیں معلوم آئندہ کہاں تک یہ معاملہ پہنچے۔

آپ سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ میں شرع متین کے حکم سے آگاہ فرمائیں۔ والسلام

مستفتی: عبدالحمید ناچن عفی عنہ

(۱۴۴۳/ د ۱۴۳۴ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التّوفیق:

تصویر بنانا اور بنوا کر رکھنا یا فریم میں لگانا لٹکانا ناجائز اور حرام ہے (۱) ضرورت شدیدہ جہاں مجبوری ہو مثلاً: پاسپورٹ یا سرکاری وغیر سرکاری ضروری فارموں میں لگانے کی گنجائش ضرورۃً مستثنیٰ ہے، پس مولانا ابوالکلام آزاد کی تصویر فریم کر کے لگانا بھی حرام وناجائز کام ہے، اپنے ذاتی مال سے بھی اس طرح کا کام کرنا جائز نہیں تو تنظیم کی رقم سے کرنا اور بھی شدید جرم اور امانت میں خیانت کے مرادف ہے، ارشاد خداوندی ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوْا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا (۲) فنڈ کی رقمیں انہیں مصارف میں خرچ کرنا واجب ہے جن کے لیے فنڈ جمع کیا گیا، تصویر آویزاں کرنا کوئی مصرف خیر نہیں جس کے لیے چندہ کیا جائے۔ تصویر بنانے اور رکھنے کی وعید احادیث میں بہت سخت آئی ہے۔ أشدّ النّاس عذابًا عند اللّٰه یوم القیامة المصوّرون (۳) خود مولانا ابوالکلام آزاد صاحب مرحوم پہلے تصویر کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے؛ اسی لیے وہ ''الہلال'' ماہنامے کو با تصویر نکالتے تھے؛ لیکن بعد میں انہیں اپنی اس غلطی کا احساس ہوا؛ چنانچہ انہوں نے اس پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی غلطی سے توبہ کیا۔ فضل الدین احمد مرزا، بی- ایس- سی- ای- ایم- ایف- جی- ایس (یوکو) جو مولانا کے محبین اور قدر دانوں میں سے تھے، مولانا کے لکھے مضامین'' تذکرہ'' کے نام سے شائع کرنے لگے (جس میں مولانا ابوالکلام آزاد اور اُن کے خاندان کے بعض اکابر وشیوخ کے سوانح وحالات ہیں جس کا پہلا حصہ تمام تر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ہی کی تصنیف ہے) تو کتاب کے ٹائٹل پر مولانا کا فوٹو چھاپنے کا ارادہ ہوا اور مولانا سے فوٹو مانگا، اس ضمن میں فضل الدین صاحب کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں جس کے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں۔ ''انجمن اعانت نظر بنداں

---

(۱) وفي التّوضيح قال أصحابنا وغيرهم : تصوير صورة الحيوان حرام أشدّ التّحريم ، وهو من الكبائر ، وسواء صنعه لما يمتهن أو لغيرهٖ فحرام بكلّ حال ؛ لأنّ فيه مضاهاة لخلق اللّٰه ، وسواء كان في ثوب أو بساط أو دينار أو درهم أو فلس أو إناء أو حائط إلخ .

(عمدة القاري: ۱۰/۳۰۹، باب عذاب المصوّرين يوم القيامة ، ط: دار الطّباعة)

(۲) سورۂ نساء، آیت: ۵۸۔

(۳) أخرجه البخاري ، رقم: ۵۹۵۰، باب بيان عذاب المصوّرين يوم القيامة .

دہلی نے بار باران سے فوٹو طلب کیا؛ مگر انہوں نے نہ بھیجا، سید فضل الرحمٰن نے اخبار ''جمہور'' کلکتہ میں ان کے فوٹو کا اعلان شائع کیا تھا، اس پر وہ سخت برہم ہوئے اور بڑا ہی سخت خط ان کو لکھا، پھر مجھے لکھا کہ جس قدر کاپیاں انہوں نے تیار کی ہیں، میری طرف سے خرید کر کے رکھ لو اور شائع نہ ہونے دو ...... جب میں نے تصویر کی نسبت کہا تو انہوں نے لکھا کہ ''تصویر کا کھنچوانا، رکھنا، شائع کرنا سب نا جائز ہے، یہ میری سخت غلطی تھی کہ تصویر کھنچوائی تھی اور ''الہلال'' کو باتصویر نکالا تھا، میں اب اس غلطی سے تائب ہو چکا ہوں، میری پچھلی لغزشوں کو چھپانا چاہیے نہ کہ از سر نو ان کی تشہیر کرنی چاہیے''۔ (فضل الدین احمد کلکتہ) ۱۶/ اگست ۱۹۱۹ء

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جب زندگی میں تصویر چھاپنے اور ٹائٹل پر لگانے کو گوارہ نہیں کر رہے ہیں؛ بلکہ اس سے اذیت محسوس کر رہے ہیں، تو پس مرگ مولانا کا فوٹو فریم کرا کے لگانا حکم شریعت کی مخالفت کے ساتھ مولانا کی روحانی اذیت کا باعث بھی ہے، سوا نفس و شیطان کی متابعت کے کچھ نہیں، پس اس حرکت سے باز آنا لازم ہے اور جو لوگ ارادہ کر رہے ہوں انہیں سختی کے ساتھ منع کیا جائے، جیسا کہ مولانا نے سخت خط لکھ کر منع کیا اور کاپیاں خود خریدوا کر ضبط کر لیں۔

(نوٹ: مذکورہ بالا کتاب البلاغ پریس کلکتہ سے ۱۹۱۹ء میں چھپی ہے، اور راقم الحروف کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۸/۱۲/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## جھوٹی شہادت میں شاہد کا رجوع کرنا واجب ہے

**سوال:** ﴿۱۱۲﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں؟

میرے ایک دوست کے بھائی کا قتل ہوا، جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، یعنی میں اس کا چشم دید گواہ نہیں ہوں؛ مگر مقتول میرے دوست کا بھائی ہونے کی وجہ سے میں نے پولیس میں

بیان دیا کہ میں حادثہ کے وقت اس جگہ پر موجود تھا، اس کے بعد پولیس نے میرا جواب کورٹ میں سیکشن 161 کے تحت سیل کیا، اب کیس بورڈ پر آ رہی ہے، میری گواہی سے کورٹ میں کیس کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اب شریعت میرے لیے کیا حکم دیتی ہے؟

(۲۱۳۶/د۱۴۳۰ھ)

باسمہٖ تعالیٰ

**الجواب و باللّٰہ التّوفیق :**

شہادت کہتے ہیں جس جگہ آدمی موجود ہو، وہاں کسی وقوع پذیر واقعہ کی گواہی دینے کو، جس کا اس نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو۔(۱) جب آپ دوست کے بھائی کے قتل کے شاہد نہیں ہیں تو آپ کا گواہی دینا ''شہادت زور'' میں داخل ہوگا، اگر آپ کی گواہی واقعہ کے بھی خلاف ہوگی تو حق العبد ضائع کرنے کا بھی گناہ ہوگا۔(۲) اور اس خلاف واقعہ گواہی سے رجوع کرنا آپ پر واجب ہے؛ تا کہ مدعی علیہ پر ظلم نہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۶/۱۱/۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری، وقار علی غفرلہٗ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

## سویمنگ پل قائم کرنا شرعاً کیسا ہے؟

محترم المقام! حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم دارالعلوم دیوبند

السّلام علیکم و رحمة اللّٰہ و برکاتہٗ

---

(۱) الشّهادة : الإخبار بصحّة الشّيء مشاهدةً و عيانًا ، يقال: شهد عند الحاكم لفلان على فلان بكذا، شهادةً، فهو شاهد. (المغرب:۱/۲۵۹، باب الشّين مع الهاء ، دار الكتاب العربي)

(۲) يستفاد ممّا في مجمع الأنهر : وفي الكافي : اعلم أنّ شاهد الزّور يعزر إجماعًا ، اتّصل القضاء بشهادته أو لا ؛ لأنّه ارتكب كبيرة اتّصل ضررها بمسلم . (مجمع الأنهر:۳/۳۰۵، كتاب الشّهادات ، باب الرّجوع عن الشّهادة)

**سوال:** ﴿۱۱۳﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں:

مسلم اداروں میں مثل کالج اور اسکول میں تیراکی کے نظم کو قائم کرنے کے معاملے میں:

(الف) کیا قرآن مجید اور حدیث شریف کی رو سے تیراکی کے لیے مسلم ادارے (مذکورہ) جو خالص مردوں اور لڑکوں کے لیے قائم ہیں، اس میں سوئمنگ پول (Swimming Pool) قائم کر سکتے ہیں؟

(ب) کیا تیراکی یعنی تیرنا رسول اکرم ﷺ کی سنتِ مبارکہ میں شامل ہے؟ اگر ہے تو ازراہِ کرم نصوص کے ذریعہ وضاحت فرمائیں۔

(ج) کیا تیراکی سیکھنا اور سکھانا مذہبِ اسلام میں منع ہے؟

محترم علمائے دین اور مفتیانِ شرعِ متین سے گذارش ہے کہ ہمیں جواب با صواب مرحمت فرمائیں۔　(۵۷۹/ د۱۴۳۴ھ)

فقط والسلام

خاکسار: قیصر احمد

باسمہ تعالیٰ

**الجواب وباللّٰہ التّوفیق:**

(الف) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ چار چیزیں لہو مکروہ میں داخل نہیں، ان میں آپ ﷺ نے سباحت (تیراکی) کو بھی شمار کرایا۔ (۱)

---

(۱) عن عطاء ابن أبي رباح قال رأيت جابر بن عبد الله وجابر بن عبيد الله الأنصاري يرتميان فمد أحدهما فجلس فقال لهٗ الآخر سمعت رسول الله صلّى الله عليه وسلّم يقول: كلّ شيء ليس مِن ذكر الله عزّ وجلّ فهو لهو أوسهو إلّا أربع خصال مشي الرّجل بين الغرضين وتأديبه فرسه وملاعبته أهله وتَعَلُّم السّباحة. رواه الطّبراني في الأوسط والكبير والبزّار ورجال الطّبراني رجال الصّحيح خلا عبد الوهّاب بن بخت. (مجمع الزّوائد: ۲۶۹/۵، كتاب الجهاد، باب ما جاء في القسي والرّماح والسّيوف، ط: دارالفكر بيروت)

تیراکی کے سلسلے میں فقہ وفتاویٰ کی مشہور کتاب ''ردّ المحتار'' میں ہے: **والسّباحة فظاهر كلامهم الجواز** (۱) یعنی فقہاء کے کلام سے تیراکی کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ **وفيه أيضًا ...... لكن إنّما يباح إذا لم يكن فيه إنسان مكشوف العورة** (۲) ایک دوسری جگہ ہے: **وفي الحديث: أنّها ستفتح لكم أرض العجم، وستجدون فيها بيوتًا يقال لها الحمّامات فلا يدخلها الرّجل إلّا بالإزار وامنعوها النّساء** (۳) یعنی مشترک حمام میں داخل ہونا مردوں کے لیے اس شرط پر جائز ہے کہ ستر کھلا نہ ہو؛ کیوں کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مرد اس میں بغیر ازار کے نہ داخل ہوں، اور عورتوں کو تو داخلہ سے بالکل ہی منع کر دو۔

ان حوالوں سے معلوم ہوا کہ تیراکی کرنے والے صرف لڑکے ہوں اور ان کا ستر ڈھکا ہو، یعنی ناف سے لے کر گھٹنے تک ستر پوشی کا پورا اہتمام کریں، انڈرویر پہن کر تیراکی نہ کریں (۴) نیز اور بھی کوئی منکر شرعی نہ پایا جائے، تو ایسی تیراکی لڑکوں کے لیے جائز ہے، اور سوئمنگ پول قائم کرنا بھی درست ہے۔

(ب) علامہ مناوی نے فیض القدیر میں ایک مرسل روایت ذکر کی ہے، جس میں حضور ﷺ اور صحابۂ کرام کے تیرنے کا ذکر آیا ہے۔ (۵)

اور مصنف عبد الرزاق میں عبد الکریم سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ملک

---

(۱) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۵۷۹/۹، فصل في البيع.

(۲) ردّ المحتار: ۳۲۵/۵، كتاب النّفقة.

(۳) ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ۷۲/۹، كتاب الإجارة.

(۴) دخول الحمام مِن غير إزار حرام ...... فالدّخول مِن غير إزار مرّة واحدة يكفي لسقوط العدالة. (الفتاوى الهندية: ۳۶۳/۵، الباب الرّابع والعشرون في دخول الحمام)

(۵) عن ابن أبي مليكة أنّ المصطفى صلّى اللّٰه عليه وسلّم دخل هو وأصحابه غديرًا، فقال يسبح كلّ رجل إلى صاحبه فسبح كلُّ رجلٍ منهم إلى صاحبه حتّى بقي أبوبكر والمصطفى صلّى اللّٰه عليه وسلّم فسبح إلى أبي بكر واعتنقه ............ قال السّخاوي سنده ضعيف لكن له شواهد. (فيض القدير: ۳۲۸/٤، دار المعرفة بيروت)

شام کے اُمراء کولکھا کہ تیر اندازی سیکھو، تیر اندازی کے دونوں نشانوں کے درمیان پیدل چلو، اور اپنے بچوں کولکھنا اور تیرنا سکھاؤ،(۱) ان دونوں روایتوں کی روشنی میں فی الجملہ تیرا کی کی پسندیدگی اور عمدگی معلوم ہوتی ہے۔

(ج) منع کسی منکر کے شمولیت کی وجہ سے ہوسکتا ہے ورنہ اصل حکم جواز کا (الف) میں مفصلاً لکھ دیا گیا؛ البتہ اس زمانے میں نہانے کے لیے جو سوئمنگ پول بالعموم شہروں اور کالجوں میں بنائے جاتے ہیں ان کے بارے میں سنا ہے کہ لڑکے لڑکیوں کا مخلوط اجتماع ہوتا ہے، اگر ایسا ہے تو اس کے ناجائز اور حرام ہونے میں کیا شبہ! اور اگر صرف لڑکے ہی ہوں؛ لیکن اُن کی رانیں کھلی ہوں یا وہاں فساق فجار کا جمگھٹا ہو تو اس کے مکروہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے!(۲) سوئمنگ پل ان مشترک حمامات کے مشابہ ہیں جن کا ذکر احادیث اور کتب فقہ میں ملتا ہے، آں حضرت ﷺ نے حمامات کے بارے میں فرمایا کہ مرد ستر پوشی کے ساتھ جائیں اور عورتیں ہرگز نہ جائیں (۳)؛ لہٰذا سوئمنگ پل

---

(۷) عن زيد بن حارثة أنّ عمر بن الخطّاب كتب إلٰى أمراء الشّام أن يتعلّموا الرّمي ويمشوا بين الغرضين حفاةً وعلِّموا أولادكم الكتابة والسّباحة .

(كنز العمّال: ٤/ ٢٠٠، رقم: ١١٣٨٧، كتاب الجهاد، ط: مكّة المكرّمة)

(۸) قال في الدّرّ : قلت: وفي زماننا لا شكّ في الكراهة لتحقّق كشف العورة ............ قال الشّامي تحته : لا يختصّ ذلك بحمام النّساء ؛ فإن في ديارنا كشف العورة الخفيفة أو الغليظة متحقّق من فسقة العوام الرّجال .

(ردّ المحتار على الدّرّ المختار: ٩/ ٧٢، باب الإجارة الفاسدة)

(۹)......(الف) عن المقدام بن معديكرب قال، قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم: إنّكم ستفتحون أُفقافيها بيوت يقال لها الحمّامات ، حرام على أمتي دخولها ، فقالوا: يا رسول اللّٰه! إنّها تذهب الوصب وتنقى الدّرن ، قال: فإنّها حلال لذكور أمّتي في الأزر، حرام علٰى إناث أمتي. (مجمع الزّوائد: ١/ ٢٧٨، باب في الحمّام والنّورة ، ط: قاهرة)

(ب) عن عائشة رضي اللّٰه تعالٰى عنها أنّها سألت رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم عن الحمّام فقال: إنّه سيكون بعدى حمّامات ، ولا خير في الحمّامات للنّساء ، ==

میں اگر منکرات شرعیہ کے پائے جانے کا اندیشہ ہو تو اس کا قائم کرنا جائز نہ ہوگا نہ ہی وہاں نہانا کسی کے لیے جائز ہوگا (۱) ورنہ منکرات ومحرمات سے خالی سوئمنگ پل اباحت کے درجہ میں ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۹/۴/۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

مفتیان دارالعلوم دیوبند

== فقالت يا رسول الله! إنّها تدخله بإزار، فقال لا وإن دخلته بإزار ودرع وخمار، وما من امرأة تنزع خمارها في غير بيت زوجها إلّا كشفت السّتر فيما بينها وبين ربها، رواه الطّبراني في الأوسط، وفيه ابن لهيعة وهو ضعيف. (المصدر السّابق)

(ج) عن ابن عبّاس رضي الله عنهما عن النّبيّ صلّى الله عليه وسلّم قال: لا تدخل الحمّام إلّا بمئزر، من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يدخل حليلته الحمّام، الحديث. (المصدر السّابق)

(۱) وكره بعضهم اتّخاذه للنّساء؛ لأنّه قلما يخلو اجتماعهنّ عن فتنة.

(مجمع الأنهر: ۵۳۲/۳، ط: فقيه الأمّت ديوبند)

# المراجع والمصادر

## قرآن کریم اور متعلقات


| | |
|---|---|
| القرآن الكريم | |
| التّفسير للبيضاوي | قاضی ناصر الدین محمد بن علی الشیرازی البیضاوی م۶۴۱ |
| الجامع لأحكام القرآن (قرطبي) | الامام ابوعبداللہ محمد بن احمد الاندلسیؒ، م: ٦٦٨ھ |
| البحر المحيط | محمد بن یوسف بن علی بن یوسف الغرناطی م: ۷۴۵ھ |
| روح المعاني | الامام ابوالفضل سید محمود الآلوسیؒ، م: ۱۲۷۰ھ |
| التّفسير لابن كثير | الحافظ عماد الدین اسماعیل بن کثیر الدمشقی م: ۷۷۴ھ |
| الكشّاف | ابوالقاسم محمود بن عمرو بن احمد الزمخشری م: ۵۳۸ھ |
| تفسير المظهري | مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی م: ۱۲۲۵ھ |
| مدارك التّنزيل | ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود حافظ الدین النسفی م۷۱۰ھ |
| معالم التّنزيل | ابومحمد الحسین بن مسعود بن محمد بن الفراء البغوی: ۵۱۰ھ |
| احكام القرآن للجصاص | ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاصؒ، م: ۳۷۰ھ |
| تفسير الماوردي | ابوالحسن علی بن محمد بن محمد بن حبیب الشهیر بالماوردی م: ۴۵۰ھ |
| الاتقان في علوم القرآن | عبدالرحمٰن بن ابی بکر، جلال الدین السیوطی، م: ۹۱۱ھ |
| مناهل العرفان | محمد عبدالعظیم الزرقانی، م: ۱۳٦۷ھ |
| أحكام القرآن | الشیخ المفتی محمد شفیع الدیوبندی م: ۱۳۹۵ھ |
| بيان القرآن | الشیخ اشرف علی التھانویؒ، م: ۱۳٦۲ھ |
| معارف القرآن | الشیخ المفتی محمد شفیع الدیوبندیؒ، م: ۱۳۹۵ھ |

## حدیث اوراصولِ حدیث


الجامع الصّحيح للبخاري　الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ،م:۲۵٦ھ

الجامع الصّحيح للإمام مسلم　الامام ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیریؒ،م:۲٦۱ھ

الجامع للترّمذي　الامام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذیؒ،م:۲۷۹ھ

السّنن لأبي داؤد　الامام ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانیؒ،م:۲۷۵ھ

السّنن لابن ماجة　الامام محمد بن یزید القزوینیؒ،م:۲۷۳-۲۷۵ھ

الموطا للإمام مالك　ابوعبداللہ مالک بن انس بن مالکؒ،م:۱۷۹ھ

السنن للنّسائي　ابوعبدالرحمٰن احمد ابن علی بن شعیب بن علیؒ،م:۳۰٦ھ

مشكاة المصابيح　ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التمریزیؒ،م:۷۴۱ھ

إعلاء السّنن　الشیخ ظفر احمد العثمانیؒ،م:۱۳۹۴ھ

كنز العمّال　علی بن حسام الدین المتقیؒ،م:۹۷۵ھ

مصنف ابن أبي شيبة　ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ الکوفیؒ،م:۲۳۵ھ

نصب الرّاية　علامہ جمال الدین عبداللہ بن یوسف الزیلعیؒ،م:۷٦۲ھ

المصنف لعبد الرزاق　ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام الیمانی الصنعانیؒ،م:۲۱۱ھ

فيض القدير للمناوي　الشیخ زین الدین محمد المدعوبعبد الرؤوف الحدادیؒ،م:۱۰۳۱ھ

عمل اليوم والليلة　العلامۃ احمد بن محمد الدینوری،المعروف بابن السنیؒ،م:۳٦۴ھ

المنتقى المختار للصّابوني　محمد علی الصابونی استاذ التفسیر بجامعۃ امّ القری

المعجم الكبير للطبراني　علامہ ابوالقاسم سلیمان ابن احمد الطبرانیؒ،م:۳٦۰ھ

مجمع الزّوائد　الحافظ نورالدین علی ابن ابی بکر الہیثمیؒ م: ۸۰۷ھ

السّنن للإمام الدّارمي　ابومحمد عبد اللہ بن عبد الرحمٰن بن الفضل بن بہرام بن عبد الصّمد الدّارمی،م:۲۵۵ھ

تلخيص الذّهبي　شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عثمان بن قاىماز الذہبی م: ۷۴۸ھ

البحر الزّخار بمسند البزّار ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق بن خلّاد المعروف بالبزّار، م:۲۹۲ھ

مشکلات الآثار الامام ابوجعفر الطحاوی، م:۳۲۱ھ

کتاب الآثار محمد بن الحسن الشیبانی، م:۱۸۹ھ

التّرغیب والتّرھیب اسماعیل بن محمد الفضل بن علي القرشی، م:۵۳۵ھ

الشّمائل للإمام التّرمذي الامام ابوعیسٰی محمد بن عیسٰی الترمذی، م:۲۷۹ھ

دلائل النّبوّة اسماعیل بن محمد بن الفضل بن علی القرشی، م:۵۳۵ھ

حیاۃ الصّحابہ محمد یوسف بن محمد الیاس بن محمد اسماعیل الکاندھلوی، م:۱۳۸۴ھ

## عقائد وعلمِ کلام

الفقه الأكبر ینسب لابی حنیفۃ النعمان بن الثابت بن نعمان بن مرزبان التیمی الکوفی، م:۱۵۰ھ

شرح الفقه الأكبر العلامہ علی بن سلطان القاری، م:۱۰۱۴ھ

العقيدة الطّحاوية الامام ابوجعفر الطحاوی، م:۳۲۱ھ

شرح العقائد النّسفية العلامہ سعد الدین مسعود بن عمر التفتازانی، م:۷۹۲ھ

المهنّد على المفنّد الشیخ خلیل احمد السّہارنپوری ۱۳۴۶ھ

علمائے دیوبند کے عقائد ونظریات مولانا توحید عالم قاسمی، استاذ دارالعلوم دیوبند

## شروح حدیث

فتح الباري ابوالفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانیؒ، م:۸۵۲ھ

عمدة القاري العلامہ بدرالدین العینیؒ، م:۸۵۵ھ

النّووي على مسلم محی الدین یحییٰ بن شرف النوویؒ، م:۶۷۶ھ

المصفى شرح الموطأ مسند الہند الشاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم الدہلویؒ، م:۱۱۷۶ھ

مرقاة المفاتيح العلامہ علی بن سلطان القاریؒ، م۱۰۱۴ھ

بذل المجهود الشیخ خلیل احمد السہارن پوری، م:۱۳۴۶ھ

أوجز المسالك الشیخ زکریا الکاندھلویؒ، م:۱۴۰۲ھ

| | |
|---|---|
| فيض الباري | العلامہ انور شاہ الکشمیری، م: ۱۳۵۲ھ |
| العرف الشّذي | العلامہ انور شاہ الکشمیری، م: ۱۳۵۲ھ |
| التّعليق الممجّد | الشیخ عبدالحی اللکنویؒ، م: ۱۳۰۴ھ |
| معارف السّنن | العلامہ محمد یوسف البنوریؒ، م: ۱۳۹۷ھ |
| تكملة فتح الملهم | سماحۃ المفتی محمد تقی العثمانی |
| تحفۃ القاری | مفتی سعید احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند |
| تحفۃ الألمعی | مفتی سعید احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند |
| عون المعبود | محمد ابوالطیب شمس الحق العظیم آبادی م: ۱۳۱۰ھ |
| **فقہ واصولِ فقہ** | |
| تنوير الأبصار | محمد بن عبداللہ بن محمد الخطیب الغزنی الحنفی م: ۱۰۰۴ھ |
| الدّرّ المختار | محمد بن علاء الدین الحصکفیؒ، م: ۱۰۸۸ھ |
| ردّ المحتار | العلامہ ابن عابدین الشامیؒ، م: ۱۲۵۲ھ |
| فتاویٰ قاضي خان | العلامہ حسن بن منصور المعروف بقاضی خانؒ، م: ۵۹۲ھ |
| خلاصة الفتاویٰ | الشیخ طاہر بن احمد بن عبدالرشید البخاری، م: ۵۴۲ھ |
| بدائع الصّنائع | العلامہ ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ، م: ۵۸۷ھ |
| البحر الرّائق | العلامہ ابن نجیم المصریؒ، م: ۹۷۰ھ |
| فتح القدير | العلامۃ کمال الدین بن الہمامؒ، م: ۸۶۱ھ |
| تبيين الحقائق | الشیخ فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ م: ۷۴۳ھ |
| المحيط البرهاني | ابوالمعالی برہان الدین محمود بن احمد بن عبدالعزیز بن عمر بن مازۃ الحنفی م: ۶۱۶ھ |
| ملتقى الأبحر | العلامۃ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم الحلبی، م: ۹۵۶ھ |
| الفتاوى السّراجية | الشیخ الامام العلامہ الفقیہ سراج الدین ابی محمد علی بن عثمان بن محمد التیمی الاوشی الحنفی، م: ۵۶۹ھ |
| مجمع الأنهر | الشیخ محمد بن سلیمانؒ الکلیبولی معروف بہ شیخ زادہ م: ۱۰۷۸ھ |

حاشية الطّحطاوي على مراقي الفلاح　العلامہ احمد بن محمد الطحطاوی، م:١٢٣١ھ

هداية　شیخ الاسلام برہان الدین المرغینانیؒ م:٥٩٣ھ

البناية شرح الهداية　العلامہ بدرالدین العینی، م:٨٥٢ھ

العناية شرح الهداية　محمد بن محمد بن محمود اکمل الدین البابرتی، م:٧٨٦ھ

الفتاوى الهندية　العلامہ نظام الدین و جماعۃ من العلماء

الفتاوى البزّازية　محمد بن محمد بن شہاب الکردری، م:٨٢٧ھ

شرح منظومة ابن وهبان　عبدالبر بن محمد المعروف بہ ابن الشحنۃ الحلبی، م:٩٢١ھ

المبسوط للسّرخسي　شمس الائمہ شمس الدین ابوبکر محمد السرخسیؒ م:٤٩٠

كبيري　العلامۃ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم الحلبیؒ، م:٩٥٦ھ

الفتاوى التّاتارخانية　العلامہ عالم بن علاء الانصاری الدہلویؒ، م:٧٨٦ھ

الأشباه والنّظائر　العلامہ ابن نجیم المصریؒ م:٩٧٠ھ

دررالحكّام شرح غرر الأحكام　محمد بن فراموز بن علی الشہیر بملا خسرو، م:٨٨٥ھ

الموسوعة الفقهيه الكويتية　مجموعۃ من العلماء

شرح المجلة　الشیخ رستم باز اللبنانی

المغني لابن قدامة　الشیخ موفق الدین عبداللہ بن احمد الشہیر بابن قدامہ المقدسیؒ م:٦٢٠ھ

زبدة المناسك مع عمدة المناسك　الشیخ مولانا رشید احمد الکنکوہیؒ، م:١٣٢٣ھ

مجلّة الأحكام العدلية　لجنۃ مؤلفۃ من العلماء المحققین

البحر العميق　الشیخ ابوالبقاء محمد بن احمد بن محمد الضیاء المکی، م:٨٥٤ھ

تحفة المحتاج في شرح المنهاج　احمد بن محمد بن علی بن حجر الہیثمی، م:٩٧٤ھ

منح الجليل شرح مختصر الخليل　محمد بن احمد بن محمد علیش ،ابوعبداللہ المالکی ،م:۱۲۹۹ھ
المبدع في شرح المقنع　ابراہیم بن محمد بن عبداللہ بن محمد ابن مفلح ابواسحاق برہان الدین،م: ۸۸۴ھ
السّعاية　الشیخ ابوالحسنات عبدالحی اللکنویؒ،م:۱۳۰۴ھ
آكام النّفائس في أداء الأذكار بلسان الفارس　الشیخ ابوالحسنات عبدالحی اللکنویؒ،م:۱۳۰۴ھ
الموسوعة العلمية　المجمع الفقہی الاسلامی، جدہ
معجم لغة الفقهاء　محمد رواس قلعجی - حامد صادق قنیبی
التّعريفات الفقهية　الشیخ عمیم الاحسان المجددی
مجموعة الفتاوىٰ　احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہ الحرانی: م: ۷۲۸ھ
غنية النّاسك　العلامۃ المحقق محمد حسن شاہ المہاجر المکیؒ م ۱۳۴۶ھ
جواهر الفقه　المفتی محمد شفیع الدیوبندیؒ،م:۱۳۹۵ھ
بوادر النّوادر　حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ،م:۱۳۶۲ھ
امداد المفتين　المفتي محمد شفیع الدیوبندیؒ،م:۱۳۹۵ھ
كفايت المفتي　الشیخ المفتی کفایت اللہ الدہلویؒ،م:۱۳۷۲ھ
أحسن الفتاوى　الشیخ رشید احمد اللدھیانویؒ،م:۱۴۲۲ھ
فتاویٰ دارالعلوم دیوبند　المفتی عزیز الرحمٰن الدیوبندیؒ،م:۱۳۴۷ھ
امدادالاحکام　العلامہ ظفر احمد العثمانیؒ،م:۱۳۹۴ھ
امدادالفتاویٰ　الشیخ اشرف علی التھانویؒ،م:۱۳۶۲ھ
فتاوی محمودیہ　الشیخ محمود حسن الگنگوہیؒ،م:۱۴۱۷ھ
فتاوی رحیمیہ　المفتی عبدالرحیم اللاجپوریؒ،م:۱۴۲۲ھ
ادلہ کاملہ　الشیخ محمود حسن المعروف بشیخ الہندؒ الدیوبندي م:۱۳۳۹ھ

فتاوی رشیدیہ	الشیخ رشید احمد الکنکوہیؒ، م: ۱۳۲۳ھ
بہشتی زیور	شیخ اشرف علی تھانویؒ، م: ۱۳۶۲ھ
اسلام اور جدید معاشی مسائل	سماحۃ الشیخ محمد تقی العثمانی حفظہ اللہ
باقیات فتاویٰ رشیدیہ	الشیخ مولانا رشید احمد الکنکوہیؒ، م: ۱۳۲۳ھ
تالیفات رشیدیہ	الشیخ مولانا رشید احمد الکنکوہیؒ، م: ۱۳۲۳ھ
الحیلۃ الناجزہ	الشیخ اشرف علی التھانویؒ، م: ۱۳۶۲ھ
فتاوی عثمانی	سماحۃ الشیخ مفتی محمد تقی العثمانی حفظہ اللہ
منتخبات نظام الفتاویٰ	حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین اعظمیؒ، م: ۱۴۲۰ھ
معلم الحجاج	مفتی سعید احمد صاحبؒ مہتمم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور، م: ۱۳۸۸ھ

## متفرقات

کتاب الروح	العلّامہ ابن قیّم الجوزیہ، م: ۷۵۱ھ
شرح الصّدور	عبد الرحمٰن بن ابی بکر جلال الدین السیوطی م: ۹۱۱ھ
المغرب	ناصر بن عبد السید ابی المکارم ابن علی المطرزی، م: ۶۱۰
رحمۃ اللہ الواسعۃ	حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم
بائبل سے قرآن تک	سماحۃ الشیخ مفتی محمد تقی العثمانی حفظہ اللہ
حدیثِ دوستاں	مولانا اعجاز احمد صاحب قاسمی
ضمیمہ اصلاح ترجمۂ دہلویہ	از: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، م: ۱۳۶۲ھ
تذکرہ (مولانا ابو الکلام آزادؒ)	فضل الدین احمد مرزا بی-ایس-سی
نغمۂ الوہیت ترجمہ بھگوت گیتا	جناب حسن الدین احمد صاحب
گیتا امرت المعروف بہ اکسیر روح	چودھری روشن لعل اسسٹنٹ کمشنر ملتان
گیتا گیان خلاصۂ شریمد بھگوت گیتا	گاندھی جی
ارجن گیتا ترجمہ شریمد بھگوت گیتا	جگناتھ پرشاد المتخلص بہ عارف
ادراک زوال امت	راشد شاز
متحدہ اسلام کا منشور	راشد شاز

# دارالعلوم دیوبند کی اہم مطبوعات

| | |
|---|---|
| الإسلام و العقلانية | فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ( ۱ تا ۱۸ ) |
| قصائد منتخبة من ديوان المتنبّي | دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی نقوش |
| الفتنة الدّجالية | علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج |
| العقيدة الإسلاميّة | تاریخ دارالعلوم دیوبند (اردو،انگریزی،۲:جلد) |
| مبادي الفلسفه | حیات اور کارنامے مولانا قاسم صاحبؒ |
| تسهيل الأصول | حیات اور کارنامے حضرت شیخ الہندؒ |
| باب الأدب من ديوان الحماسة | حیات اور کا نارے حضرت مولانا رشید احمدؒ |
| مفتاح العربية (اوّل،دوم) | خیر القرون کی درس گاہیں |
| علماؤ ديوبند اتّجاههم الدّيني و مزاجهم ...... | مختصر سوانح ائمۂ اربعہ |
| دارالعلوم ديوبند (عربي) | سوانح قاسمی (مکمل ۲: جلد) |
| الحديث الحسن | حکمتِ قاسمیہ |
| حسن غريب (مکمل۲: جلد) | آبِ حیات |
| حسن صحيح (مکمل۳: جلد) | اوثق العریٰ |
| الحالة التّعليمية في الهند | احسن القریٰ فی توضیح اوثق العریٰ |
| حجّة الإسلام (عربي،اردو) | ادلۂ کاملہ |
| الصّحابة ماذا نيبغي أن نعتقد عنهم | ایضاح الادلّہ |
| إشاعة الإسلام | شوریٰ کی شرعی حیثیت |
| شيوخ الإمام أبي داوٗد السّجستاني | تدوین سیر و مغازی |
| علماؤ ديوبند خدماتهم في الحديث | آئینۂ حقیقت نما |
| الرأى النّجيح في عددر كعات التّراويح(اردو) | تذکرۃ النعمانؒ |
| هداية المعتدي في قراء ة المقتدي (اردو) | اجودھیا کے اسلامی آثار |

| | |
|---|---|
| ألفية الحديث | تاریخ دارالعلوم دیوبند (مکمل، دوجلد) |
| قصائد منتخبة من ديوان المتنبي | ھدایۃالمعتدی فی قراء ۃ المقتدی (اردو) |
| المقامات الحريرية | الرأی النجیح فی عدد رکعات التراویح (اردو) |
| الحسامي | علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج |
| مبادي الفلسفه | ختم نبوت (کامل) |
| تسهيل الأصول | رد مرزائیت کے زریں اصول |
| باب الأدب من ديوان الحماسة | نماز کے چند اہم مسائل کی تحقیق |
| مفتاح العربية (اوّل،دوم) | نیک بیبیاں نماز کہاں پڑھیں؟ |
| علماؤ ديوبند اتجاههم الدّيني ومزاجهم...... | سوانح قاسمی (مکمل،دوجلد) |
| دار العلوم ديو بند | ادلہ کاملہ |
| الحديث الحسن | ایضاح الادلہ |
| حسن غريب (مکمل دوجلد) | آب حیات |
| الحالة التّعليمية في الهند | بریلویت طلسم فریب یا حقیقت؟ |
| حجّة الإسلام (عربي) | حیات اور کارنامے مولانا قاسم صاحبؒ |
| تفسير النّصوص | خیر القرون کی درس گاہیں |
| مناهل العرفان | تدوین سیر ومغازی |
| شيوخ الإمام أبي داوٗد السّجستاني...... | اجودھیا کے اسلامی آثار |
| علماؤ ديوبند خدماتهم في الحديث | مختصر سوانح ائمۂ اربعہ |
| چند اہم عصری مسائل: جلد:اوّل | شوریٰ کی شرعی حیثیت |
| دارالعلوم کا فتویٰ اور اس کی حقیقت | اوثق العریٰ |
| فتاویٰ اور فیصلے | احسن القریٰ فی توضیح اوثق العریٰ |
| حیات اور کارنامے حضرت گنگوہیؒ | اسلام اور قادیانیت کا تقابلی مطالعہ |

| | |
|---|---|
| مجموعہ ہفت رسائل | تحقیق الکفر والایمان |
| عہد رسالت | ختم نبوت خورد |
| حجۃ الاسلام (اردو) | دعاوی مرزا |
| اسلام اور عقلیات | مسیح موعود کی پہچان |
| علوم القرآن | قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ |
| فقہائے صحابہؓ | اسلام اور مرزائیت کا اصولی اختلاف |
| ثبوت حاضر ہیں | تناقضات مرزا |
| نزول عیسیٰ علیہ السلام وظہور مہدی | فلسفۂ ختم نبوت |
| قرآنی پیشین گوئیاں | مسئلہ ختم نبوت اور قادیانی وسوسے |
| مثنوی فروغ (دارالعلوم دیوبند کی قدیم منظوم تاریخ) | ختم نبوت اور بزرگان ملت |
| نظریۂ دوقرآن پر ایک نظر | قادیانی مردہ |
| حکمت قاسمیہ | قادیانی ذبیحہ |
| جماعت اسلامی کا دینی رخ (مکمل ۴: حصے) | آخری اتمام حجت |
| اجتماع گنگوہ | مرزا طاہر کے جواب میں |
| درر منثورہ (مکمل دو حصہ) | کثرتِ رائے کا فیصلہ شریعت کی نظر میں |
| دوضروری مسئلے | قادیانی اقرار |
| غلط فہمیوں کا ازالہ | قادیانی فیصلے |
| نکاح وطلاق عقل وشرع کی روشنی میں | اسلام دشمن کفریہ عقائد |
| اسلامی عقائد اور سائنس | قادیانیوں کو دعوتِ اسلام |
| قرآن محکم | تاریخ دارالعلوم دیوبند (انگریزی، مکمل، دو جلد) |
| مسلمان ہوشیار رہیں | کلمہ طیبہ کی توہین (ہندی) |